محلِ نورِ تجلّی ست رائے انور شاہ
چو قربِ او طلبی در صفائے باطن کوش

(حافظ شیرازی)



فخر المحدثین حضرت مولٰنا سیّد محمّد انور شاہ صاحبؒ

(کے)

حالاتِ زندگی اور کمالاتِ علمی پر اُن کے مخصوص تلامذہ کے

محققانہ مقالات

مُرتّبہ

(ابن الانور) سیّد محمّد ازہر شاہ قیصر

(۱۹۵۵ء)

مطبوعہ — محبوب المطابع برقی پریس دہلی

بار اوّل — ۱۵۰۰

ضخامت — ۳۶۰ صفحات

قیمت مجلّد — چار رُوپے

ملنے کا پتہ

سیّد محمد ازہر شاہ قیصر، شاہ منزل دیوبند

(یو۔پی)

پاکستانی حضرات

"مولانا محمد انوری مہتمم مدرسہ تعلیم الاسلام

محلّہ سنت پورہ، لائل پور"

(کو)

قیمت بھیجکر رسید ناشر کتاب کو دیوبند روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

افتتاحیہ

فخر المحدثین علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری نور اللہ مرقدہ کے انتقال کے پورے بیس سال بعد توفیق الٰہی کی مساعدت سے اُن کی باکمال زندگی کے مختلف گوشوں اور علمی فضائل کے مختلف پہلوؤں پر یہ تذکیری اور تحقیقی کتاب شائع ہو رہی ہے بادی النظر میں یہ تاخیرِ اشاعت حیرت انگیز ہوگی۔ مگر جن لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ مال و دولت کے خزانوں اور سرمایوں کو ہمیشہ سے ان کے مالک و وارث چھپاتے اور دفن کرتے چلے آئے ہیں وہاں علمی حقائق پر اگرچہ ان کے سرمایہ داروں نے بُخل و امساک کی مہریں نہیں لگائیں۔ مگر ہر علمی کاوش صرف اپنے وقت اور اپنے عصر کے لئے انجام نہیں پاتی۔ بعض اوقات ان کا تعلق مستقبل میں آنے والے اوقات و حالات سے بھی ہوتا ہے، اور یہی وہ علمی ذخیرے ہوتے ہیں جنہیں موجودہ نسلیں التفات کی مستحق نہیں سمجھتیں اور اپنی نافہمی سے گوشۂ گمنامی میں ڈال دیتی ہیں، مگر بعد میں پیدا ہونے والے ذی ہوش انسان اُن کی قدر کرتے، اُن کے ایک ایک حرف کو ڈھونڈ کر ایک جگہ جمع کرتے، اور اُن کی ایک ایک سطر کی حفاظت پر اپنی ہمت و استعداد کو صرف کرتے ہیں۔ "شاعر فردا" کہہ کر اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ علمی کاوشوں اور تصنیف و تالیف کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس دُنیا میں اس کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں کہ بڑے بڑے مصنفین اور حدیث و تفسیر کے بلند پایہ علماء کی تصانیف خود اُن کی زندگی میں نہ چھپ سکیں اور نہ حاضر الوقت افراد نے اُن علمی جواہر پاروں کی طرف کوئی توجہ دی۔ مگر نئی نسلوں نے انہیں اپنی قومی زندگی کا بہترین اثاثہ قرار دیا، اور بزرگوں کی اِس

میراث کو گردشِ ایام سے محفوظ کر دینے کے لئے سرگرم عمل رہے۔

بہت ممکن ہے کہ آج سے بیس سال پہلے کی علمی دُنیا چوں کہ براہ راست حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کے فیضانِ علمی اور برکاتِ زندگی سے مستفید ہو چکی تھی اور زندگی کی خم دار راہوں پر اُن کے کمالات باطنی کا نقشِ پا ابھی وقتی تغیرات سے مضمحل نہیں ہوا تھا، اِس لئے خود قدرت نے اس کی ضرورت نہ سمجھی ہو کہ اُن کے علوم کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک رشتۂ زریں میں پرو دیا جائے، اور اب بیس سال کے بعد جب عوام و خواص میں بڑی حد تک ان کے علوم و معارف کی اشاعت کی ضرورت، اور طلب پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بے محل نہ سمجھا گیا ہو کہ اس علمی خزانہ کی حفاظت کیلئے اِبتدائی کوئی کوشش کی جائے، ایک ایسی ابتدائی کوشش جو اپنے انجام تک مسلسل، غیر منقطع اپنے ہر وقتِ پیدائش اور تعمیری ثابت ہو۔

مجھے قدرت کے ان مخفی مصالح کا احساس اس پہلو سے اور زیادہ ہوا کہ اب سے دس پانچ سال پہلے میرے اوقات میں اس طرح کی فراغت اور یکسوئی بہت کچھ تھی کہ میں حضرت علامہ مرحوم کے متعلق ایسے کسی کام کو چھیڑتا تو بسہولت اُسے پُورا کر لیتا، مگر اُس وقت اِدھر توجہ نہیں ہوئی۔ ٹھیک ایسے وقت پر جب اپنی مصروف زندگی کی ذمہ داریوں سے میرے ناتواں قوائے فکر و عمل بُری طرح تھک چکے تھے کسی غیبی خیال نے مجھے کام پر آمادہ کیا اِبتداءً یہ خیال بھی ہوا کہ اس عالمِ درد و کلفت میں کسی کام کو پُورا کرنا مشکل اور کام کے حق کو ادا کرنا ناممکن ہے، مگر کام کرنے کا جذبہ ان خیالات و اوہام پر غالب آگیا، اور الحمد للہ ذہنی نقوش نے عمل کی مرئی شکل حاصل کر لی۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے صرف میں نہیں بلکہ پُورا طبقہ، اہلِ علم جانتا ہے کہ چند صفحات کی اس کتاب میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ اُن کے علوم و کمالات کے دریائے بیکراں کے صرف چند قطرے ہیں، میں نے اپنی اس محنت سے ان کے علوم

کی ترتیب و حفاظت کے لمبے چوڑے کام کی ابتداء کی ہے، خدا کرے یہ ابتداء اپنی انتہا تک پہونچے۔

اِس کتاب کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں مجھے اپنے بزرگوں کے احسانات کا شکریہ ادا کرنا ہے جو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے علمی انتساب کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا امتیاز سمجھتے ہیں، میں وقت کی کمی کے باعث اپنے سلسلۂ گفتگو کو مختصر کرنے کے درپے ہوں، لیکن اس کے باوجود یہ کہے بغیر آگے بڑھنا میرے لئے مشکل ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کے وسیع حلقہ نے اُن کی علمی تحقیقات کی حفاظت، اُن کے علوم کی اشاعت و بقاء، اُن کے نقوشِ حیات کو گرد و غبارِ زمانہ سے محفوظ رکھنے، اور ان کی اولاد کی خدمت و نگرانی میں اپنی ایسی سرگرم توجہات کا اِظہار کیا کہ حضرت علامہ انور شاہ کے خاندان نے ادائے شکر و سپاس کے لئے اپنے آپ کو مجبور پایا۔ مولٰنا سید محمد ادریس صاحب سکروڑوی، حضرت مولٰنا اعزاز علی صاحب، مولٰنا سید ابو ظفر ندوی۔ حضرت مولٰنا محمد طیب صاحب مدظلہٗ۔ حضرت مولٰنا مناظر احسن گیلانی، مولٰنا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، مولٰنا محمد یوسف بنوری، مولٰنا محمد ادریس کاندھلوی، مولٰنا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولٰنا محمد میاں صاحب، مولٰنا محمد صاحب انوری، مولٰنا محمد منظور صاحب نعمانی، وغیرہم اپنی زندگی کے بہت سے اوقات اپنے استاذ کے علوم قرآن و حدیث کے افہام و تفہیم کے لئے صرف فرما چکے ہیں۔ ان کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ اپنی ذمہ دارانہ مصروفیتوں کو پسِ پشت ڈال کر چند صفحات اپنے استاذ کے ذکرِ خیر کے لئے تحریر فرما دیتے۔

الحاج مولٰنا محمد ابن موسیٰ میاں دام مجدہ العالی، الحاج سیٹھ محمد ابن اسمٰعیل مفتی مولٰنا موسیٰ ابراہیم بھام جی، جناب یعقوب سوجھ صاحب (نیلپسروٹ) جناب

ایم، ای، منتی صاحب (کوماٹی پورٹ)، جناب ایم یوسف صاحب (جوہانسبرگ)، کی عالی ہمتی، فرض شناسی اور بے ریا سخاوت و فیاضی نے ہمیشہ خاندانِ انوری کی غیرت و خودداری کو زندہ رہنے میں مدد دی ہے، حسبِ عادت اس موقعہ پر بھی ان حضرات نے سینکڑوں کے مالی عطیات اِس کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے لئے پیش کئے، علماء اور امراء کے یہ دونوں طبقے اہلِ علم کی زائد سے زائد تعریف اور پُر خلوص شکریہ کے مستحق ہیں۔ حق تعالیٰ ان کی خدمات کو حسنِ قبول سے سرفراز فرمائیں۔

حضرت مولٰنا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے کتاب کی طباعت سے دِل چسپی لی، برادرم مولانا عبدالحق صاحب غازی پوری نے تصحیح پر اپنا وقت صرف کیا مخدومی حضرت مولانا سید محمد ادریس صاحب سکھروڈوی نے دوسرے انتظامات کی نگرانی کی، برادرِ عزیز مولوی سید محمد انظر شاہ سلمہٗ نے اپنے مفید مشوروں سے میری مدد کی۔ ان سب حضرات کی عنایات کا بھی میں ممنون ہوں۔

اربابِ نظر نے اگر قدر افزائی کی تو ان شاء اللہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جلد ہی شائع ہوگا اور اس میں کچھ نئے مضامین اور کارآمد خصوصیات کا اضافہ بھی کیا جائے گا۔ ہر اچھے کام کی توفیق اللہ رب العالمین ہی کی رضاء پر موقوف ہے۔ واللہ الموفق و بیدہ الخیر

سیّد محمّد ازہر شاہ قیصر

شاہ منزل دیوبند

یکم جنوری ۱۹۵۵ء

فہرستِ مضامین

ج

حضرت مولانا سید انور شاہؒ

ذاتی حالات، علمی اور دینی خدمات

احقر نے اپنے اس مضمون میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی ان کی علمی اور دینی خدمات اور ان کے تبحر و جامعیت پر روشنی ڈالنے کی ایک ناکام کوشش کی ہے۔ اپنے بزرگ حضرت مولانا محمد میاں صاحب انصاری دیوبندی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس مضمون میں مفید نوٹس تحریر فرما کر اس کی افادیت و دلچسپی میں اضافہ فرما دیا۔

حضرت مرحوم کے حالاتِ زندگی پر یہ مضمون نامکمل ہے۔ بہت سی چیزیں یادداشت میں رہ گئیں اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے صفحۂ قرطاس پر انھیں لانے کی توفیق نہ ہو سکی۔ خدا کرے کہ آئندہ اڈیشن میں ان امور کی تلافی ہو سکے۔

قیصرؔ

حضرت علامہ جلیل رحمۃ اللہ علیہ ۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ بروز شنبہ بوقت صبح اپنے ننہال میں بمقام موضع دودھواں (علاقہ لولاب کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ ۴½ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد معظم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآنِ پاک شروع کیا اور چھ برس کی عمر تک قرآنِ پاک کے علاوہ فارسی

کے متعدد رسائل بھی ختم کر لئے۔ پھر مولانا غلام محمد صاحب رضوی (پورہ) سے فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی اور ابھی آپ کی عمر ۱۳-۱۴ سال کی تھی کہ ۱۳۰۵ھ میں شوق تعلیم نے لولاب کے مرغزاروں اور سبزہ زاروں پر غریب الوطنی کی علمی زندگی کو ترجیح دی۔

یہ چند واقعات ان کے بچپن کی زندگی پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس شخص کو آگے چل کر وقت کا رازی و غزالی بننا تھا، اس کی ابتدا کتنی شاندار اور حیرت ناک تھی۔

آپ کے والد معظم حضرت مولانا محمد معظم شاہ صاحب نے بیان فرمایا کہ جب انھوں نے مختصر القدوری مجھ سے شروع کی تو مجھ سے بعض ایسے مسائل دریافت کرتے تھے کہ مبسوط کتابوں کے مطالعہ کے بغیر ان کا جواب دینا ناممکن تھا۔ میں انھیں ان موشگافیوں سے بچنے پر منع کرنے پر مجبور ہوا۔ اخیر میں اس قوت ذکاوت و ذہانت سے پریشان ہوکر میں نے انھیں ایک دوسرے عالم کے سپرد کیا۔ مگر دوسرے استاذ کو بھی ان سے یہی شکایت پیش آئی۔

آپ کے والد آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی یٰسین شاہ مرحوم کو کشمیر کے پہاڑوں میں اعتکاف کرنے والے ایک عارف کے پاس حصول برکت کے لئے لےگئے۔ عارف نے جب اس ہونہار بچہ کو دیکھا تو والد سے پوچھا کہ کیا یہ تمہارا بچہ ہے؟۔ پھر کہا کہ یہ بڑا عظیم الشان عالم ہوگا۔ اور مستقبل میں اس کی علمی عظمت مسلّم ہوگی۔

ایک دفعہ منطق اور نحو کے چند رسائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک بڑے عالم اس وقت آپ کے پاس آگئے۔ ان عالم نے ان کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھا کتابوں پر خود حضرت مرحوم کے حواشی لکھے ہوئے تھے۔ بچپن کے زمانہ کی اس ذکاوت، تیزی طبع، فہم اور طبیعت کی دور رسی کا اندازہ کرکے بے اختیار انھوں نے کہا کہ یہ بچہ اپنے وقت کا رازی اور اپنے زمانہ کا غزالی ہوگا۔

علمی مذاق اور ذکاوت و ذہانت کے ساتھ سلامتی طبع حسنِ اخلاق اور اعمالِ صالحہ کی دولتیں بھی شروع سے آپ کو وافر مقدار میں ملی تھیں۔ آپ کے غیر معمولی حوال کو دیکھ کر کشمیر کے عوام عام طور پر یہ شبہ کرتے تھے کہ کہیں آپ مہدی موعود ہوں آپ کے والد محترم اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کو عوام کی اس غلط فہمی کی تردید کرنی پڑتی تھی۔

آپ نے خود ایک موقعہ پر فرمایا کہ :- میں بارہ سال کی عمر میں فتاوی دینے لگا تھا۔ اور نو سال کی عمر میں فقہ و نحو کی مطولات کا مطالعہ کر چکا تھا۔ ذالک فضل اللہ یوءتیہ من یشاء۔

چنانچہ تین سال تک آپ ضلع ہزارہ (سرحد) کے متعدد علماء و صلحا کی خدمت میں رہ کر علومِ عربیہ کی تکمیل فرماتے رہے۔ پھر جب علوم و فنون کی پیاس وہاں بھی بجھتی نظر نہ آئی تو ہندوستان کے مرکز علوم دینیہ دارالعلوم کی شہرت سن کر آپ بھی ۱۳۰۷ھ یا ۱۳۰۸ھ میں بعمر سولہ سترہ سال ہزارہ سے دیوبند آگئے۔ دیوبند میں آپ نے چار سال رہ کر وہاں کے مشاہیرِ وقت، یکتائے روزگار علماء سے فیوض علمیہ و باطنیہ کا بدرجۂ اتم استفادہ کیا۔ اور ۲۰ اور ۲۱ سال کی عمر میں نمایاں شہرت و عزت کے ساتھ سندِ فراغ حاصل کی۔ جن علماء سے آپ کو شرفِ تلمذ رہا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

قدوۃ العلماء حضرت مولانا الحاج محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ۔ حضرت مولانا الحاج الحافظ خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری مہاجر مدنی۔ حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی الدیوبندی۔ دیوبند سے فارغ ہو کر قطب الارشاد حضرت مولانا الحاج رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں گنگوہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے سند

حدیث کے علاوہ فیوض باطنی بھی حاصل کئے۔ اس کے بعد آپ دہلی تشریف لیگئے۔ اور تین چار سال تک مدرسہ عالیہ امینیہ کے مدرس اول رہے۔

دہلی میں بارہ تیرہ سال قیام کے بعد بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کے باعث آپ کشمیر تشریف لے گئے۔ اور ۱۳۲۳ھ میں آپ بعض مشاہیر کشمیر کی رفاقت میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ سفر حجاز میں طرابلس، بصرہ اور مصر و شام کی جلیل القدر علماء نے آپ کی بہت عزت کی اور سب نے آپ کی خداداد بے نظیر لیاقت و استعداد دیکھ کر سندات حدیث عطا فرمائیں جن میں آپ کا نام "الفاضل الشیخ محمد انور بن مولانا محمد معظم شاہ الکشمیری" لکھا گیا ہے۔

سفر حجاز سے واپس آکر خواجگان قصبہ بارہ مولا (کشمیر کا ایک مشہور مقام ہے) خصوصًا خواجہ عبد الصمد ککرو رئیس اعظم کے اصرار پر آپ نے اسی قصبہ میں مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی۔ اور تقریبًا تین سال تک آپ وہاں خلق اللہ کو فیض یاب فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں آپ کو دار العلوم دیوبند کے مشہور جلسۂ دستار بندی میں مدعو کیا گیا اور آپ دیوبند تشریف لے گئے دار العلوم میں آپ نے استفادۂ علوم و فنون کیا تھا اور وہیں سے سند فراغ حاصل کی تھی۔ اب اسی دار العلوم میں مدرس مقرر ہو گئے سنن ابو داؤد شریف اور صحیح مسلم شریف کا درس سالہا سال تک آپ بغیر کسی تنخواہ کے دیتے رہے۔ چند سال کے بعد آپ کو اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کی وجہ سے پھر کشمیر جانا پڑا۔ لیکن دار العلوم کی طرف سے واپسی کا شدید تقاضا ہوا۔ اس لئے جلد ہی واپس تشریف لے آئے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کی بہت زیادہ

شفیق استاد تھے اور ساتھ ہی آپ کا بہت زیادہ احترام بھی فرماتے تھے۔ وہ اکثر دیوبند میں آپ کے مستقل قیام کی تجاویز سوچا کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ نے حضرت شاہ صاحب کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ اور پھر اتباعاً للسنۃ النبویہ نکاح کی تاکید فرمائی۔ یہ ۱۳۳۶ھ کا واقعہ ہے۔ جب آپ کی عمر شریف ۴۴ سال تھی۔

بظاہر حضرت شاہ صاحب کو مجرد ہی رہنا بہت پسند تھا۔ اور آپ شادی کے لئے بالکل آمادہ نہ تھے۔ لیکن بسبب اتباعِ سنت نبوی اور اپنے مشفق و محترم استاد کے اصرار پر بادلِ ناخواستہ رضامندی ظاہر فرمائی۔ اور جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم کے حسنِ انتخاب سے گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک اعلیٰ اور معزز شریف خاندان میں آپ کی شادی ہوگئی۔ اس سے پہلے آپ دارالعلوم میں حسبۃً للہ درس دیتے تھے۔ اب شادی کے بعد بسبب حوائج اہل و عیال نہایت قلیل تنخواہ قبول فرمائی۔

دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے سلسلہ میں آپ کو بیشتر ہندوستان کے اکثر مقامات میں جانا پڑا ہے۔ اور جہاں جہاں آپ تشریف لے گئے ہیں وہاں سے دارالعلوم کی امداد و اعانت میں غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔

ایک مرتبہ دارالعلوم کا وفد نواب خواجہ سر سلیم اللہ بہادر نواب آف ڈھاکہ کی خدمت میں گیا۔ حضرت شاہ صاحب رئیس الوفد تھے۔ اور آپ نے عربی زبان میں نواب صاحب کو نہایت فصیح و بلیغ ایڈریس دیا۔ جس سے نواب صاحب مرحوم پر نہایت گہرا اثر ہوا۔ اور وفد مذکور نہایت کامیاب ہو کر واپس آیا۔ وہکذا ۱۳۴۵ھ تک آپ دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس و جانشین شیخ الہند درس

حدیث دیتے رہے - اس کے بعد جب منتظمینِ دار العلوم سے بعض اصلاحات کے سلسلہ میں اختلاف ہوا تو آپ نے ۱۳۴۶ھ میں دار العلوم سے قطع تعلق فرمالیا - اور آپ قطب عالم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ شیخ التفسیر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدیؒ - مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی - مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی اور بہت سے علماء اور کئی سو طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ ڈابھیل جامعہ اسلامیہ تشریف لے گئے - اور ۱۳۵۱ھ تک آپ نے جامعہ میں درس حدیث کا مشغلہ جاری رکھا: ۲ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ کو شب کے آخری حصہ میں آپ نے دیوبند میں داعی اجل کو لبیک کہا - اور کئی سال کی علالت کے بعد اس دار فانی سے رحلت فرما ہوئے - انّا للہ وانّا الیہ راجعون -

حضرت شاہ صاحبؒ موجودہ سیاسی خلفشار میں جمعیۃ علماء ہند کے مسلک کے بہت بڑے حامی بہت بڑے حریت پسند برطانوی امپریلزم کے سخت دشمن اور ہندوستان میں دین قیم کو سربلند دیکھنے کے آرزومند تھے - شروع سے آخر تک آپ جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ کے اعلیٰ رکن اور جمعیۃ کے مقاصد کے ہمدرد رہے - ہمیشہ آپ نے اپنے گرانقدر مشوروں سے جمعیۃ کی رہنمائی اور جمعیۃ کے حلقے کو وسیع کرنے کی کوشش فرمائی ۱۳۴۶ھ میں حضرت مرحوم نے پشاور میں جمعیۃ کے آٹھویں عظیم الشان اور تاریخی سالانہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے ایک بصیرت افروز اور معرکہ آرا خطبہ میں بہت سے مذہبی اور سیاسی موضوعات پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا تھا - جمعیۃ کے علاوہ مجلس احرار کے حال پر بھی حضرت مرحوم کا گوشہ چشم التفات مبذول رہا - اور اس کے قائدین کی بھی حضرتِ مرحوم نے اپنے علم و فضل اور روحانی قوت سے قیادت و رہنمائی فرمائی - تحریک کشمیر میں احرار کو حضرت مرحوم کی تمام ہمدردیاں حاصل تھیں - علامہ مرحوم کو دورِ حاضر کے مہلک ترین فتنۂ قادیانیت کی تردید سے غیر معمولی شغف تھا -

سالہا سال تک علامہ مرحوم اس فتنہ کی ہلاکت سامانیوں سے ملّتِ مرحومہ کو محفوظ فرمانے کے لئے تحریری و تقریری طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ تردید قادیانیت کے سلسلہ میں آپ انتہائی پریشان کن علالت کی حالت میں بھی مذہبی جلسوں میں شرکت کے لئے دور دور کا سفر فرماتے تھے۔ انتہا یہ کہ انتقال کے صرف چند دن پہلے آپ اپنی مشہور و معرکہ آرا تصنیف "خاتم النبیین" سے فارغ ہوئے تھے۔ جس میں آیۂ کریمہ ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللّٰہ وخاتم النبیین کی آپ نے اپنے مخصوص محدثانہ اور محققانہ انداز میں تفسیر فرمائی ہے۔ یہ تصنیف محض قادیانیوں کے دجل وتلبیس کے تار و پود بکھیرنے کے لئے فرمائی گئی تھی۔ اس سے فراغت پاکر حضرت مرحوم نے اپنے خدام سے ارشاد فرمایا:-

"میں نے آخرت کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ خاتم النبیین کے عنوان سے یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ انشاء اللہ یہ مرزائے قادیان کے دجل و فریب کو اظہر من الشمس کر دینگی اور میرے لئے زادِ راہِ آخرت ہوں گی"

مجلسِ احرار کو حضرت مرحوم نے ردّ قادیانیت پر متوجہ فرمایا۔ احرار نے اس فتنہ کے استیصال کے لئے قابلِ قدر سرگرمی کے ساتھ جہاد کیا اور اس کی ناپاک اثرات کو بہت حد تک ختم کرکے اسلام کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلام سے جو شغف پیدا ہو گیا تھا۔ واقفین حال اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کی برکات تھیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اسلامیات میں علامہ مرحوم سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اور علامہ مرحوم کے فیض صحبت نے ان کی روح کو جِلا بخشی۔ ڈاکٹر موصوف دل و جان سے علامہ مرحوم کا احترام کرتے تھے۔ اور عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ علامہ کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے۔

حضرت کے علمی وعملی کمالات میں سے جو چیز آپ کو اقران و اعیان عصر میں سب سے زیادہ ممتاز کرتی تھی۔ وہ آپ کی جامعیت و تبحر علمی ہے۔ علوم عقلیہ و شرعیہ میں سے ایک بھی ایسا علم نہیں ہے جس میں آپ کو مہارت تامہ حاصل نہ ہو۔ اور شاید یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ علماء متقدمین میں بھی ہر حیثیت سے ایسی جامع علوم عقلیہ و نقلیہ ہستیاں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

آپ سیکڑوں علما و فضلا کے مجمع میں بیٹھ کر ہر ایک علم و فن کے مسائل پر اس طرح تقریر فرمایا کرتے تھے کہ گویا آپ کو تمام مسائل فن مستحضر اور کالنقش فی الحجر ہیں۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ خیال ہوتا تھا کہ اپنے ارادہ سے کلام نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ الہامات وا رادات کے زور پر کہہ رہے ہیں اور یہ تو بیشتر ہوتا تھا کہ اکابر علماء وقت سے جب بعض دقیق و لاینحل یا مختلف فیہ مسائل کے متعلق پوچھا جاتا تھا تو وہ حضرت سے استفسار کرنے کو فرمایا کرتے تھے۔

اور اکثر علماء عصر حاضر کو جب کسی علمی مسئلہ میں کوئی دقت پیش آتی تھی تو وہ خود بھی حضرت مرحوم سے مراجعت فرماتے تھے۔ ذیل میں حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علیؒ کے ایک مکتوب گرامی کا پہلا اور آخری حصہ مندرج ہے۔ جو انھوں نے حضرت مرحوم کو ارسال فرمایا تھا۔ جس میں انھوں نے کسی مسئلہ پر حضرت مرحوم سے تحقیق چاہی ہے،

نفحۃ العنبر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی ایک طویل اور جامع تاریخ حیات ہے جسے عربی زبان میں حضرت مرحوم کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری نے مرتب اور مجلس علمی نے ڈابھیل سے شائع کیا ہے۔ نفحۃ العنبر کا بیان ہے کہ حکیم الامۃ نے اکثر مسائل میں علاّمہ مرحوم سے استفادہ کیا ہے۔

از ناکارہ آوارہ اشرف علی عفی عنہ بخدمت بابرکت جامع الفضائل العلمیہ والعملیہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب دامت انوارہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ تحقیق سابق کے متعلق بضرورت مکرر تکلیف دینا پڑی۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے ایک حادثہ خود مجھ کو پیش آیا۔ اس کے متعلق جداگانہ تکلیف دیتا ہوں الخ وقال خاتمہ اس میں روایت ودرایت سے کچھ حکم فرمائیں۔

حضرت شاہ صاحب کا تبحر علمی وجامعیت فنون نہ صرف ہندوستان میں مسلّم تھا۔ بلکہ مصر وشام بیروت حرمین شریفین ودیگر بلادِ اسلامیہ کے بھی جو علماء ہندوستان میں بغرض سیاحت آتے تھے اور دارالعلوم میں پہنچکر آپ سے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے تھے وہ آپ کی بے نظیر علمی قابلیت کے معترف ہو کر جایا کرتے تھے اور اکثر نے کہا کہ ہمارے ملک میں کوئی ایسا جامع ومحقق عالم نہیں۔

مصر کے مشہور عالم وادیب علامہ سید رشید رضا مدیر رسالہ "المنار" جو مفتی محمد عبدہٗ کے شاگرد رشید تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سالانہ جلسہ میں ہندوستان تشریف لائے سید رشید رضا مرحوم دارالعلوم میں بھی آئے اور آپ نے وہاں کا معائنہ کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے طلباء وارا کین مدرسہ واعیانِ شہر کے جلسۂ عام میں اس موقع پر عربی زبان میں ایک مبسوط تقریر فرمائی۔ جس میں آپ نے اوّلاً دارالعلوم کی اجمالی تاریخ بیان فرمائی پھر درس حدیث شریف کا جو طریقہ دارالعلوم دیوبند میں رائج تھا اس کو واضح فرمایا۔ نیز حنفیہ کے مسلک کو مستحکم دلائل کے ساتھ پیش فرمایا۔ اور اس کے اصول اساسی پر کافی روشنی ڈالی جس سے رشید رضا مرحوم بہت زیادہ محظوظ ہوئے۔ اور حضرت شاہ صاحب کی قوت بیان اور استدلال اور وسعت معلومات پر سخت متحیر۔ نیز علامہ رشید رضا مرحوم

نے شافعی المذہب ہونے کی وجہ سے مذہب حنفی کے متعلق آپ سے بہت سے سوالات بھی کئے جن کا حضرت نے کافی وشافی جواب مرحمت فرمایا۔

سید رشید رضا علامۂ محترم کی ملاقات سے اس قدر محظوظ ہوئے کہ آخر انھیں یہ کہنا پڑا کہ اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہوکر واپس جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھ کو بتادیا ہے کہ:۔

"ہندوستان میں ابھی علومِ عربیہ اور تعلیماتِ مذہبی اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہیں"

علامہ موسیٰ جاراللہ روسی اسلامی دنیا کے زبردست عالم اور وسیع النظر فاضل ہیں۔ ان کی علمی شخصیت عالمگیر شہرت کی مالک ہے ۱۳۴۰ھ؁ ۱۹۲۰ء؁ میں علامہ موسیٰ دیوبند تشریف لائے تھے۔ آپ کئی دن تک علامہ مرحوم سے علمی مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ اور اخیر میں آپ نے علامہ مرحوم کے تبحرِ علمی کا اعتراف فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا حافظہ زبان زد خلائق ہے۔ ایک کتاب کے اگر پانچ پانچ یا دس دس حواشی بھی تھے تو آپ کو یاد ہوتے تھے۔ حوالہ ہائے کتب صحیحہ لقید جلد وصفحات آپ کو ایک ہی دفعہ کے مطالعہ سے محفوظ ہوجاتے تھے۔ اور جس وقت کسی اہم علمی مسئلہ پر تقریر فرماتے تھے تو بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلف دیتے چلے جاتے تھے۔ احادیث کا تمام ذخیرہ اور ان کی صحت اور عدمِ صحت کے متعلق طویل و عریض بحثیں رواۃ کے مدارج ومراتب اس طرح محفوظ تھے کہ طلبۂ حدیث اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر ایک مکمل لائبریری کا کام لیتے اور ایسے سوالات کا جواب منٹوں میں حاصل کر لیتے جن کی تحقیق وجستجو کے لئے ایک پوری عمر درکار ہے۔ پھر ہر جواب میں جامعیت اس قدر ہوتی تھی کہ اس موضوع پر کسی کتاب کو خواہ وہ مطبوعہ ہو یا قلمی دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہتی مشہور ومعروف کتب خانوں کی اکثر مخطوطات (قلمی کتابیں) نظر سے گذر چکی تھیں۔ اور اس طرح محفوظ تھیں کہ گویا آج ہی مطالعہ کیا ہے۔

آخر عمر میں بیماری کا بہت زیادہ غلبہ رہا جس سے ممکن تھا کہ حافظہ پر اثر پڑتا۔ مگر فضلِ ایزدی سے آپ کو یہ عارضہ لاحق نہیں ہوا۔ حالانکہ بہت سے کامل محدثین کے حافظہ میں آخر عمر میں اختلاط آگیا تھا۔ اس اعتبار سے آپ آیۃ من آیات اللہ تھے۔

جزئیاتِ فقہیہ نہ صرف فقہ حنفی کی بلکہ ائمہ اربعہ اور دوسرے ائمہ کی بھی بہت زیادہ آپ کو محفوظ تھیں۔ مگر حضرت باوجود اس کمالِ فقاہت وحفظ کے اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر فن میں اپنی رائے رکھتا ہوں۔ اور کسی کی تقلید نہیں کرتا۔ لیکن فقہ میں کوئی رائے نہیں رکھتا۔ اور اس میں امام اعظم کا مقلد ہوں۔

علمِ حدیث میں جو کچھ آپ کا مرتبہ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اس فنِ مبارک میں اللہ تعالیٰ نے وہ کمال آپ کو عطا فرمایا تھا کہ عرب و عجم میں اس کی نظیر مشکل بلکہ قریباً ناممکن ہے۔ کمال حافظہ کی وجہ سے علاوہ صحاح ستہ کے دیگر کتب مبسوطہ حدیث مطبوعہ و قلمی آپ کو ازبر تھیں۔

مرحوم کا یہ تبحر صرف علوم ونقلیہ میں محدود نہ تھا بلکہ آپ کو یہ کمال حاصل تھا کہ فن کی کوئی کتاب ملی اور اس کو شروع سے آخر تک ضرور ایک بار مطالعہ فرمالیا۔ اور جب کبھی سالہا سال کے بعد اس کے متعلق کوئی بات چھڑی تو اس کتاب کے مندرجات کو اس طرح حوالوں کے ساتھ بیان فرمادیا کہ سننے والے ششدر و حیران رہ گئے۔

ایک بار پنجاب سے ایک صاحب علمِ جفر کے متعلق چند مشکل ترین مسائل حل کرنے کے لئے حضرت کی خدمت میں دیوبند حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کو تسلی بخش جواب عنایت فرماکر واپس فرمایا۔ فلسفہ جدید (جدید سائنس) اور جدید ہیئت کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ فرمایا تھا اور اپنے بعض مخصوص تلامذہ کو سائنس جدید کی کتاب بھی پڑھائی تھی۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اب علماء کو قدیم فلسفہ وہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ وہیئت کو بھی حاصل کرنا چاہیئے۔

حضرت نے علم طب کا بھی بتمام وکمال مطالعہ کیا تھا۔ اور جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب کو علم طب کی کتابیں پڑھائیں جو اس وقت دیوبند میں ایک نہایت کامیاب مطب کر رہے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی مدظلہ نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ جب میں کسی کتاب کا سرسری نظر سے مطالعہ کرتا ہوں اور اُس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا پھر بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین مجھے محفوظ رہ جاتے ہیں۔

سرعت مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ مسند احمد (مطبوعہ مصر) کے روزانہ دو سو صفحات کا مطالعہ فرمایا۔ اس طرح کہ پوری دقت نظر اور کامل غور و فکر کے ساتھ اس کی اسانید اور مشکلات کو حل کرتے جاتے تھے۔

آپ کے سوانح نگار مولانا محمد یوسف بنوری نے "نفحۃ العنبر" میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ درس میں فرماتے تھے کہ میں نے چند ہی روز میں مسند احمد سے احناف کے تمام دلائل اور وہ احادیث جو ان کی مؤید ہیں منتخب اور محفوظ کرلیں۔ مسند احمد کا مطالعہ اگرچہ اتنی تیزی کے ساتھ فرمایا تھا۔ مگر درس میں حسب موقعہ جب مسند کی احادیث نقل فرماتے تو کتاب سے مراجعت کئے بغیر احادیث کے رواۃ اور طبقات پر پوری بحث سامنے آجاتی تھی۔ اخیر عمر میں آپ نے پھر ایک دفعہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق احادیث کو جمع کرنے کے لئے مسند کا مطالعہ فرمایا تھا۔

مصنف نفحۃ العنبر ہی کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے ۱۳۲۱ھ ہجری میں فتح القدیر لابن ہمام رحمہ اللہ کا مع تکملہ بیس دن کے اندر مطالعہ فرمایا۔ اور اس طرح کہ

کتاب الحج تک اس کی تلخیص فرمائی اور ابن ہمام نے فتح القدیر میں صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کئے ہیں اپنے خلاصہ میں ان کے مکمل جوابات بھی قلمبند فرمائے۔ پھر مدت عمر میں مذاہب و مباحث کو نقل کرنے میں فتح القدیر کے مطالعہ کی ضرورت پیش نہیں آئی ۱۳۴۷ھ میں درس کے دوران میں تحدیث نعمۃ اور طلبہ میں شغف مطالعہ پیدا کرنے کے لئے بیان فرمایا کہ اب ۲۶ سال ہو گئے فتح القدیر کی جانب مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی۔ جو مضمون اس کا بیان کروں گا اگر مراجعت کروگے تو تفاوت بہت کم پاؤ گے۔

آپ کے وسعت مطالعہ پر اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے کہ کشمیر میں ایکدفعہ علماء کے درمیان اختلاف ہوا اور ہر ایک کا جواب دوسرے کے مخالف رہا۔ اسی دوران میں حضرت شاہ صاحب بھی کشمیر تشریف لائے۔ فریقین شاہ صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے حاضر ہوئے اور دونوں نے مختلف فیہ مسئلہ کو آپ کے سامنے پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے مولانا محمد یوسف بنوری کو حکم دیا کہ اس کا جواب لکھو۔ اس فتوی پر ایک فریق نے "فتاوی عماریہ" کے ایک قلمی نسخہ سے اپنے استدلال میں ایک عبارت پیش کی۔ حضرت شاہ صاحب نے مولانا محمد یوسف صاحب سے فرمایا کہ میں نے فتاوی عماریہ کے مخطوطہ کا دار العلوم کے کتب خانہ میں مطالعہ کیا ہے۔ اس میں یہ عبارت ہرگز موجود نہیں یہ لوگ تصحیف کر رہے ہیں یا تدلیس۔ اس پر حاضرین متحیر ہوئے اور مستدلین مبہوت ہو کر رہ گئے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی فرماتے تھے کہ فوائد تنزیل العزیز لکھتے وقت مجھے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق صحیح روایات حاصل نہ ہو سکیں۔ پندرہ روز تک اس چھان بین میں لگا رہا کہ کوئی ایسی حدیث ہاتھ آئے جو انبیاء کے شایان شان ہو

لیکن میری کوشش بیکار گئی۔ اس کے بعد میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ بیماری کی وجہ سے صاحب فراش تھے میں نے اس پیش آئی ہوئی الجھن اور دشواری کا اظہار کیا۔ حضرت نے بلا تأمل فرمایا کہ حاکم نے مستدرک کے اندر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اثر نقل کیا ہے اس کا مطالعہ کیجئے آپ کی تمام الجھن ختم ہو جائے گی۔ حضرت مولانا عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضرت شاہ صاحب کی ارشاد کے مطابق مطالعہ کیا تو میری تمام الجھنیں دور ہو گئیں۔ اور ضرورت کیمطابق حدیث مل گئی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ صاحب بذل المجهود اپنی اس معرکۃ آرا کتاب کی تصنیف کے وقت روایت و درایت میں پیش آمدہ مشکلات کے لئے شاہ صاحب ہی سے رجوع فرماتے تھے۔ اور آپ کے استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی مشکلات میں آپ سے رجوع فرماتے اور مسائل میں آپ کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ حضرت مولانا ظہیر الحسن صاحب شوق نیموی صاحب آثار السنن بھی اپنی کتاب کی تصنیف کے وقت خط و کتابت کے ذریعہ آپ سے استفادہ کرتے تھے۔

فاضل مکرم مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا بیان ہے کہ تیرہ۱۳ دفعہ آپ نے صحیح بخاری شریف کے صرف متن کا مطالعہ فرمایا تھا۔ جب کہ اس کے حاشیہ اور بین السطور پر بالکل نظر نہ تھی۔ ہر دفعہ ایسے علوم و حقائق کا انکشاف ہوتا کہ اس سے پہلے قلب میں گذرے ہی نہ تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ حافظ ابن حجرؒ کے بے حد مداح تھے۔ ابن تیمیہ کو حافظ الدنیا اور جبال علم کے معزز القاب کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر کے مقابلہ میں حافظ بدر الدین عینی شارح بخاری کے علوم اور ان کی تحقیقات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

درس میں ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے خواب میں حافظ بدرالدین عینی کو دیکھا۔ اور ان سے بطور شکایت کے کہا کہ ابن حجر کے مقابلہ میں جو طرز آپ نے اختیار کیا ہے آپ کے اس طرز سیاست کو کوئی نفع نہیں پہنچا۔ حافظ عینی نے جواب دیا کہ حافظ ابن حجر سے دریافت کرو کہ انھوں نے یہ طرز کیوں اختیار کیا تھا؟ حافظ عینی کہنا چاہتے تھے کہ میں نے صرف مدافعت کی ہے۔ ابتدا ابن حجر سے ہوئی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں عینی کے اس جواب پر خاموش ہوا۔ ان مقامات پر جہاں حافظ ابن حجر کے اعتراضات کا جواب عینی سے بن نہیں پڑا۔ حضرت شاہ صاحب اپنے درس میں ان کا شافی جواب عنایت فرماتے تھے۔

مولانا سراج احمد صاحب رشیدی مرحوم استاذ سنن ابی داؤد نے فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ ایک شخص نے کعبۃ اللہ کے پردوں کو پکڑ کر دعا کی کہ خداوند تعالیٰ مجھے ابن حجر کا سا علم حدیث عطا فرما۔ اس کی دعا قبول کی گئی مولانا رشیدی کہتے تھے کہ میں سمجھا کہ شاہ صاحب کسی دوسرے کا واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ اس وقت یہ خیال نہ گذرا کہ یہ ان کی اپنی ہی حکایت ہے۔ کچھ دیر بعد سمجھا کہ یہ واقعہ حضرت شاہ صاحب ہی کا ہے۔

مولانا قاری محمد یامین صاحب استاذ ڈابھیل نے کہا کہ پنجاب کے ایک عارف دیوبند تشریف لائے حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کے بعد انھوں نے کہا کہ شیخ کی نسبت نہایت ہی قوی اور ان کی عظمت ناقابل مثال ہے۔ مولانا محمد یوسف صاحب نے کہا کہ حضرت شاہ صاحب نے مشائخ چشت کے طرز پر چھ ماہ تک کشمیر میں ریاضت و مجاہدہ فرمایا اور یہ تمام عرصہ خلوت میں گذرا۔

آپ کے استاذ حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو جو سند اجازت عنایت فرمائی تھی اس میں تحریر فرمایا تھا کہ "خداوند تعالیٰ نے مولانا انور شاہ میں علم، عمل، سیرت

صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہن ثاقب جمع کر دیا ہے۔ اور مشہور ہے کہ حضرت شیخ الہند شیخ کو علامہ کے وقیع خطاب سے یاد فرماتے۔ اور مسائل علمیہ میں جب کوئی الجھن پیش آتی تو حضرت شاہ صاحب سے دریافت فرماتے کہ کہو علامہ! اس مسئلہ میں سلف کا کوئی قول یاد ہے؟ شیخ جواب دیتے اور حضرت شیخ الہند اطمینان اور مسرت کا اظہار فرماتے۔

حضرت مولانا مدنی مدظلہ نے حضرت شاہ صاحب کے جلسۂ تعزیت میں تقریر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:۔

"میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، شام وغیرہ کے علماء اور فضلاء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی۔ لیکن تبحر علمی وسعتِ معلومات جامعیت اور علوم نقلیہ وعقلیہ کے احاطہ میں شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پایا۔"

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ صاحب کے انتقال پر اپنے ایک مضمون میں تحریر فرمایا تھا کہ:۔

"آہ قدرت کے زبردست ہاتھ نے حضرت مولانا العلامۃ الفاضل الکامل اکمل العلماء افضل الفضلاء النحریر المقدام، البحر الطمطام، رحلۃ العصر، قدوۃ الدھر، استاذ الاساتذہ، رئیس الجہابذہ، محدث وحید، مفسر فرید، فقیہ بیگانہ، ماہر علوم النقلیہ والعقلیہ مولانا سید انور شاہ قدس سرہ کو آغوشِ رحمت میں کھینچ لیا اور ہم سے ظاہری طور پر ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقتِ حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے جن کا نظیر

مستقبل میں متوقع نہیں طبقۂ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا تبحر، کمال فضل ورع و تقویٰ و جامعیت استغنا مسلم تھا موافق و مخالف ان کے سامنے تسلیم وانقیاد سے گردن جھکاتا تھا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم نے حضرت شاہ صاحب کی تصنیف "اکفار الملحدین" کو دیکھ کر فرمایا کہ :۔

"تکفیر ملحدین اور اہل قبلہ سے متعلق تحقیق میں الشیخ الثقۃ الورع التقی الحافظ الحجۃ المفسر المحدث الفقیہ المتبحر فی العلوم النقلیہ والعقلیہ رافع لوائے تحقیق فی المسائل الغامضۃ المہمہ مولانا شاہ محمد انور صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے ایک رسالہ لکھا ہے اور اس مسئلہ سے متعلق تمام حقوق کو کامل طور پر ادا فرمادیا ہے۔"

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہمیشہ حضرت شاہ صاحب کو چلتا پھرتا کتبخانہ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"مجھے جب مسئلہ فقہ میں کوئی دشواری پیش آتی ہے تو کتب خانہ دارالعلوم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اگر کوئی چیز مل گئی تو فبہا ورنہ پھر حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتا ہوں۔ شاہ صاحب جو جواب دیتے اسے آخری اور تحقیقی پاتا۔ اور اگر حضرت شاہ صاحب نے کبھی یہ فرمایا کہ میں نے کتابوں میں یہ مسئلہ نہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ اب یہ مسئلہ کہیں نہیں ملے گا۔ اور تحقیق کے بعد ایسا ہی ثابت ہوتا۔

سنہ ۱۹۲۷ء و سنہ ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن آرہا تھا تو اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ سیار داس آنجہانی کی روح کو حاضر کرکے اس سے سائمن کمیشن کے نتیجہ کے متعلق دریافت

کیا گیا سیار داس کی روح نے جواب دیا کہ سائمن کمیشن کو ہندوستانیوں کے مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑے گا

احقر (محمد میاں) اس زمانہ میں مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد میں خود حضرت موصوف وحضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ وحضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب کے حکم کے بموجب کام کر رہا تھا۔ اس خبر سے احقر کو خلجان پیدا ہوا۔

اگرچہ مسلمان عامل بھی عملیات سے ارواح کو حاضر کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ خود میں نے اپنے خاندان کے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ ارواح خبیثہ کو حاضر کر کے ان سے گفتگو کیا کرتے ہیں۔ مگر اس کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ ایک مدبر اور لیڈر کی حیثیت سے سیار داس کی روح کو حاضر کرنا اور اس سے استفادہ اور وہ بھی ان یورپ زدہ دماغوں کی طرف سے جو خود روح ہی کے منکر تھے ایک تعجب انگیز بات تھی۔

چنانچہ جب دیوبند حاضری کا اتفاق ہوا تو احقر نے حضرت قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں اپنے شبہات پیش کئے۔

حضرت موصوف قدس اللہ سرہٗ العزیز نے تقریباً ایک گھنٹہ تقریر فرما کر روح اور اس کے حالات کو شرح وبسط سے سمجھایا۔ یورپ روح کا منکر تھا۔ پھر کس طرح قائل ہوا اس کی تحقیق اس مسئلہ میں کیا ہے۔ اور کس طرح اپنی تحقیق میں اضافہ کر رہا ہے۔ امریکہ والوں کو اس مسئلہ سے کس قدر دلچسپی ہے۔ حقیقت کیا ہے اور اس مسئلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ غرض روح کے متعلق تمام گوشوں پر محققانہ روشنی ڈالی۔ حضرت کی تقریر جاری تھی۔ گویا سمندر اُمنڈ رہا تھا۔ میں محو حیرت تھا اور میرا دل اطمینان وانشراح کی کیفیت سے محفوظ ہو رہا تھا۔ سینکڑوں اوراق کے مطالعہ سے وہ بات نہ پیدا ہوتی جو حضرت کی

اس تقریر سے پیدا ہوگئی۔[٥١]

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ میں علمی تبحر و کمالات ظاہری و باطنی کے ساتھ زہد و تقویٰ کی یہ حالت تھی کہ جس طرح آپ علم و فضل میں تمام معاصرین سے ممتاز تھے اسیطرح آپ زہد و تقویٰ، ورع و پرہیز گاری میں بھی بے مثل تھے۔

آپ کو ڈھاکہ یونیورسٹی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے بار بار طلب کیا گیا، بڑی بڑی تنخواہیں پیش کی گئیں۔ لیکن آپ نے کبھی بڑی تنخواہوں کو ترجیح نہیں دی۔ اور ہمیشہ دیوبند وڈابھیل کے خشک ٹکڑوں ہی کو پسند فرمایا۔

بچپن میں آپ کو لہو و لعب اور فضول و بیکار باتوں سے سخت نفرت رہی۔ اور

---

٥١ میں نے مکان پہنچکر اس تقریر کو قلمبند کر لیا تھا۔ مگر افسوس اس گراں قدر یادداشت کو دیمک نے ضائع کر دیا۔ وہ تمام تقریر محفوظ نہیں رہی۔ البتہ بطور خلاصہ چند ضروری افادات درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ (١) شیخ سعدی کی روح کو حاضر کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہیں ہوسکی۔ کیونکہ اس کا مقام بلند تھا اور جو روحیں بطور ہوکل مطلوب روح کو لیکر آتی ہیں۔ حضرت سعدیؒ کے مقام بلند تک ان کی رسائی نہیں ہوسکتی تھی (٢) جھوٹ بولنے، اپنے خیالات یا اپنے مذہب کا پروپیگنڈا کرنے کی عادتیں روحوں میں باقی رہتی ہیں۔ (٣) احادیث مقدسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روحیں قیامت تک عالم برزخ میں رہیں گی۔ جنت یا دوزخ میں داخلہ قیامت کے روز حساب و کتاب کے بعد ہوگا۔ قیامت تک جنت یا دوزخ کے آرام یا تکلیف کے اثرات ان روحوں پر پہنچتے رہتے ہیں۔ اور وہ ان اثرات کی راحت یا اذیت محسوس کرتی رہتی ہیں۔

(٤) عالم برزخ یہی زمین و آسمان کے درمیان کی فضا ہے۔

دورِ شباب بھی سراسر عصمت و عفت۔ متانت اور سنجیدگی کا دور تھا منہیاتِ شرع تو کیا مشتبہات سے بھی ہمیشہ اس طرح شدت سے اجتناب و احتراز فرمایا کرتے تھے کہ گویا ایک مجددِ اسلام اپنے طریقۂ عمل سے شریعتِ حقہ پر ثابت و قائم رہنے کی عملی تلقین کر رہا ہے

ابتدائے عمر ہی سے تجرد و تفرد اور دنیاوی امور سے یکسوئی کو نہ صرف پسند فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ اپنے عمل سے بھی اس کا پورا پورا ثبوت دیا[۱]۔ اس جبالِ علم و عمل کی اس مختصر تاریخِ حیات کو ہم حکیم الامۃ حضرت قبلہ مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہٗ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ارشادات پر ختم کرتے ہیں

"زعیمِ احرار حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیان ہے کہ حضرت حکیم الامۃ تھانوی نے فرمایا کہ میرے نزدیک حقانیتِ اسلام کی دلیلوں میں ایک۔

"دلیل حضرت مولانا انور شاہ صاحب کا امتِ مسلمہ میں وجود بھی ہے۔ اگر دینِ اسلام میں کسی قسم کی بھی یا خرابی ہوتی تو آپ دینِ اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے۔"

"مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحؒ نے حضرت کی وفات کے بعد ۲۹ رمئی ۱۹۳۳ء کو جامعہ ڈابھیل کے ایک جلسہ میں فرمایا کہ:۔

"مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی،

---

[۱] مولانا مشیت اللہ صاحب رئیس بجنور حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مخلص دوست تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں بھی حضرت کے ساتھ ایک حجرہ میں رہے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ زمانہ طالبعلمی میں حضرت شاہ صاحب بستر پر لیٹ کر کبھی بھی نہیں سوتے تھے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے جب نیند آتی بھی بیٹھے بیٹھے سو لیتے تھے۔ اور جب غنودگی ختم ہو جاتی مطالعہ میں مشغول ہو جاتے تھے۔ آخر شب میں تہجد آپ کا معمول تھا۔!!

شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ عز الدین بن عبد السلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے! کیونکہ صرف زمانہ کا تقدم و تاخر ہے ورنہ اگر حضرت شاہ صاحب بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب و محامد بھی اوراق تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہوتے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہو رہا ہے۔"

حضرت علامہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز۔ اجلاس ہشتم جمعیۃ علماء ہند منعقدہ ۲۵ر ۲ر۴ر اکتوبر ۱۹۲۷ء مطابق ۶ر۷ر۸ر جمادی الاخری ۱۳۴۶ھ بمقام پشاور کے صدر تھے۔ اس زمانہ میں شدھی سنگٹھن اور ہندو مسلم بلووں کے طویل سلسلہ نے ہندوستان کی فضا کو مکدر کر رکھا تھا۔ اور نہرو رپورٹ نے جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کے درمیان میں کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ تفرقہ بندی کے اس پُر آشوب دور میں حضرت محترم کے سیاسی خیالات کے اظہار کے لئے خطبۂ صدارت کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

حب وطن کی شرعی حیثیت

ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گذر گئیں۔ انھوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی۔ آج بھی ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت و رفعت کے آثار موجود ہیں۔ موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کے آب و گل سے ہے۔ ہندوستان میں ان کی عظیم الشان مذہبی اور تمدنی یادگاریں ہیں۔ کروڑوں روپے کی جائیدادیں ہیں۔ اعلیٰ شان تعمیروں اور وسیع قطعات زمین کے مالک ہیں۔ ان کو ہندوستان سے ایسی ہی محبت ہے جیسے

ایک سچّے محب وطن کو ہونی چاہئے۔ اور کیوں نہ ہو جب ان کے سامنے اپنے سید و مولا اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حب وطن میں اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے جور و ستم سے مجبور ہوکر حکم خداوندی کے ماتحت اپنے پیارے وطن مکہ معظمہ سے ہجرت کے وقت وطن عزیز کو خطاب کرکے فرمایا:۔

"خدا کی قسم خدا کی تمام زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ پیارا شہر ہے اور اگر میری قوم تیرے اندر سے مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا۔"

اس کے بعد جب حکم الٰہی سے آپ نے مدینہ طیبہ میں سکونت فرمائی اور ہجرت کے بعد دارالہجرت سے منتقل ہونا محبوب و مستحسن نہ تھا۔ اس لئے گویا مدینہ طیبہ آپ کا وطن ہوگیا۔ اور اس میں بحیثیت وطن رہنا تھا تو اس کے لئے دعا فرمائی۔

اللھم حبّب الینا المدینۃ کحبنا	بارخدایا مدینہ کو ہمارے قلوب میں ایسا محبوب بنادے
مکۃ او اشد - اللھم بارک لنا فی	جیسا ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ
صاعنا و فی مدنا و فی تمرنا ضعفی ما	محبت دیدے۔ اے اللہ ہمارے صاع[1] ہمارے مد۔ اور
جعلت بمکۃ من البرکۃ - اللھم ان	ہماری کھجوروں میں مکہ کی برکت سے دوچند برکت عطا فرما۔
ابراھیم عبدک و خلیلک دعاک لاھل	خداوندا آپ کے بندے آپ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام
مکۃ للبرکۃ و انا محمد عبدک و رسولک	نے آپ سے مکہ والوں کیلئے برکت کی دعا کی تھی۔ میں
ادعوک لاھل المدینۃ ان تبارک لھم	تیرا بندہ تیرا رسول "محمد" ہوں اہل مدینہ کیلئے تیری
فی مدھم و صاعھم مثلی ما بارکت	بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ انکے مد اور صاع میں

---

[1] "صاع" اور "مد" پیمانوں کے نام ہیں۔ صاع میں ۳ سیر ۶ چھٹانک گیہوں آتے ہیں۔ اور مد صاع کا چوتھائی حصہ ہوتا ہے ۱۲

لاھل مکۃ مع البرکۃ برکتین۔ | اس برکت سے جو برکت اہل مکہ کو عطا فرمائی دوچند برکتیں عطا فرما۔ ایک برکت کیساتھ دو برکتیں نازل فرما

سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات حبِ وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے کیا ممکن ہے کہ مسلمان سچّا مسلمان ہوکر اس جذبۂ حب وطن سے خالی ہو۔ اور چونکہ ہندوستان میں دوسری قومیں بھی آباد ہیں۔ ان کو طبعی طور پر اپنے وطن ہندوستان سے محبت ہونی چاہئے۔ اس لئے تمام ہندوستانیوں کے قلوب میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی درجہ پر ہونی لازم ہے۔

افغانی خطرہ کا حل

یہ خطرہ کہ آزادی کے وقت اگر کسی مسلمان حکومت نے ہندوستان پر حملہ کیا تو مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا۔ نہایت پست خیال ہے۔ اور اس کا نہایت سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ہمسایوں کی طرف سے کسی معاہدہ کی وجہ سے مطمئن ہوں گے اور ہمسایہ کی تعدّی کا شکار نہ ہوں گے تو ان کا رویّہ اس وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کا اس کے گھر پر حملہ ہونے کی حالت میں ہوتا ہے۔ اگرچہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہو۔ اس سے زیادہ ایک اور بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جب مسلمانانِ ہندوستان اپنے معاہدہ کی وجہ سے پابند ہوں اور غیر مسلم اقوام سے ان کا معاہدانہ برتاؤ واجب ہو تو ایسی حالت میں کسی مسلمان بادشاہ کو مذہبًا اس کی اجازت نہیں کہ مسلمانانِ ہند کے معاہدے کو توڑے۔ اور ہندوستان پر حملہ آور ہو بلکہ اس پر واجب ہوگا کہ وہ مسلمانانِ ہند کے اس معاہدے کا پورا پورا احترام کرے۔

رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ذِمَّۃُ المسلمین واحدۃ | مسلمانوں کا عہد اور ذمہ داری ایک ہے۔

یسعٰی بھا اَدْنَاھُم ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی کوئی عہد کرے تو دوسروں پر اسکا احترام لازم ہے
اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا ارشاد ہے:۔

کل صلح جائز الا صلحا احل حراما او حرم حلالا۔	یعنی سوائے اس صلح کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کر دے ہر قسم کی صلح جائز اور درست ہے۔

میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برادرانِ وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ معاہدہ کرلیں اور اس معاہدہ کو دیانت داری اور خلوص کے ساتھ پورا کریں۔ سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا وفادار مخلص ہمسایہ پائیں گے۔ کیونکہ مسلمان حکم قرآنی کے بموجب معاہدہ پورا کرنیکے ذمہ دار ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا ولم یظاھروا علیکم احدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم ان اللہ یحب المتقین وقال ایضاً۔	جن غیر مسلموں سے تم نے معاہدہ کیا اور انھوں نے ایفائے عہد میں تمہارے ساتھ کمی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کو مدد نہیں دی تو تم بھی معاہدہ کی مدت تک معاہدہ پورا کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔ اور فرمایا جبتک غیر مسلم تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی سیدھے رہو۔ بیشک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔
فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم ان اللہ یحب المتقین۔	

(۳) دارالاسلام۔ دارالحرب دارالامان

اس موقع پر ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے جس کے پیشِ نظر نہ رکھنے سے بسا اوقات شدید غلطیاں واقع ہوجاتی ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ مسائل شرعیہ تین قسم کے ہیں۔ اول جو اسلامی حکومت

اور اس کی شوکت کے ساتھ متعلق ہیں دوسرے جو دار الامان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تیسرے وہ جو "دار الحرب" میں جاری ہوتے ہیں۔ ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ دار الامان کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ دار الاسلام کے احکام جاری ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہٗ العزیز نے تصریح فرما دی ہے کہ ہندوستان دار الاسلام نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحب کا فتویٰ اس وقت کا ہے جب موجودہ زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان میں اسلامیت کا رنگ بہت گہرا تھا۔

ایسی صورت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم دار الامان کے احکام کتب مذہب میں تلاش کریں (اہل علم تفصیل کے لئے در منتقےٰ کے اس باب کو ملاحظہ فرمائیں جس میں اختلاف دار کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

متحدہ قومیت

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:۔ "اگرچہ میں اس مختصر خطبہ میں دار الامان کے تمام احکام پر روشنی نہیں ڈال سکتا۔ تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ اشارات ضرور کر دوں۔ اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ میں آپ کو سید الاولین والآخرین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس معاہدہ کی بعض دفعات کی طرف توجہ دلاؤں۔ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء زمانہ ہجرت میں باہم مسلمانوں اور یہود مدینہ کے ساتھ کیا تھا۔ ان واقعات کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان دار الامان یا دار الحرب میں غیر مسلم اقوام کے ساتھ کس قسم کا معاہدہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ معاہدہ کی عبارت بہت طویل ہے اور عربی

عبارت کے نقل کی چنداں حاجت نہیں ہے اس لئے میں صرف قابلِ ذکر دفعات کا
ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک معاہدہ
ہے جو مسلمانانِ قریش اور مسلمانانِ مدنیہ اور اُن لوگوں کے درمیان نافذ ہوگا جو مذکورہ
جماعتوں کے ساتھ متعلق و حلیف بنگئے ہیں اور اُنکے ساتھ محاربات میں شریک رہے ہیں

(۱) یہ تمام معاہد جماعتیں (قریش، مہاجرین، انصار، یہود مدنیہ) دوسری غیر مسلم
غیر معاہد جماعتوں کے مقابلہ میں ایک جماعت[1] اور ایک قوم شمار ہوں گی (اس کے
بعد مسلمانوں کی مختلف جماعتوں قریش، انصار اور قبائلِ انصار کے متعلق چند دفعات
نقل کرنیکے بعد مندرجہ ذیل دفعات نقل کی ہیں) محمد میاں۔

(۱۴) مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے شخص کی علی الاعلان مخالفت کریں جو کہ

---

[1] اس سے انکار نہیں کہ اس معاہدہ میں باہمی تنازعات کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو آخری فیصلہ تسلیم کیا گیا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کے اشتراک عمل کے لئے اس کو شرط کی حیثیت نہیں دیجا سکتی۔ کیونکہ اگر کسی موقع پر مسلمانوں کی یہ حیثیت نہ ہو اور غیر مسلم قوم سے اشتراکِ عمل کے بغیر خود مسلم مفاد تباہ وبرباد ہو رہا ہو اور ایک تیسری قوم کو تقویت پہنچتی ہو جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کو کچل رہی ہے تو کیا مدبرین اسلام کے لئے جائز ہوگا کہ وہ خاموشی کے ساتھ مسلمانوں کے ملی اور اجتماعی مفاد کی بربادی کا تماشہ دیکھتے رہیں اور الحرب خدعۃ کا تقاضہ یہ نہ ہوگا کہ وہ غیر مسلم سے اشتراک کرکے اس تیسری جماعت کو ختم کر دیں۔ علاوہ ازیں اس موقع پر رئیس المحدثین حضرت شاہ صاحبؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ العالی کے پیش نظر یہ ہے کہ قومیت کا مدار مذہب پر نہیں بلکہ حالات اور مقتضیات کے پیش نظر مسلم اور غیر مسلم کو بھی ایک قوم کہا جاسکتا ہے ۱۲ واللہ اعلم بالصواب (محمد میاں عفی عنہ)

فتنہ و فساد برپا کرتا ہو۔ اور خلقِ خدا کو ستاتا ہو۔[۵۱] تمام مسلمانوں کو متفق ہو کر اس کے خلاف کام کرنا لازم ہے۔ اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا فرزند ہی کیوں نہ ہو ۔۔۔

(۳/۵) کسی مسلمان کو یہ حق نہ ہو گا کہ وہ مسلمان کے خلاف غیر مسلم[۵۲] محارب کو مدد دے۔ اور اس کی اعانت کرے۔

(۴/۶) خدائے تعالیٰ کی پناہ اور ذمہ داری اور عہد ایک ہے۔ یعنی اگر کسی ایماندار بندے نے کسی کو خدا کی پناہ دیدی تو دوسرے مسلمان کو بھی اس کا پورا کرنا لازم ہے۔ خواہ وہ پناہ دینے والا ادنیٰ درجہ کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

(۵/۷) اگر کوئی قوم مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف برسرِ پیکار ہو تو مسلمانوں کو مسلمان کی اعانت واجب ہے۔

(۶/۸) جن یہود نے ہمارے ساتھ معاھدہ کر لیا ہے ان کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کی مدد اور ان کے ساتھ مواسات (ہمدردی) کا برتاؤ کریں اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے۔ اور نہ ان کے خلاف کسی ظالم کی مدد کی جائے۔

(۷/۱۱) مسلمانوں کو پابندیِ عہد میں اعلیٰ مقام پر رہنا اور ارفع ترین مکارمِ اخلاق

---

۵۱ ہنود اور انگریز دونوں کی مثال سامنے رکھو۔ اور پھر غور کرو کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کس نے ختم کی کس کے قوانین نے مسلمانوں کو مفلس اور قلاش بنا دیا۔ اور کس کے کورس و نصابِ تعلیم نے مسلم نوجوانوں کو زندقہ اور الحاد کے طوفان کی نذر کر دیا۔ حجازِ مقدس، شام، عراق، ایران، فلسطین وغیرہ ممالکِ اسلامیہ کی تباہی اور قحطِ بنگالہ جیسے جگر شگاف حوادث و سوانح کے شرمناک دھبے کس کے دامن پر ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ۱۲۵

۵۲ انما المومنون اخوۃ (تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں) اس آیت کو ذہن نشین کرو اور پھر فلسطین، حجاز، عراق وغیرہ ممالکِ اسلامیہ پر نظر ڈالو تو تم خود فیصلہ کر لو گے کہ غیر مسلم محارب کون ہے ۱۲

کا ثبوت دینا اسلامی فرض ہے۔

(۳۱/۱۵) یہود بنی عوف مسلمانوں کے حلیف اور معاہد ہیں۔ یہود اپنے مذہب کے پابند رہینگے اور مسلمان اپنے مذہب کے سوا باقی امور میں مسلمان اور یہود بنی عوف ایک جماعت شمار ہونگے۔ ہاں جو روظلم اور عہد شکنی یا کوئی جرم کریگا وہ اسکی سزا کا مستحق ہوگا۔

(۹/۱۴) اگر مسلمان یا یہود معاہدین کے برخلاف کوئی تیسری قوم جنگ کرے تو ان تمام معاہدین کو متفق ہوکر لڑنا ہوگا۔ اور مسلمان لشکر اپنے مصارف اور یہود لشکر اپنے مصارف کا ذمہ دار ہوگا۔

(۱/۱۸) اپنے پڑوسیوں کو اپنی جان کی برابر سمجھو بشرطیکہ وہ پڑوسی بھی مضرت رسانی اور جرائم کا ارتکاب نہ کریں۔ اس معاہدے کے بعد حضرت شاہ صاحب نے ایک عالمانہ بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

علمائے احناف نے اس معاہدے کو سامنے رکھ کر دار الحرب اور دار الامان کے بہت سے احکام و مسائل اخذ کئے ہیں۔ فقہائے احناف نے دار الحرب میں عقود فاسدہ کے جواز کا حکم دے کر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ دار الحرب اور دار الاسلام کے احکام میں بہت فرق ہے۔ مثلاً عصمت (تحفظ) کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) عصمت موثمہ۔ یعنی ایسی عصمت جس کے توڑنے والے کو گناہ ہوتا ہے مگر کوئی بدل واجب نہیں ہوتا۔

(۲) عصمتِ مقومہ یعنی اسکے توڑنیوالے پر اس نفس معصومہ کا بدل بھی واجب ہوتا ہے اب عصمتِ موثمہ تو صرف اسلام لے آنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا جائے تو قاتل کیلئے جزائے جہنم کی وعید تو بہرحال لازم ہے خواہ

دار الحرب میں قتل ہو یا دار الاسلام میں۔ البتہ دیت یا قصاص وغیرہ کے احکام اسلامی شریعت کے بموجب جب ہی عائد ہوں گے جبکہ دار الاسلام میں ہو۔

مختصر یہ کہ عصمت موثمہ تو صرف اسلام لے آنیسے حاصل ہو جاتی ہے مگر عصمت مقومہ کیلئے دار الاسلام اور حکومت و شوکت اسلامیہ کا ہونا شرط ہے۔

اس بحث کے خاتمہ پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میرا مقصود اس بحث کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ دار الاسلام اور دار الحرب کے احکام کا فرق واضح ہو جائے اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے ہم وطن غیر مسلموں اور ہمسایہ قوموں سے کس طرح اور کتنی مذہبی رواداری اور تمدنی و معاشرتی شرائط پر صلح و معاہدہ کر سکتے ہیں۔ صفحہ ۲۷ خطبہ صدارت۔

یہ علمی بیش بہا خطبہ صدارت ۸۲ صفحات پر ہے جس میں اس زمانہ کے سیاسیات پر بصیرت افروز مباحث کے بعد صوبہ سرحد کے مراسم قبیحہ کی اصلاح کے متعلق بھی مفید مباحث ہیں۔ آخر میں عربی قصیدہ ہے جس کے آخری دو شعروں پر ہم حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کی سیرت کو ختم کرتے ہیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للذی هدانا لهذا و ارشدنا ای مرشد

صلوٰۃ و تسلیم علیٰ خیر خلقہ ختام جمیع الانبیاء محمد

حضرت شاہ صاحب کی درسی خصوصیات

از مولانا مناظر احسن گیلانی

رسالہ دارالعلوم میں احقر کی فرمائش پر مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی نے حضرت شاہ صاحب کی درسی خصوصیات پر ایک طویل مضمون تحریر فرمایا تھا یہی مضمون احقر کے لئے اس پوری کتاب کی ترتیب واشاعت کا محرک بنا ہے۔ مضمون رسالہ کے متفرق پرچوں میں منتشر تھا۔ اب اسے یہاں یکجائی طور پر درج کیا جاتا ہے۔

مولانا دارالعلوم میں طالب علمی کے سلسلہ میں اپنی آمد اور ابتدائی حالات کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

بہرحال اس سے پہلے ہفتہ میں مدرسہ کی زندگی کی جو چیز بھی نظر سے گذر رہی تھی اس سے انس ہی میں انس کا اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ الا یہ کہ اسی ہفتہ میں ایک "دہشت ناک" خبر بھی کان میں گونجی۔ خیال یہ کئے ہوئے تھا کہ مدرسہ میں داخلہ کی جانب سے نائب مہتمم صاحب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مطمئن فرما دیا ہے۔ شک کی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی کہ اچانک مجھے یہ اطلاع دی گئی کہ قانون کے رو سے داخلہ کا امتحان بھی تجھے دینا ہوگا" امتحان" کان کے پردے پر تو اس لفظ کی چوٹ پڑی۔ لیکن اس چوٹ سے دماغ بوکھلا گیا۔ دل دھڑکنے لگا۔ اب تک میری تعلیم ٹونک میں اس طور پر ہوئی تھی کہ تحریری امتحان تو دور کی بات تھی۔ جہاں تک خیال آتا ہے شائد ایک یا دو مرتبہ تقریری امتحان کی مصیبت وہ بھی نام نہاد طور پر

سر سے گذری تھی۔ استاذ مرحوم نے پہلے ہی سے بتا دیا تھا کہ فلاں فلاں مقامات پر تجھ سے پوچھوں گا۔[1] "دریا دیدہ نہ بود" والے گلستان سعدی کے غلام (لڑکے) کی جو حالت تھی وہی حال دار العلوم کے احاطہ میں امتحان کے لفظ سے مجھ پر طاری ہوا۔ گو مدرسہ میں چند ہی دن گذرے تھے۔ لیکن باتونی ہونے کی وجہ سے طلبہ خصوصاً جنکے ساتھ نشست و برخاست زیادہ تھی۔ ان پر ایک گونہ کچھ رنگ بھی قائم ہو گیا تھا۔ اب یہ رنگ پھٹ جائے گا۔ ہوا جو دھوکے اور فریب سے باندھی گئی ہے اکھڑ جائے گی۔ انھیں وسوسوں کی دل و دماغ کے میدانوں میں تگ و دو لکد کوب شروع ہو گئی؟ کیا رسوائی کے پیش آنے سے پہلے نکل بھاگوں کیا کروں؟ طرح طرح کے خیالات ستانے لگے۔ سب سے زیادہ اہم سوال یہ سامنے آیا کہ امتحان کون صاحب لیں گے۔ اِدھر اُدھر سے چاہا کہ اس کا سراغ لگاؤں۔ مختلف بزرگوں کا نام لیا جاتا جو عموماً داخلہ کا امتحان لیا کرتے تھے۔ خیال آتا ہے کہ عموماً حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کا نام زیادہ اس سلسلہ میں لیا جاتا تھا۔ اگرچہ مولانا اس زمانہ میں بجائے استاذ العلماء کے ابھی استاذ الطلبہ ہی تھے۔ لیکن پھر بھی دار العلوم کے اساتذہ میں ان کا شمار تھا۔

---

[1] عام طور پر یہ بات امتحان کے مفہوم کے مناسب نہ تھی۔ اس لئے خیال گذرا کہ ایسا امتحان امتحان ہی کیا ہوا؟ لیکن جب کتاب کھلی بتایا ہوا سوال پوچھا گیا تو جواب میں دشواری کیسا تھی دیدیا گیا۔ یہ فلسفہ کی ایک کتاب کا سوال تھا۔ لیکن استاذ مرحوم نے جب فرمایا کہ میں یہ نہیں دریافت کر رہا ہوں کہ تمہاری کتاب میں کیا لکھا ہوا ہے۔ بلکہ پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ تم خود بھی اس سوال کا کوئی جواب اپنی طرف سے دے سکتے ہو۔ تب معلوم ہوا کہ اب میرا امتحان ہو رہا ہے۔ جواب دیا گیا تھا استاذ مرحوم نے تعریف کی کچھ توقعات اس ناکارہ کی ذات کے ساتھ قائم کی گئی جو افسوس کہ میری شوریدہ بختی کی وجہ سے پورے نہ ہو سکے ۱۲

بعض طلبہ نے اطمینان بھی دلایا کہ مولانا اعزاز علی صاحب زیادہ سختی سے داخلہ کے امتحان میں کام نہیں لیتے۔ اس سے کچھ امید بندھتی۔

الغرض چند دن اسی اُدھیڑ بن میں گذرے۔ اور جب مدرسہ میں پڑھنے ہی کے ارادہ سے داخل ہو چکا تھا تو آنے کے بعد واپس ہو جانے پر دل راضی نہ ہوا۔ خصوصاً دار العلوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا دل و دماغ پر اتنا غیر معمولی تسلط ہو چکا تھا کہ اس ماحول میں پہونچ جانے کے بعد اس کے منافع سے محض اپنی بزدلی کی وجہ سے محروم رہ جانا بڑا حسرت انگیز احساس بن جاتا۔ آخر جس دن کا ڈر تھا وہ سامنے آ ہی گیا۔ اور مجھے مطلع کیا گیا کہ داخلہ کے امتحان کے لئے کتب خانے کے بالاخانے پر حاضر ہو جاؤں۔ اب یاد نہیں رہا کہ پہلے ہی سے کچھ بھنک مل چکی تھی یا اچانک یہ صورت پیش آئی۔ کہ اب تک دور ہی سے دور جس روح پرور جمال افروز وجود کے جلووں سے اپنی آنکھوں کو سینکا کرتا تھا۔ ناگاہ میں نے پایا کہ وہی مقدس ہستی میرے سامنے ہے یا میں اس کے سامنے پیش کر دیا گیا ہوں۔ یہ حضرت الاستاذ الامام العلامہ سیدنا مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ کی ذات پاک تھی۔ فقیر کے داخلہ کا امتحان معلوم ہوا کہ حضرت ہی لیں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ شاہ صاحب ہی کے ذمہ اس سال اس امتحان کا معاملہ کر دیا گیا تھا یا واللہ اعلم بالصواب۔ کوئی خاص اشارہ اس باب میں ان کو ارباب حل و عقد کی طرف سے ملا تھا۔

بہر حال میری آنکھوں کے سامنے پہلی دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ معنوی معصومیت کو دیدہ اور مرئی قالب میں ڈھال کر کسی نے رکھ دیا ہے۔ آنکھوں میں معصومیت، چہرے پر معصومیت، لبوں میں معصومیت، از سر تا پا ہمہ تن معصومیت حسن کردار کا مجسمہ، عفاف و استغنا، صفائے قلب و تقویٰ کی ڈھلی ہوئی کوئی گڑیا، جو کچھ باہر میں ہے وہی سب کچھ اندر بھی ہے۔ سنہرا اور مکتا ہوا چہرہ۔ جس پر رونق و نضارت شادابی و تر و تازگی کھیل

رہی تھی، نثار ہو رہی تھی ڈاڑھی کے بال سیاہ حد سے زیادہ سیاہ، زردی مائل سرخی کی جھلک کے ساتھ روے انور کے رنگ کا ایک جان بخش دل آویز نظارہ میری نگاہوں کے سامنے آیا[1]۔ حضرت الاستاذ الامام کا شباب کا زمانہ تو شاید نہ تھا۔ غالباً چالیس سے اس وقت عمر مبارک متجاوز ہو چکی ہو گی۔ لیکن آب و رنگ کی تازگی و شادابی ایسی تھی کہ ہزار ہا ہزار شبابی مظاہر اس پر نثار تھے۔ غالباً چھوٹی سی دستی میز پر کتاب تھی۔ یہ میر زاہد رسالہ تھا۔ شاہ صاحب نے کتاب کھولی وہ کتاب کھول رہے تھے اور میرے جسم پر رعشہ طاری تھا۔ پیشانی پسینہ سے شرابور، کانپ رہا تھا۔ دیکھئے کہاں سے پوچھتے ہیں۔ کیا پوچھتے ہیں۔ شاید ابتدائی ورق ہی میں خیال آتا ہے کہ بتحقق کل فرد منہ بعد تحقق الموصوف کے الفاظ سے "العلم المتجدد" کی تعریف میر زاہد نے جو کی ہے۔ دریافت فرمایا گیا کہ اس عبارت کا مطلب بیان کرو۔ یہ وہی مقام تھا جس کے مالہ وماعلیہ کے پڑھنے میں تقریباً ایک مہینہ ٹونک کی درس گاہ میں صرف ہو چکا تھا میر زاہد کا منہیہ غلام یحییٰ کے حواشی عبد العلی بحر العلوم العلامہ کے اضافے مولوی عبد الحق خیر آبادی نے اپنے حاشیہ میں ان سب پر جو کچھ لکھا تھا۔ اور خود استاذ مرحوم کا ذاتی حاشیہ اس مقام پر جو تھا سب ہی گھونٹے ہوئے اور پیئے ہوئے تھا لیکن جواب تو وہ دے جو اپنے آپ میں موجود بھی ہو، تین چار دن یا کم و بیش ایک ہفتہ کے اس عرصے میں جو دار العلوم کے احاطہ میں داخلہ کے اس امتحان سے پہلے گذرا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے فضائل و کمالات، علمی تبحر اور غیر معمولی معلومات و محزونات کے ذکر سے دل اس حد تک مرعوب ہو چکا تھا کہ جس وقت

---

[1] حضرت الاستاذ الامام الکشمیری کے سیاہ حلیہ کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئے گا۔ اس وقت اپنے پہلے تاثر کا اظہار مقصود ہے۔ آئندہ اس سلسلہ میں جن باتوں کا خیال آتا جائے گا عرض کروں گا۔ ان کے زیر سایہ بعد کو کافی مدت فقیر کی گذری ؏

پوچھا گیا مطلب بیان کرو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کبوتر شاہین کے پنجوں میں آگیا ہے۔ نہ ہوش ہی باقی تھا۔ اور نہ حواس، کچھ یاد نہیں کہ بدحواسی کے اس عالم میں منہ سے کیا اول فول بے تکی باتیں بے ساختہ نکلیں۔ ایک دو سوال ہی کے بعد کتاب بند ہوگئی۔ اور اجازت اُٹھ جانے کی عطا فرمائی گئی۔ جس وقت اٹھا اس یقین کے ساتھ اٹھا کہ دارالعلوم سے روانگی کا نظم کر لینا چاہئے۔ داخلہ کے لئے جس قابلیت کی ضرورت مدرسہ کے قانون کی رو سے ہے۔ اس معیار پر جس حد تک کوئی کھوٹا ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ قسمت نے آج وہی مجھے ثابت کر دیا اٹھا۔ اور سفر کے خیال کو دماغ میں لے کر اٹھا۔ منہ خشک تھا لب پر پپڑیاں تھیں۔ واپس ہوتے ہوئے دوسرے ہم چشم طلبہ کے خیال سے مصنوعی اطمینان کی کیفیت کو دل سے چہرے پر منتقل کرنے کی کوشش اترتے ہوئے سیڑھی کے زینوں پر کرتا رہا۔ نیچے اترا۔ ساتھیوں میں پہونچا، دل کے خیال کو دل ہی میں دبائے رکھا۔ واقعہ کا علم ان لوگوں کو خود ہو جائے گا کہ داخلہ کی اجازت اس منحوس طالب العلم کو دورے میں شریک ہونے کی نہیں ملی۔

بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔ ہلکا ہلکا سا خیال اس کا بھی آتا ہے کہ میرا ہلر رسالہ کے ساتھ غالباً ہدایہ اولین میں بھی میرا امتحان لیا گیا۔ ہدایہ اولین کا کچھ حصہ ٹونک میں اپنے پنجابی استاذ خمینہ (ملتان) کے رہنے والے مولانا محمد اشرف مرحوم[1]

---

[1] بڑے دلچسپ بزرگ تھے۔ لاہور میں شاہی مسجد کے مدرسہ میں ان کی تعلیم پوری ہوئی تھی۔ مولانا غلام محمد صاحب پنجاب کے مشہور مدرس اپنے زمانہ میں تھے ان ہی سے کتابیں پوری کی تھیں۔ پنجاب کا خصوصی علم اس زمانہ میں نحو کا علم تھا۔ مولانا کی دستگاہ اس علم میں کافی تھی۔ ادب عربی، اور ریاضی سے بھی خاصی مناسبت رکھتے تھے۔ مدرس ہونے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

سے خصوصی طور پر فقیر نے پڑھا تھا۔ ورنہ عام طور پر ہدایہ کے اولین درس نظامیہ کے نصاب میں شریک نہیں ہے جو حشر میر زاہد رسالہ کے امتحان کا میری نظروں میں ہوا تھا شاید وہی کچھ انجام ہدایہ اولین کے امتحان کا ہوا ہو۔ میر زاہد والی بات تفصیلاً اب تک یاد ہے۔ لیکن ہدایہ کا خیال کچھ مٹ سا گیا ہے۔

بہر حال امتحان کے قصے میں جو کچھ گذری تھی اسے دل ہی میں دبائے۔ اور دار العلوم سے بوریا بستر اٹھا لینے کی اندرونی فکروں ہی میں الجھا ہوا تھا۔ کہ اچانک

لے (بقیہ صفحہ گزشتہ) اور کافی معمر ہونے کے بعد فلسفہ اور منطق کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور ٹونک مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر طالب العلمی شروع کی۔ لیکن ان کے علم نے فوراً ٹونک میں ہی ان کو مدرس ہی بنا دیا۔ مدرسہ خلیلیہ میں باضابطہ مدرس ہو گئے۔ پڑھتے بھی رہتے اور پڑھاتے بھی رہتے۔ خاکسار نے مولانا مرحوم سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ادب عربی کی نصابی کتابیں حریری متنبی حماسہ معلقہ سب ان ہی سے پڑھیں اور ریاضی ہیئت ہندسہ کی کتابیں بھی ان ہی سے پوری کیں جن کے دوبارہ دیکھنے کا پھر موقعہ نہ ملا۔ ان کی بے نفسی کا حال یہ تھا کہ درس گاہ میں تو وہ استاذ بن جاتے۔ اور ان کے طلبہ طلبہ لیکن وہاں سے نکلنے کے بعد طالب العلموں سے بھی فروتر اپنے آپ کو خیال کرتے۔ اور طلبہ کے ساتھ ملنے جلنے میں اسی خیال کا اثر نمایاں ہوتا۔ بعد کو جب کوئی ان سے کسی کتاب کے پڑھنے کی خواہش کرتا۔ تو ان کی غایت نیک نفسی تھی کہ فقیر کا نام لیتے اور کہتے کہ بھائی! گو وہ میرا شاگرد ہے۔ لیکن اب مجھ سے زیادہ ان کتابوں کو سمجھتا بھی ہے۔ اور سمجھاتا بھی ہے اسی کو راضی کرو۔ خوب پڑھائے گا اللّٰھم ارحمہ و اغفر لہ ایسا ہی پاک طینت پیدا وار دل کو ہم مسلمانوں کے گھروں میں کہاں ڈھونڈیں۔ ۱۲

ان قدح بشکست و آں ساقی نماند

حکیم منظر حسن صاحب ہی نے غالباً یہ خبر سنائی کہ آپ کے امتحان کی بڑی تعریف ہورہی ہے۔ اور داخلہ آپ کا دورے میں منظور کرلیا گیا ہے۔

آگے یہاں سے حافظہ کچھ جواب دے رہا ہے۔ تفصیلات پر نسیان و ذہول کے بادل چھائے ہوئے ہیں بعض باتوں کا خیال بھی آتا ہے تو چاند کی اس روشنی کی طرح جو گھنگور گھٹا کے کسی پھٹے ہوئے حصے سے اچانک نمودار ہوتی ہو۔ اور پھر چھپ جاتی ہو۔ اور کیا کیا صورتیں اس سلسلہ میں پیش آئیں یاد نہ رہیں۔ بس اب اتنا یاد رہ گیا ہے۔ جس امتحان کے متعلق اپنی ناکامی کا قطعی یقین مجھ میں پیدا ہوچکا تھا۔ ثابت ہوا کہ وہ یقین نہیں صرف وہم تھا۔ اور حضرت الاستاذ العلامہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے خاکسار کے داخلہ کی سفارش اس امتحان کے بعد فرمائی ہے۔

کتابیں مل گئیں اور کچھ دنوں بعد غالباً شوال کی ۲۰؍۲۱ سے باضابطہ درس دورہ کا جاری ہوگیا۔ دیوبند میں تعلیم پانے والے تو دورہ کی اصطلاح سے واقف ہی ہیں لیکن جن کے لئے مدرسہ کی یہ اصطلاح اجنبی ہو۔ ان کے لئے اتنی بات کہہ دینی چاہیئے کہ صحاح ستہ حدیث نبوی کی مشہور مسلمہ کتابوں کو ایک ہی سال میں بطریقہ سرد پڑھانے کا قاعدہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ سے سیکھ کر ہندوستان تشریف لائے۔ اور اسی طریقہ درس کو آپ نے یہاں جاری کیا۔ طریقہ یہ تھا کہ حدیثوں کے معانی و مطالب، مشکلات وغیرہ کے متعلق جو کچھ پڑھانا ہوتا تھا وہ مشکوٰۃ شریف میں پڑھا دیا جاتا تھا۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو قاعدہ تھا کہ ایک دن مشکوٰۃ کی حدیثیں پڑھاتے۔ اور دوسرے دن ان ہی حدیثوں کے متعلق علامہ طیبی کی شرح کا درس طلبہ کو دیتے۔ اسی طرح سے مشکوٰۃ جب ختم ہوجاتی تھی تب دوسرے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحاح ستہ کی حدیثوں کی سند کو متصل کرنے کے لئے مشکوٰۃ ہی کی حدیثوں کو اس میں سند کے بغیر پڑھائی گئی تھیں۔ اب سند کے ساتھ اس طور پر پڑھاتے کہ طالب علم

حدیثوں کو پڑھتا جاتا۔ اور استاد سنتا جاتا بیچ بیچ میں خاص اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوا تو ذکر کر دیا گیا۔ یوں روزانہ پانچ ورق چھ ورق ہو جاتے۔ حضرت شاہ صاحب نے حدیث کے درس کے اس طریقہ کا نام طریقۂ سرد رکھا ہے۔ لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے عام اساتذہ حدیث کا یہی دستور اس زمانہ میں تھا جب وہ حدیث کا علم حاصل کرنے کی لئے ہندوستان سے سفر کرکے مدینہ منورہ پہونچے تھے۔ اسی سرد کے لفظ کا ترجمہ سمجھئے۔ یا زیادہ مانوس لفظ میں اسی کی تعبیر دورہ کے لفظ سے دار العلوم دیوبند میں مشہور ہو گئی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے کے حساب سے دار العلوم والے دورے یا طریقہ سرد میں اتنی ترمیم اور کر دی گئی تھی کہ اہل حدیث کا نیا فرقہ ہندوستان میں جو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور حنفی مذہب کے متعلق یہ شہرت دینے لگا کہ کلیۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے خلاف امام ابوحنیفہ نے اپنے ذاتی قیاسات سے اسلامی شریعت کا ایک مستقل نظام قائم کر دیا تھا۔

اسی مغالطہ کے ازالہ کے لئے اکابرِ دیوبند میں سب سے پہلے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے درس میں اس التزام کا اضافہ کیا کہ حنفی مذہب کی جن مسائل کے متعلق فرقہ اہلِ حدیث نے مشہور کر رکھا ہے کہ صریح حدیثوں کے وہ مخالف ہیں ان کے اس الزام کا سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا جائے۔ دار العلوم دیوبند میں طریقہ سرد کے ساتھ اس التزام کو باقی رکھا گیا۔ اور بحمد اللہ اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ اگرچہ وہ محاذ جو اہلِ حدیث طبقہ نے قائم کیا تھا۔ تقریباً ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکا ہے۔ لیکن مبادا کہ پھر یہ فتنہ سر نہ اٹھائے۔ دار العلوم میں اب تک تر و تازہ حالت میں درسِ حدیث کا یہ التزام زندہ و پائندہ ہے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کو اسی طرح جاری رکھنا چاہئے کہ اس سے جامد تقلید کی ہمیت کا ازالہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اور حنفی مسلک پر علمی بصیرت کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ گذشتہ ادیان و مذاہب میں یہ حادثہ

پیش آچکا ہے کہ بنیادی تعلیم سے ہٹتے ہوئے لوگ فرعی مباحث میں کچھ اس طرح منہمک اور مستغرق ہو گئے کہ بنیادی تعلیم کے سارے وثائق ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گئے۔ اسلام کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ابتداء ہی سے کچھ ایسے قدرتی اسباب پیش آتے رہے جن سے مذاہب و ادیان کے اس عام عارضہ کا ردعمل مسلسل ہوتا رہا۔ خدا خنک اور ٹھنڈی رکھے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک کو کہ دوسری صدی ہجری ہی میں سب سے پہلے وہی اس سلسلہ میں چونکے۔ خطیب نے بغداد کی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ کہ امام مالک اپنے استاد کے حلقۂ درس سے فارغ ہو کر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ عباسیوں کے جدید دارالسلطنت "بغداد" جب تشریف لائے۔ اور وہاں کی جامع مسجد میں اہل علم کی درس گاہوں کا جب آپ کو تجربہ ہوا دیکھا کہ چالیس پچاس کے قریب حلقے قائم ہیں۔ لیکن جس حلقہ میں بھی پہونچتے۔ وہاں قال اللہ کا ذکر تھا۔ اور نہ قال الرسول کا بلکہ فرماتے تھے کہ:-

ھم یقولون قال اصحابنا (تاریخ بغداد ص ۲۲ ج ۲) ان میں ہر ایک یہی کہتا کہ ہمارے اصحاب یعنی اساتذہ نے یہ کہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام کی دینی حمیت کی رگ پھڑک اٹھی۔ اس طرز عمل کا جو انجام ہو سکتا تھا وہ ان کے سامنے آگیا اور ٹھیک جیسے اس زمانہ میں ہر پارلیمانی مجلس میں ایک اپوزیشن پارٹی بھی قائم ہو جاتی ہے۔ اور نہیں ہوتی ہے تو ایسی صورتیں نکالی جاتی ہیں کہ ارکان پارلیمان کی لگام کھینچنے کے لئے کسی نہ کسی طرح مخالفانہ تنقید کرنے والوں کی ٹولی پیدا ہو جائے۔ کچھ اسی نوعیت کی خدمت حضرت امام شافعی سے بن آئی انھوں نے بھی اپنا حلقہ بغداد ہی کے جامع میں قایم فرمایا۔ اور بجائے "اصحابنا" کے

قال اللہ اور قال الرسول کے سننے کا عادی لوگوں کو آپ نے اس طرح بنا دیا کہ خطیب نے اسی موقعہ پر نقل کیا ہے۔

حتی ما بقی فی المسجد حلقۃ غیرہ — یہاں تک کہ مسجد میں امام شافعی کے سوا کوئی دوسرا حلقہ باقی نہ رہا۔

اس سلسلہ میں حضرت امام شافعی میں فرض کا احساس شدت پذیر ہوتے ہوئے اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ اس راہ میں اپنے استاذ امام حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے احترام کی بھی دیکھا گیا کہ اس راہ میں ان کو پروانہ ہوئی بیہقی کا بیان ہے کہ:۔

"امام شافعی کو جب اس کی اطلاع ملی کہ امام مالک کے تلامذہ بجائے یہ کہنے کے کہ اللہ نے یہ فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔ عموماً اپنے حلقوں میں کہتے ہیں کہ امام مالک کا قول یہ ہے، تو میں نے ایک سال تک استخارہ کیا۔ اور اس کے بعد میں نے اعلان کیا کہ امام مالک جو کچھ بھی ہوں بہرحال آدمی تھے۔ اور آدمی سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

بیہقی نے اس قصے کو نقل کرکے آخر میں لکھا ہے کہ:۔

فدعاہ ذالک الی تصنیف الکتاب فی اختلافہ معہ — اور اسی احساس نے امام شافعی کو آمادہ کیا امام مالک کے مقابلہ میں کتاب تصنیف کریں۔

اس معاملہ میں امام شافعی کا جو حال تھا اس کا اندازہ اس قسم کی روایتوں سے بھی ہوتا ہے توالی التاسیس میں حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ کسی نے امام شافعی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ جواب میں آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس مسئلہ میں یہ ہے۔ لیکن پوچھنے والا جو لوگوں کا بگاڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ فرمایئے

کہ اس باب میں آپ کی رائے کیا ہے؟ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ اور امام شافعی کا خون کھول رہا تھا۔ اپنی بات پوچھنے والے نے جب ختم کی تو وہ سن رہا تھا کہ امام کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں۔

"بھلے آدمی! تو نے کیا میری کمر پر زنار (جنیو) دیکھا۔ یا کسی گرجے سے نکلتے ہوئے مجھے کبھی دیکھا ہے؟ میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا اور تو پھر بھی پوچھتا ہے کہ میری رائے کیا ہے۔" (توالی مرمی)

سچ تو یہ ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی وثائق "الکتاب والسنۃ" کی طرف واپس لے جانے کا رواج قائم فرما دیا مرا تو خیال بھی ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان ہی کی آواز بازگشت اسلامی ممالک میں گونجتی رہی۔ جب کبھی دین کے حقیقی سرچشموں (کتاب وسنت) سے مسلمان کسی ملک میں دور ہوئے تو اپوزیشن پارٹی (حزب الاختلاف) کسی نہ کسی شکل اور نام سے عموماً نکل پڑی ہے۔ اور اپنے تنقیدی ہنگاموں سے مسلمانوں کو ہمیشہ مجبور کرتی رہی ہے کہ:۔

کتاب وسنت پر پیش کر کے پھر اس دستور کو جانچ لیں۔ جس کی پیروی دین کے نام سے وہ کر رہے ہیں۔

اسلامی علماء کی اسی اپوزیشن پارٹی کے مشہور سرگرم ممبر حافظ ابن حزم اندلسی جو ظاہریوں کے ممتاز پیشواؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے زمانہ میں بھی یہی صورت پیش آئی تھی۔ ابوبکر ابن العربی صاحب احکام القرآن وشارح ترمذی نے اپنی کتاب ـــــ "العواصم والقواصم" میں لکھا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی اندلس کے مسلمانوں پر آگیا تھا۔ جو مالکی مذہب کے پیرو تھے کہ قرآن وحدیث یعنی الکتاب والسنۃ تو دور کی بات تھی۔ ابن العربی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ:۔

"لوگوں نے امام مالک اور ان کے جلیل القدر ممتاز تلامذہ کا ذکر بھی ترک کر دیا۔ بلکہ عام رواج یہ ہو گیا تھا۔ فتوی دیتے ہوئے لوگ کہتے کہ قرطبہ والے یہ کہتے ہیں۔ طلمنکہ کے مولویوں کا خیال یہ ہے"

طلیطلہ کے علماء کا قول یہ ہے:۔

ابن العربی کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ:۔

فانتقلوا من المدینۃ وفقھائھا الی طلبیرہ وطریقھا۔ (العواصم من القواصم ص۲۷)	لوگ مدینہ اور مدینہ کے فقہاء کو چھوڑ کر طلبیرہ اور طلبیرہ کے راستے پر چل پڑے تھے۔

قرطبہ، طلیطلہ، طلبیرہ یہ اندلس کے ان شہروں کے نام تھے۔ جو ابن حزم کے زمانہ میں دینی علوم کی مرکزیت میں غیر معمولی شہرت حاصل کئے ہوئے تھے۔ گویا اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر دیوبند، سہارنپور، فرنگی محل، بریلی، بدایوں، دہلی وغیرہ شہروں کا حال ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ہندوؤں میں کاشی متھرا، ہردوار، کورک شیتر، پراگ جیسے مذہبی مقامات کی جو نوعیت ہے، یہی کچھ نوعیت اندلس کے ان شہروں کی مسلمانوں کے عہد حکومت میں تھی۔ حافظ ابن حزم اور ان کے ماننے والوں کو جہاں تک میرا خیال ہے مذہب کی آزاد تنقید پر بغیر کسی مرور عایت کے اسی حال نے آمادہ کیا تھا

اور دور کیوں جائیے، خود ہمارے ملک ہندوستان کو بھی اسی زمانہ میں جب مسلمانوں نے اس کو اپنا وطن بنایا تھا اور ان وطن بنانے والوں میں زیادہ تعداد خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ علاقوں کے مسلمانوں کی تھی۔ ان کی دینی ذہنیت کا اندازہ اس مشہور تاریخی مناظرہ سے ہوتا ہے جو غیاث الدین تغلق کے دربار میں مسئلہ سماع پر ہوا تھا۔ ایک طرف خراسان اور ماوراء النہر کے نو وارد مولوی تھے —— جو ہندوستان پہونچ کر شیخ الاسلام اور قضا و افتاء کے عہدوں پر سرفراز تھے۔ اور دوسری طرف صوفیوں کے سرخیل و امام حضرت سلطان جی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ تھے

مسئلہ جب چھیڑا اور سلطان جی کی طرف سے بجائے فقہ کی کسی کتاب کے صحیح مسلم وغیرہ جیسی حدیث کی کتابوں کی روایتیں پیش ہونے لگیں۔ جن سے جواز سماع کا پہلو پیدا ہوتا تھا۔ تو خود سلطان جی کا مشہور بیان ہے کتابوں میں یہ فقرے آپ کی زبانی نقل کئے گئے ہیں کہ مناظرہ کی مجلس سے اٹھ کر جب اپنے لوگوں میں سلطان جی تشریف لائے تو فرمایا کہ ؎

درمعرض حجت احادیث صحیح حضرت	یعنی مقابلہ میں رسول اللہ صلے اللہ
مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نمی شنوند	علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں کو دیہ خراسانے
وہمیں گویند کہ در شہر ما عمل بروایت	مولوی) نہیں سنتے تھے۔ اور یہی
فقہ مقدم ست بر حدیث۔	کہے چلے جاتے تھے کہ ہمارے شہر
(سفرنامہ ضیاء الدین برنی)	(دہلی) میں حدیث کے مقابلہ میں
	فقہ کی روایتوں کو ترجیح دیجاتی ہے۔

خیر میں کہاں کی ہانکنے لگا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ مغلوں کے زوال حکومت کے بعد جب سلطنت کا دباؤ اٹھ گیا۔ اور براہِ راست اس کے بعد دلوں میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے۔ یا پیدا کرانے والوں نے مختلف ہتھکنڈوں سے کام لے کر مسلمانوں میں انتشار و افتراق کی وبا پھیلانے کے لئے ان خیالات کو پیدا کرایا جن میں ایک حادثہ یہ بھی تھا کہ ہندی مسلمانوں کی دینی زندگی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی مخالف ثابت کرنے کی کوشش ملک کے مختلف گوشوں میں جاری ہوئی۔ اور ان مسلمانوں کے پیشوا اور امام حضرت امام ابو حنیفہ کو لعن طعن کا نشانہ چاروں طرف سے بنالیا گیا تھا تو گو بذات خود اس تحریک کو آپ جو کچھ بھی قرار دیں۔ لیکن خیر کا

بہترین پہلو اسی شر سے یہ نکل آیا کہ جس ملک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے زیادہ فقہاء کے اقوال اور فتووں کو اہمیت دینے کا دستور چلا آرہا تھا۔ اس میں ایک نئی علمی ہلچل پیدا ہوئی۔ اور حنفی علماء کے ایک طبقہ نے سنجیدگی کے ساتھ واقعی حنفی مذہب کے مسائل کا کتاب و سنت سے بغیر کسی جنبہ داری کے مقابلہ کرکے جائزہ لینا شروع کیا۔ ان کی سعی اس باب میں مشکور ہوئی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف بہتان کا جو طوفان اٹھایا گیا تھا ان کی کوششوں سے خدا خدا کرکے بیٹھ گیا۔ انھوں نے حنفی مذہب کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق احادیث و آثار کا ذخیرہ جمع کرکے رکھدیا۔ کتابیں بھی لکھی گئیں۔ لیکن کتابوں سے زیادہ موثر اور کارگر مفید طریقہ اس راہ میں حدیثوں کے درس کا دیوبندی طریقہ ثابت ہوا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بلا خوف تردید اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ حنفی مذہب کا ایسا کوئی جزئیہ نہیں نکالا جاسکتا جس کے متعلق آپ کو دیوبندی درس کے پڑھے ہوئے مولوی حدیث اور آثار صحابہ سے تائیدی مواد نہ پیش کر سکتے ہوں۔ باتیں عام ہوگئیں۔ اور ہر کہ ومہ تک ان باتوں کو درس کے اسی عام طریقہ نے پہونچا دیا۔ اب ایک حنفی حنفی مذہب پر عمل ضرور کرتا ہے۔ لیکن اس لئے نہیں کرتا کہ وہ صرف امام ابوحنیفہ کا فتویٰ یا ان کی رائے ہے بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ یہی اقتضاء فلاں فلاں حدیثوں کا بھی ہے۔ اور یہی طرز عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے فلاں فلاں صحابی کا بھی تھا۔ یعنی یہ طریقہ ان بزرگوں کا ہے جن کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا ہے:-

تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من	تو دیکھتا ہے ان لوگوں کو رکوع کرتے ہوئے،
اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم	سجدے کرتے ہوئے ڈھونڈتے ہیں۔ وہ اللہ کے

من اثر السجود (فتح)۔ فضل اور اسکی خوشنودیوں کو صلاح کے نشانات (جھلکتے ہیں) ان کے چہروں میں سجدوں کے اثر سے۔

بھلا قرآن میں جن کی نمازوں اور جن کے رکوع جن کے سجدوں کی تعریف کی گئی ہو۔ حرف گیری کی ان ہی کے متعلق گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے۔

الغرض حدیث کے درس کے اس دیوبندی طریقے نے مسلمانان ہند کے دینی تعلقات کو دین کے اصلی سرچشموں، اور حقیقی بنیادوں (الکتاب والسنہ) کے ساتھ وابستہ کرکے نئے سرے سے پھر تر و تازہ۔ اور شگفتہ کر دیا۔ اور ان کی تعلیم کے اسی تحقیقی پہلو نے:۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ۔ بنالیا (یہود و نصاریٰ) نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب۔

کی قرآنی لعنت سے ان کو ان کے دین کو بحمد اللہ محفوظ کر دیا۔ اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ درس حدیث کی اس خصوصیت کو جب تک زندہ رکھا جائیگا اور وہی اہمیت اس کو حاصل رہی جو پچھلے دنوں میں تھی۔ اور اس وقت تک جہاں تک میں جانتا ہوں کسی قسم کی لاپروائی اس سے اختیار نہیں کی گئی ہے تو مسلمانان ہند کی دینی زندگی قرآنی لعنت کے اس زہر سے انشاء اللہ پاک رہے گی۔ واللہ ولی التوفیق۔

میں قلم روک رہا ہوں، مگر وہ رک نہیں رہا ہے۔ مفید خیالات سامنے آتے چلے آتے ہیں۔ میں بھی لکھتا ہی چلا گیا ورنہ ذکر تو اس کا ہو رہا تھا کہ ۱۳۳۰ھ کے ماہ شوال کی ۲۰ یا ۲۲ تاریخ یا اس کے قریب قریب کسی تاریخ میں جہاں تک میرا حافظہ مجھے یاد دلا رہا ہے دورۂ حدیث کے آغاز کی خبر مجھ تک پہونچی۔ اب یہ یاد نہیں رہا کہ باضابطہ کسی نوٹس کے ذریعہ یہ اطلاع شائع ہوئی تھی یا افواہاً یہ خبر طلبہ میں پھیل گئی۔ زیادہ احتمال دوسری صورت ہی کا ہے اور فقیر بھی دورہ کے دوسرے طلبہ جن کی تعداد صحیح طور پر تو محفوظ نہ رہی۔ مگر ستر اسی کے درمیان غالباً ہوگی (۱۳۳۰ھ کے داخلہ کی تعداد اس سال کے روداد میں ملی

سکتی ہے)۔

بہرحال اب تک بہ مشکل دس پندرہ سے زیادہ ساتھیوں کے ساتھ پڑھنے کا موقعہ ساری زندگی میں جسے نہیں ملا تھا، اسی کے لئے طلبہ کے اس جم غفیر کے گویا میلے یا جھمیلے میں پڑھنے کا نیا بالکل نیا تماشا اور نیا تجربہ تھا۔ اس میں یوپی بہار کے سوا بنگال، پنجاب، سرحد، کشمیر، کابل، قندھار، بخارا اور غالباً چینی ترکستان کا شغر وغیرہ کے طلبہ بھی تھے۔

بہرحال یوں ہی اب صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ ہفتہ یا ہفتہ سے زیادہ دن گذرے کہ درس کا اعلان ہوا۔ معلوم ہوا کہ کل سے دورے[ا] کے اسباق شروع ہوں گے۔ کتابیں جن کے اسباق شروع ہونے والے تھے، کتب خانے سے برآمد کرلی گئی تھیں۔ صبح کی نماز کے بعد ہی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے حضرت سیدنا الامام الکشمیری کے یاں صحیح مسلم کا سبق شروع ہوگا۔ طلبہ کا ہجوم تھا۔ ان ہی کے جھمیلے میں خاکسار بھی نودرہ کی چھت کے شمالی سمت پر جو ایک کمرہ تھا اسی میں حاضر ہو گیا۔ اتنی بڑی تعداد والی جماعت

[ا] دار العلوم میں تعلیم پانے والے علماء تو دورہ کی اصطلاح سے واقف ہیں۔ لیکن عام ناظرین کی آگاہی کے لئے شاید یہ عرض کرنا مفید ہوگا کہ حدیث کی تعلیم کے جس طریقہ کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں "طریقہ سرد" سے فرمایا ہے تفصیل جس کی خاکسار نے ان کی کتابوں سے اخذ کر کے اپنی کتاب "مسلمانان ہند کا نظام تعلیم و تربیت" میں درج کی ہے درحقیقت اسی طریقہ سرد کی تعبیر دار العلوم دیوبند کے تعلیمی حلقوں میں "دورہ" کے لفظ سے کیجاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے درس کے اس طریقہ میں تھوڑی سی ترمیم یہ کردی گئی ہے کہ غیر مقلدین یا فرقہ اہلحدیث نے یہ چرچا جو پھیلا دیا تھا کہ حنفی مذہب کے مسائل صحیح حدیثوں کے مخالف ہیں اس غلط بے بنیاد خیال کی تصحیح کیلئے ان تمام مسائل کے متعلق جنکو اپنے اعتراضات کا نشانہ غیر مقلدوں نے بنا رکھا تھا سنبھلکر گفتگو کیجاتی ہے۔ اور امام ابو حنیفہ کے اجتہاد کی صحیح بنیاد سے طلبہ کو واقف بنایا جاتا ہے اور گویا "مختلفیات" پر بحث بھی اب دورہ کے طریقہ درس کا ایک گونہ لازمی جزء بن گیا ہے۔۱۲

میں شریک ہو کر پڑھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ خیال آتا ہے کہ صحیح مسلم کا اتفاقاً وہی نسخہ مجھے کتب خانے سے ملا تھا۔ جو اپنے طول و عرض میں حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں غیر معمولی طور پر ممتاز تھا۔ لیکن کرتا کیا اسی طویل و عریض کتاب کو لے کر کوٹھے پر چڑھ گیا۔ درس کے کمرے میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ طالب العلموں نے ان ہی تپائیوں پر قبضہ کر لیا۔ ایک تپائی میرے حصہ میں بھی آئی۔

خیال تھا کہ جیسے عام طور پر ہمارے مدارس کا دستور ہے طلبہ کتاب کی عبارت پڑھیں گے۔ اور حضرت شاہ صاحب پھر اس عبارت کا مطلب اور ترجمہ طلبہ کو بتائیں گے لیکن پہلی دفعہ درس کے ایک نئے طریقے کے تجربہ کا موقع میرے لئے یہ تھا کہ بسم اللہ بھی کتاب کی شروع نہیں ہوئی تھی کہ علم کا ایک بحرِ بے کراں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرے دل و دماغ کے ساحلوں سے ٹکرانے لگا۔

ایسے اساتذہ (غفر اللہ لہم) سے بھی پڑھنے کا موقعہ ملا تھا۔ جو کتاب کو شروع کراتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس قسم کی عام باتوں کا تذکرہ عموماً کیا کرتے ہیں کہ مصنف نے خدا کی حمد سے کتاب کیوں شروع کی۔ اور اسی عام سوال کو اٹھا کر اس کا جو مقررہ جواب کتابوں میں لکھا ہے۔ لفظوں کے الٹ پھیر سے دہرانے کے عادی تھے "صلوٰۃ" کی شرح اور مختلف امور کی طرف اس لفظ کا انتساب اس کے معانی میں کن تبدیلیوں کو پیدا کرتا ہے۔

الغرض مسلمان مصنفوں کی کتابوں کے دیباچہ کے عمومی اجزاء کے متعلق سوال و جواب، قدح کا موروثی سرمایہ حواشی و شروح میں جو منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اسی کو غریب طالب العلموں پر پیش کر کرکے اپنی علمی وسعت کو ظاہر کرتے تھے۔ لیکن

الامام الکشمیری نے قبل اس کے کہ کتاب کا کوئی لفظ بھی شروع ہوا ہو۔ ایک خاص قسم کی دل کش، ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی۔ کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا۔ تقریباً چالیس سال بعد اس کا دُہرانا آسان نہیں ہے۔ لیکن بعض انقلابی تاثرات کا نشان حافظے پر جہاں تک خیال کرتا ہوں اب بھی باقی ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ صحیح مسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ بطور مقدمہ کے شروع کتاب میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے بعض بنیادی کلیات اور اساسی اصول ونظریات کی طرف سیدھے سادے الفاظ میں ایسے بلیغ وعمیق اشارے کئے ہیں۔ جن کے صحیح وزن کو گو فن سے ناواقف آدمی محسوس نہیں کر سکتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ امام مسلم کے بعد یوں تو اصول حدیث میں بڑی چھوٹی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن باوجود اس کے امام مسلم کے مقدمہ میں اب بھی پانے والے اس علم کے لیے اہم نکات اور حقائق کو پاتے ہیں۔ یا پا سکتے ہیں۔ جو شاید دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتے۔ حق تعالیٰ کے افضال بے پایاں میں ایک بڑا فضل اس شوربخت، سیاہ کار کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ حدیث ہی نہیں بلکہ اصول حدیث کے ان چند قیمتی اوراق کے پڑھنے ہی کا نہیں بلکہ ان اوراق پر وقت کے ایک امام کے عالمانہ خطبات کے سننے کا موقع اس بے بضاعت کے لئے آسان کیا گیا۔ پہلے دن کے پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے والے معلومات یکایک میرے سامنے آ گئے۔ اس وقت تک میرا تاثر تھا کہ قرآن کے سوا بجز چند گنی چنی روایتوں کے صاحب شریعت کی طرف قطعی یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کسی امر کا انتساب نہیں کیا جا سکتا۔ گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنی اور یقین کی قوت سے محروم ہے۔ لیکن

یہ پہلا دن تھا۔ جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سوا تواتر طبقہ، تواتر عمل، تواتر قدر مشترک کی نئی قسموں کو سُنا۔ سمجھایا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس تواتر کا دعوےٰ عام کتابوں میں کیا جاتا ہے یہ دعویٰ صرف اسناد والے تواتر کی حد تک محدود ہے۔ ورنہ دین کا بڑا اہم حصہ تواتر طبقہ اور تواتر عمل و تواتر قدر مشترک کی راہ سے منتقل ہو کر مسلمانوں کی پچھلی نسلوں سے اگلی نسلوں میں پہونچا ہے اور تواتر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے۔ جو قوت اسناد والے تواتر میں پائی جاتی ہے[1]

یہ پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا بنیائی نظام میرے لئے یقینی و قطعی ہو گیا اور جیسے جیسے تمیز و شعور میں سن کے لحاظ سے اضافہ ہوا۔ بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ سند کی کثرت اور راویوں کے تعدد کی ضرورت عموماً ان ہی باتوں میں ہوئی ہے جو روایت کی راہ سے منتقل ہوئی ہوں۔ لیکن ایسی بات کہ شاہجہاں بادشاہ ہندوستان کے حکمراں تھے یا سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ تلاش کرنا کہ روایت کرنے والے ان کے کون ہیں۔ جنوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے اسی طرح اس قسم کی باتیں کہ مسلمانوں پر مثلاً پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں۔ عرب میں الکعبہ نامی عمارت کا حج فرض ہے۔ سال میں رمضان کا مہینہ جب آئے تو روزہ مسلمانوں کو رکھنا پڑتا ہے یہ ایسی باتیں ہیں جنھیں مسلمان ہی نہیں۔ بلکہ جو مسلمان نہیں ہیں ان کے نزدیک بھی اسلام کے یقینی عناصر ہیں۔ یہی تواتر عمل کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح حاتم کی سخاوت، رستم کی شجاعت، اگرچہ گذرے ہوئے واقعات ہیں۔ لیکن ان کے تفصیلات مثلاً حاتم کی طرف سخاوت کے یا رستم کی طرف بہادری کے جو قصے مشہور ہیں۔ ان قصوں کا یقین ہونا تو ضروری نہیں ہے۔ لیکن ان قصوں کا قدر مشترک یعنی حاتم سخی تھا، رستم بہادر آدمی تھا۔ اس قدر مشترک کے یقینی ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ حضرت الاستاذ العثمانی مولانا شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صحیح مسلم میں تواتر کی ان قسموں کا ذکر کر کے اعتراف کیا ہے کہ پہلی دفعہ مولانا انور شاہ صاحب سے یہ بات سننے میں آئی ۱۲۔

ہی ہوتا چلا گیا۔ خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا۔ مسلمانوں کے دینی اختلافات کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انوری تحقیق سے پیدا ہوا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ یوں تو فطرتاً ادیب تھے۔ اسی لئے اردو زبان جو ان کی مادری زبان نہ تھی۔ چاہتے تو اس زبان کے بہترین ادیب وخطیب کی شکل میں اپنے آپ کو نمایاں فرما سکتے تھے۔ لیکن مسلسل عربی کتابوں کے مطالعہ وادب عربی کی دوامی مزاولت کا یہ اثر تھا کہ زبانِ مبارک پر عربی زبان کے الفاظ ہی زیادہ ترچڑھے گئے تھے۔ بلکہ طریقۂ بیان بھی آپ کا عربی طرزِ بیان سے زیادہ متاثر تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ گو تعلیمی وتدریسی زبان آپ کی اردو ہی تھی۔ لیکن عربی زبان کے ایسے الفاظ جو اردو میں عموماً مستعمل نہیں ہیں۔ اضطراراً آپ کی زبانِ مبارک سے مسلسل نکلتے رہتے تھے تو اسی کے مذکورہ بالا اقسام چارگانہ کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان سے پہلی دفعہ میں نے طبقۃً بعد طبقۃٍ کے عام الفاظ کے ساتھ جیلاً بعد جیلٍ کے الفاظ سنے تھے۔ ان کی غرابت کا احساس اب بھی میرے حافظہ میں زندہ ہے۔ شاید اسی موقعہ پر "الکافۃ عن الکافۃ" یا "الکواف عن الکواف" ابن حزم کی مخصوص اصطلاح بھی سننے میں آئی تھی۔

اس قسم کے غیر مشہور یا اردو زبان میں جو الفاظ عربی کے مروّج نہ تھے۔ ان کے استعمال کرنے کی غرض ممکن ہے کہ یہ بھی ہو کہ عام مسلمانوں کو نہ سہی، لیکن عربی مدارس کے طلبہ کا ان الفاظ سے مانوس ہونا۔ ان کی شان کے مناسب تھا۔ اور شاہ صاحب شائد اس طریقہ سے طلبہ کو ان عالمانہ اصطلاحات اور تعبیروں سے مانوس بنانا بھی چاہتے تھے۔

مجھے یاد پڑتا ہے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب نے ان غریب اصطلاحات کے استعمال پر

کی توجیہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ بعض چیزیں دنیا میں ایسی ہیں جن کا ذکر کنائے اور اشارے ہی میں کرنا عام انسانی تہذیب کا اقتضاء ہے۔ پھر یہ نکتہ ان ہی سے سننے میں آیا۔ اور بالکل صحیح بات تھی کہ تراشنے والے ان ہی چیزوں کی تعبیر کے لئے اچھے اچھے الفاظ تراش لیتے ہیں۔ "پائین خانہ" مکان کے پچھلے حصہ کو کہتے تھے۔ پھر اس سے "بیت الخلا" مراد لینے لگے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ "پاخانہ" کی شکل اختیار کر کے خود یہ لفظ بھی گندہ ہو گیا۔ فرماتے تھے کہ معانی کی گندگی رفتہ رفتہ الفاظ تک منتقل ہو کر پہونچ جاتی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تھوڑے تھوڑے دن بعد اس قسم کے الفاظ پر نظر ثانی کیلئے اپنے اسی خیال کے مطابق عورتوں کے ایام کی تعبیر میں وہ ہمیشہ "ایام طمث" استعمال کرنے کے عادی تھے۔ کیونکہ "حیض" کا لفظ حالانکہ خود کنائی تعبیر ہے۔ لیکن کثرت استعمال نے اس کو بھی اس قابل نہیں رکھا کہ مہذب مجلسوں میں اس کے استعمال کو آئندہ جاری رکھا جائے۔

بہر حال پہلے دن کے درس میں علاوہ معانی کے نئے نئے عربی الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ بھی میرے دماغ میں شاہ صاحب کے درس کے اندر جمع ہو گیا۔ ان کی بیان کی خصوصیت کا ایک غیر شعوری اثر مجھ میں یہ پیدا ہو رہا تھا کہ عربی زبان میں اب تک کسی مطلب کو ادا کرنے کی ہمت مجھے نہ ہوئی تھی۔ لیکن سبق پڑھ کر جب قیام گاہ پر آیا۔ اور شاہ صاحب کے عطا کئے ہوئے گوناگوں معلومات کا جائزہ لینے لگا تو یہ محسوس ہوا کہ اپنے کمزور حافظہ سے اس کی امید نہیں کہ ان کی بتائی ہوئی باتوں کو وہ یاد رکھیگا۔ اسی لئے فیصلہ کیا کہ کل سے کاغذ اور پنسل ساتھ لیتا جاؤں گا۔ اور ان کی تقریر کو قلم بند کروں گا۔ اور آج جو کچھ سنکر آیا ہوں قبل اس کے کہ میرے حافظہ سے وہ نکلے۔

اسے لکھ لینا چاہئے۔ شاہ صاحب کی تقریر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس کا اسلوب ہی ایسا تھا کہ بجائے اُردو کے ان کے معلومات کا مجھے محسوس ہوا کہ عربی میں قلم بند کرنا شاید زیادہ آسان ہے۔

یہی سوچ کر جو کچھ آج سن کر آیا تھا، پنسل سے ان کو عربی عبارت میں نوٹ کرنے لگا۔ اور پہلی دفعہ مجھے اس کا اندازہ ہوا کہ غلط سلط ہی۔ لیکن ٹوٹی پھوٹی عربی میں مطالب کی تعبیر کی گونہ صلاحیت مجھ میں بھی ہے۔

دارالعلوم میں حدیث کی تقریروں کے قلم بند کرنے کا رواج نیا رواج نہ تھا۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بعض لوگوں کے پاس مکتوبہ شکل میں پائی جاتی تھی اسی طرح حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ترمذی والی تقریر متعدد بزرگوں کی مرتب کی ہوئی طلبہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن میں جہاں تک جانتا ہوں، حضرت الامام الکشمیری کی تقریروں کے قلم بند کرنے کا ارادہ شاید اس فقیر سے پہلے کسی صاحب نے نہیں کیا تھا۔ یوں بھی عربی زبان میں حدیث کی تقریروں کی تعبیر کی روایت مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس فقیر کے بعد اس سے کہیں زیادہ لائق و فائق قابل و فاضل مستعد اور جفاکش محنتی طلبہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اردگرد جمع ہو گئے۔ جنھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ قرار دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو "معارف انوریہ" کے اس بحر بے کراں کو قید تحریر میں لانے کی کوشش کی جائے۔ مولانا بدر عالم میرٹھی، اور مولانا محمد یوسف البنوری (متعنا اللہ بطول بقائہما) کے سوا پنجاب کے ایک بزرگ مولانا محمد چراغ جامع تقریر ترمذی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے سوا سنن ابی داؤد اور ابن ماجہ کے متعلق بھی حضرت شاہ صاحب کے درسی افادات کے جمع کرنے کی

توفیق خاکسار کے بعد مختلف افراد کو بخشی گئی۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ان صاحبوں نے بھی بجائے اردو کے عربی زبان ہی کو تعبیر کے لئے اختیار فرمایا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ حضرت شاہ صاحب کے طرز بیان، اور طریقۂ تدریس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اردو سے زیادہ عربی زبان ہی میں ان کی تقریروں کا قلم بند کرنا زیادہ آسان معلوم ہوتا تھا، ہو نہیں ہے یا ازیں قبیل اردو کے عام افعال کے سوا الفاظ کا بڑا ذخیرہ ان کی تقریروں میں عربی ہی کا ہوتا تھا۔ کم از کم فقیر کا احساس تو یہی ہے۔ اور اسی چیز نے خود مجھ میں بھی یہ جسارت پیدا کی کہ پہلے عربی عبارت کی لکھنے کی مشق و عادت کا موقعہ حالانکہ اپنی تعلیمی زندگی میں نہ ملا تھا۔ لیکن امام کشمیری کے صف فعال میں شریک ہو جانے کا اثر تھا کہ روزانہ تین تین چار چار ورق بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ برجستہ قلم عربی میں ان کی تقریروں کو لکھ لیا کرتا تھا۔

اس کا افسوس ہے کہ ظلم کرنے والوں نے مجھ پر ظلم کیا۔ اور زندگی کے اس سودے کو جو جان سے بھی زیادہ عزیز تھا کسی صاحب نے اس سے مجھے محروم کر دیا۔ جب اسکا خیال آتا ہے تو بے ساختہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ کا مشہور شعر ؎

انچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدے ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

میرے پاس زمانے تک کئی سو صفحات کی یہ تقریر موجود تھی، جلد بندھوالی گئی تھی۔ حضر سفر میں ساتھ رہتی تھی۔ اچانک ایک دن تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی نے اڑا لی۔[لہ]

لہ فقیر کے رفقاء درس میں سے دو صاحب ایک تو بخارا کے ملا عبد الحکیم اور دوسرے دربھنگہ کے مولانا عبد الرحیم دونوں التزاماً میری مرتبہ تقریر کو روزانہ نقل کر لیا کرتے تھے۔ اور ان دونوں کے پاس بھی مجلد شکل میں یہ تقریر موجود تھی۔ بخاری صاحب بیچارے کے متعلق تو یہ بھی معلوم نہیں کہ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

سچ تو یہ ہے کہ فقیر کے بعد ترمذی۔ اور بخاری شریف کی املائی شرح فیض الباری مرتبہ مولانا بدر عالم المیرٹھی۔ اور اسی کے ساتھ مجلس علمی ڈابھیل حضرت شاہ صاحب کے دوسرے افادات کو شائع کر کے محفوظ نہ کر دیتی تو خدا ہی جانتا ہے کہ اپنی اس ٹوٹی پھوٹی شکستہ و پراگندہ تقریر کے گم ہو جانے کا اثر مجھ پر کیا مرتب ہوتا۔ لیکن حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مشہور قرآنی قانون :-

وامّا الزبد فیذھب جفاءً وامّا	لیکن جھاگ سو سوکھ کر ختم ہو گیا اور لوگوں کو جس سے
ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (رعد)	نفع پہونچتا ہے وہ ٹھہر گیا زمین میں۔

کی عملی تفسیر اس باب میں بھی مرنے سے پہلے اپنے سامنے آگئی جو چیز مٹنے اور گم ہونے کی مستحق تھی۔ وہ گم ہو گئی۔ لیکن واقعی منافع للناس کی جن چیزوں میں ضمانت تھی قدرت کی طرف سے اس کے باقی رکھنے کا ایسا استوار محکم نظم کر دیا گیا کہ جس وقت خاکسار نے اپنی املائی تقریر کو قلم بند کرنا شروع کیا تھا اس زمانہ میں اس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حق تعالیٰ نے اپنے بعض خاص مخلص بندوں[۱] کے دل میں "معارف انوریہ" کی صحیح قدر د

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کہاں ہیں اس دنیا میں ہیں بھی یا عالم آخرت کی طرف منتقل ہو گئے۔ اکثر فرمایا کرتے کہ جب بخارا جاؤں گا تو یہی تقریر تیری یاد کو تازہ رکھے گی۔ بڑے نیک شریف بزرگ تھے "گذر پلاؤ" کبھی کبھی خوش ہو کر خاص فقیر کیلئے پکاتے۔ بڑا لذیذ پلاؤ ہوتا تھا۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ مولانا عبد الرحیم صاحب کے پاس بھی وہ تقریر محفوظ ہے یا نہیں۔ شاید ستار العیوب کا لطف خفی بھی اس تقریر کے گم ہو جانے میں کارفرما ہو۔ کیونکہ لکھنے کی حد تک فقیر نے لکھ ضرور لیا تھا۔ لیکن معنوی اور لفظی اغلاط کے انبار کے سوا جہاں تک میرا اندازہ ہے شاید وہ نوشتہ اور کچھ نہ تھا۔ اور نہ اس کے سوا وہ کچھ اور ہو سکتا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اپنی رسوائی اس کے باقی رہ جانے کی صورت میں کیسی اور کہاں تک پہونچتی ۱۲

[۱] یہ فقیر کے کرم فرما میزبان کریم مولانا محمد موسیٰ الجوہانسبرغی الافریقی ثم الباکستانی ہیں۔ شاید اپنے نام کا اظہار ان پر اب بھی گراں ہو۔ لیکن واللہ مخرج ما کنتم تکتمون کرنا ہوتی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

قیمت کا احساس پیدا کیا۔ بخاری کی املائی شرح فیض الباری کے مسودے کو لے کر ایک صاحب مصر بھیجے گئے۔ اور مصر میں قیام کرکے اس عزیز الوجود گرامی منزلت کتاب کو بہترین کاغذ پر روشن اور مجلّی ٹائپ کے حروف میں طبع کرا کے واپس آئے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وہی افادات قیمہ جن کے متعلق اندیشہ تھا کہ دار العلوم دیوبند کے احاطہ ہی میں خدانخواستہ گم ہو کر ختم ہو جائیں گی۔ چاہنے والے نے جب چاہا تو اسلامی دنیا کے مشارق الارض و مغاربہا کے آخری حدود تک ان کو پہونچا دیا۔ اور کون کہہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) قانون کا وہ کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حدیث بھی تو ہے لو ان رجلا عمل عملا فی صخرۃ صماء لا باب فیھا ولا کوۃ خرج عملہ الی الناس کائناً ما کان (رواہ احمد والحاکم وصحح) پھر یہ عمل تو محفلہا و مجلسہا کا عمل ہے راز نہاں بنکر کیسے رہ سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ الامام الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ تلامذہ اگرچہ کافی وسیع و عریض ہے۔ لیکن سمتاً وہدیاً و دلاً بلکہ شکلاً وصورتاً وزیاً وریاً ان سے جتنا زیادہ قریب مولانا محمد بن موسیٰ کو میں نے پایا۔ فنائیت کی یہ کیفیت دوسروں میں کم از کم مجھے تو نہ ملی۔ نعم المال الصالح العبد الصالح کی شرح بھی جوہانسبرگ کے التاجر الامین ہی کے قالب میں میرے سامنے پہلی دفعہ پیش ہوئی۔ ان کی ذرہ نوازیوں کو دل بھلا نہیں سکتا۔ میزبانی کا شرف چند دنوں کے لئے اس فقیر کو جب حاصل ہوا تھا۔ تو ان ہی کو نہیں انکے گھر کے ارکان بلکہ نوکروں اور ملازموں میں بھی اکرام ضیف کے بہترین سلیقہ کا تجربہ ہوا تھا۔ فیض الباری بخاری کی شرح کشمیری اور اسی کے طفیل میں امام زیلعی کی تخریج ہدایہ دونوں کتابیں فقیر تک مولانائے موصوف کے بذل و نوال کے توسط سے پہونچیں فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء ۱۲۔ اس موقع پر مولانا احمد رضا بجنوری ابدہ اللہ بروح منہ کا ذکر بھی مجھے کرنا چاہئے کہ مجلس علمی ڈابھیل انہی کی انتھک کوششوں کی رہین منت ہے اس مجلس کے ناظم وہی ہیں جنکا دفتر اب کراچی منتقل ہو گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب سے خویشگی کی پیوند کا شرف بھی مولانا کو حاصل ہے۔ طال اللہ عمرہ ۱۲

سکتا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ کتنی نسلیں سرزمینِ ہند کے ان علمی اکتشافات سے مستفید اور تمتع پذیر ہوتی رہیں گی، قابل رشک ہیں۔ وہ لوگ جنھیں اس علمی فہم کی مختلف منزلوں میں حصہ لینے کی توفیق بخشی گئی۔ تاہم میرا یہ مظنہ اگر صحیح ہے کہ اپنی ساری کوتاہ نصیبیوں کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کی درسی تقریروں کی قلم بندی کے سلسلے میں تقدم وسبقت کی نعمت سے ابتدائً وہی دیوانہ سرفراز ہوا تھا جس کا جنون اس علمی امانت کے بار کا تحمل نہ ہوسکا۔ تو ارادی نہ سہی اضطراری سعادت سے چاہئے تو یہی کہ اسی بھی محروم نہ ٹھیرایا جائے جب "ورقاء غصن ایکہ" (بکائن کی شاخ پہ گوگو کرنیوالی فاختہ) کے "فضل تقدم" کا اعتراف کرتے ہوئے عرب کے شاعر نے کہا تھا۔ اور چڑیا تک کے متعلق انسانوں نے اقرار کیا کہ:۔

ولکن بکت قبلی فہیج لی البکاء　　　بکاھا فقلت الفضل للمتقدم

(لیکن فاختہ مجھ سے پہلے رو پڑی۔ اسی کے رونے سے مجھ پر بھی گریہ طاری ہوا۔ اسی لئے میں نے مان لیا کہ برتری اسی کو حاصل ہوئی جس نے رونے میں سبقت کی)۔ شاید کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ:۔ ؎

میں جو رویا تو رو پڑی دنیا　　　شور سے اپنے شور ہے برپا

بہرحال بقول شخصے کہ:۔

عشق سے ہونگے جنکے دل آباد　　　قیس مرحوم کو کریں گے یاد

اور میں ممنون ہوں کہ بخاری کی املائی شرح فیض الباری کے مقدمہ میں صحیح مسلم کی گم شدہ میری مرتبہ املائی تقریر کا ذکر کردیا گیا ہے۔ جزاہم اللہ عنی خیر الجزاء۔

خیر قصہ تو حضرت شاہ صاحب کی درسی خصوصیات کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ باتوں باتوں میں صرف حدیث ہی نہیں۔ بلکہ دوسرے علوم کے ایسے اہم کلیات ہاتھ ان کے درس میں آجاتے تھے کہ اپنے ذاتی مطالعہ سے شائد ساری عمر ان تک ہم جیسے نارساؤں کی رسائی آسان نہ تھی۔

حدیث کے متعلق "تواتر" کی اقسام چارگانہ کے سوا اصولِ حدیث کی الاعتبار کی اصطلاح کی شرح کرتے ہوئے شاہ صاحب نے جو تقریر فرمائی تھی۔ حالانکہ تقریباً نصف صدی کے قریب زمانہ گذر چکا ہے۔ لیکن وساوس و شبہات، شکوک و اوہام کی جو تاریکیاں اچانک میرے سامنے سے چھٹ گئی تھیں۔ اور سکینت و طمانینت کی جو لذت اس وقت میسر آئی تھی۔ دل میں اس کی خنکی اور حلاولت اس وقت تک موجود ہے۔ ایک ہی حدیث کے متعلق اعتبار کے قاعدے سے اعتماد اور بھروسہ کی جو منطقی قوت فراہم ہوتی ہے۔ صحیح طور پر اس وقت کے واقف ہو جانے کے بعد اپنی جبلت سے آدمی اعتماد کی اس کیفیت کے نکالنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔ جو قدرتاً اس عمل کے بعد دلوں میں حدیثوں کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے[ل]۔

[ل] ایک ہی حدیث کے مختلف اسناد کا مقابلہ کر کے دیکھا جاتا ہے کہ قدر مشترک سب کی روائتوں کا کیا ہے اور اختلافی عناصر اس میں کتنے پائے جاتے ہیں۔ جستجو کے بعد قدر مشترک کے متعلق یقین کرنا پڑتا ہے کہ راویوں کے ارادی یا اضطراری تصرف سے وہ پاک ہے آخر خود سوچئے کسی کا پیغام دس آدمیوں کے ذریعہ آپ تک پہونچے۔ پہونچانیوالوں کے بیان میں جو حصہ سب میں مشترک ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے متعلق بھی ماننا پڑیگا کہ کم از کم پیغام کا یہ مشترک حصہ ضرور اسی پیغام کا جزء ہے جسے پیغام بھیجنے والے نے ہم تک روانہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پر اعتبار کے اس عمل سے قدر مشترک کا کافی ذخیرہ دستیاب ہو جاتا ہے۔ عوام کو اندازہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن فن کے ماہرین و حذاق جانتے ہیں کہ اس معیار پر حدیثوں کا کتنا بڑا ذخیرہ شکوک و شبہات سے پاک بلکہ لفظی روایت کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۱۲

اور صرف یہی نہیں بلکہ جیسے " تواتر" کی تقسیم کی روشنی میں حدیثوں کا معتد بہ معقول حصہ جزاحاد کی مظنونیت کے دائرے سے نکل کر یقین واذعان کی قوت کا حامل بنجاتا ہے۔ اسی طرح عموماً جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ روایت کرنے والوں نے بجائے الفاظ کے حدیثوں کے سلسلے میں زیادہ تر حاصل مطلب یعنی روایت بالمعنی کو ادائے فرض کے لئے کافی قرار دیا ہے۔ کافی ہونے میں جیساکہ بجائے خود یہ ثابت ہے روایت بالمعنی کے طریقہ پر اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ قطع نظر تفصیلات کے اور کچھ نہیں صرف ترجمہ ہی کی حقیقت اگر آدمی کے سامنے ہو تو روائت بالمعنی کی افادیت کے اعتراف پر وہ مجبور ہو جائے گا۔

آخر روایت بالمعنی کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک ہی مطلب کو اسی زبان کے دوسرے الفاظ اور تعبیروں میں راوی ادا کرے۔ جس زبان میں بات اس سے کہی گئی تھی۔ پھر ترجمہ میں تو دوسری زبان کے الفاظ میں مطلب کو ادا کرنا پڑتا ہے پس لفظوں کے ادل بدل جانے سے اگر یہ کلیہ ٹھیرالیا جائے کہ مطلب بھی ہمیشہ بدل جاتا ہے تو چاہئے کہ ترجمہ۔ اور اس ذریعہ سے علوم وفنون کی جو اشاعت دنیا میں ہوتی ہے۔ سب کو لغو اور مہمل قرار دیا جائے۔ جنون کے سوا خود سوچئے کہ یہ اور بھی کچھ ہے۔

لیکن قطع نظر اس سے حضرت شاہ صاحب نے " الاعتبار" کے جس طریقۂ عمل سے روشناس فرمایا تھا۔ اس کی روشنی میں جیساکہ شاہ صاحب نے بھی فرمایا تھا۔ حدیثوں کا بڑا ذخیرہ بجائے روایت بالمعنے کے روایت باللفظ کی مد میں داخل ہو جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے ہم پاتے ہیں کہ مثلاً دس صحابی کسی روائت کو بیان کرتے ہیں۔ ان صحابیوں کی روایت میں مشترک الفاظ کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ براہ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے

ہیں تو عقل کا تقاضا ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ عام حالات میں کسی مطلب کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے والوں کے الفاظ میں وحدت مشکل ہے۔ اعتبار کے طریقہ سے تائیدی روایتوں کو اصطلاحاً متابعات و شواہد کہتے ہیں۔ خاص خاص کتابیں اس عمل میں امداد دینے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ صحیح مسلم میں امام مسلم کے کام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے الاطراف کی کتابوں سے بھی کافی مدد اس راہ میں ملتی ہے۔

بہر حال یہ تو ایک علمی مسئلہ ہے۔ میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ جیسے حدیث کے متعلق شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں گُر کی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ ایسی باتیں جن سے تأثرات میں غیر معمولی انقلاب پیدا ہو جاتا تھا۔ یہی حال دوسرے علوم و فنون کے متعلق تھا۔ درس تو ہوتا تھا احادیث کا لیکن شاہ صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے معلومات کا جو گرانمایہ قیمتی سرمایہ ان کے اندر جمع کر دیا تھا وہ ان کے اندر سے بے ساختہ چھلکتے رہتے تھے۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ قانون اور شریعت کے متعلق جو دو مختلف قدرتی فرائض ہیں۔ یعنی واقعات و حوادث پر قانون کو منطبق کرنا۔ ایک قاضی اور جج کا سب سے اہم فریضہ یہی ہے۔ اسی طرح قانون کے محدود کلیات سے ہر نئے پیش آنیوالے حادثے کے متعلق حکم لگانا۔ یہ فرض مجلس وضع قوانین۔ اور ارباب اجتہاد کا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ قانون کے مناط کی تقسیم کرتے ہوئے تنقیح مناط تخریج مناط، تحقیق مناط کے اقسام کو بیان کر کے جو سیر حاصل بحث ان اقسام پر کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ قضا (جج) اور اجتہاد یعنی قانون سازی دونوں راہوں کی ایسی روشنی ان کی تقریر سے مہیا ہوتی ہے کہ دونوں پر چلنے والے انشاء اللہ اس کی روشنی میں

بھٹک نہیں سکتے تھے تفصیلات کے لئے ان کی مطبوعہ تقریروں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔
اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حالانکہ اپنی حنفیت پر اصرار بلیغ تھا۔ اور ائمۂ اجتہاد میں ابو حنیفہ الامام کے مقابلہ میں دوسروں کا اجتہاد ان کو بہت کم متاثر کرتا تھا مگر با ایں ہمہ یہ ان ہی کے درسی افادات کا شعوری اور کچھ غیر شعوری اثر ہے کہ اپنے دل کو اہل السنۃ والجماعت کے تمام ائمۂ اجتہاد امام مالک شافعی اور احمد رحمۃ اللہ علیہم کی عظمت سے بھی معمور پاتا ہوں۔ اور انہی کے سمجھانے سے یہ سمجھ میں آیا کہ سارے اجتہادی مسائل جن میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے۔ سب ہی حق ہیں۔ اور سب حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہیں۔

خیال آتا ہے کہ ائمۂ اجتہاد میں حق دائر ہے۔ یعنی ان میں سے لاعلی سبیل التعین کوئی ایک حق پر ہے۔ بجائے اس کے شاہ صاحب نے طلبہ کو سمجھایا کہ سب ہی کو حق پر سمجھنا چاہئے تو سرحد کے بعض خشک مزاج علماء پر یہ بات گراں گذری۔ اور مختلف قسم کے اراجیف کی اشاعت ان کی طرف سے طلبہ میں ہونے لگی۔ لیکن ان بیچاروں کو کون سمجھاتا کہ:۔ ؎[۱]

اشفق علی الراس لا تشفق علی الجبل

بظاہر تصوف اور صوفیاء کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ اس طبقہ اور ان کے علوم و معارف سے شاہ صاحب کو شائد چنداں دلچسپی نہیں ہے۔

لیکن وہی بھولے بسرے خیالات جو دماغ میں رہ گئے ہیں ان ہی میں دو باتیں

---

[۱] ایک عربی شعر کا مصرعہ ہے۔ ایک کوہی بکرا پہاڑ پر سینگ مار رہا تھا۔ اسی کو خطاب کر کے شاعر نے کہا تھا کہ اے بکرے! اپنے سر پر رحم کر پہاڑ پر شفقت کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲

میرے اندر اس طرح جاگزیں ہوگئی ہیں کہ تصوف کے نظری و عملی دونوں حصوں کے متعلق بعد کو جو کچھ بھی اس فقیر نے سوچا یا سمجھا زیادہ تر ان ہی دونوں کی روشنی میں سوچا اور سمجھا۔ حادث یعنی کائنات و مخلوقات کا قدیم یعنی خالق تعالیٰ جل مجدہ سے کیا تعلق ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں "ربط الحدیث بالقدیم" کا عنوان قائم کرکے اس سلسلہ میں، جو کچھ فرماتے تھے۔ یہی تصوف کے نظری حصہ کا بنیادی و اساسی مسئلہ تھا۔ پہلی دفعہ شاہ صاحب نے اس مغالطہ کا ازالہ فرمایا کہ عوام الناس خالق و مخلوق کے تعلقات کو صانع و مصنوع یا معمار و مکان کی مثال سے سمجھنا چاہتے ہیں حالانکہ مصنوع اپنے باقی رہنے میں چونکہ صانع کا محتاج نہیں رہتا۔ یعنی مکان کو مثلاً بن جانیکے بعد معمار کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ عوام کی سمجھ میں صحیح طور پر اسی لئے یہ نہیں آتا کہ پیدائش میں تو عالم خدا کا محتاج ہے۔ لیکن پیدا ہو جانے کے بعد عالم کو اپنی بقاء میں خدا کی کیا ضرورت ہے؟ صوفیہ اسی وسوسہ کا ازالہ اپنے اس نظریہ سے کرتے ہیں جو "وحدت الوجود" وغیرہ ناموں سے مشہور ہے۔ اور نہ جاننے والوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ صوفی وحدت الوجود کے جو قائل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان وحدت الموجود پر ہے۔ یعنی سارے موجودات ایک ہیں۔ حالانکہ "الوجود" کی وحدت کو "الموجود" کی وحدت سے کیا تعلق۔

خاکسار نے اپنی کتاب "الدین القیم" میں اسی "وحدت الوجود" کے مسئلہ کی جو تشریح و تفصیل کی ہے سچی بات یہ ہے کہ بنیادی امور اس کے شاہ صاحب کی تقریر یہی سے ماخوذ ہیں۔

اسی طرح مشہور حدیث جبرئیل جس میں ہے کہ ایمان و اسلام اور احسان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسافر کے بھیس میں جبرئیل علیہ السلام نے سوالات کئے تھے اسی حدیث میں "الاحسان" کے لفظ کا ترجمہ ہی شاہ صاحب نے ایسا کیا کہ تصوف کے عملی حصہ کی اصل خصوصیت سامنے آگئی فرمایا تھا کہ احسان کا صلہ جب الیٰ کے ساتھ

آتا ہے تو کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ اس کا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن صلہ کے بغیر صرف احسان کا ترجمہ "حسن پیدا کردن" کرنا چاہیئے۔ یہی یا قریب قریب اسی کے فارسی زبان میں احسان کا ترجمہ کرکے فرمایا کرتے تھے کہ عقائد و اعمال۔ اور زندگی کے ان تمام شعبوں میں جو مذہب کے دائرے میں داخل ہیں۔ ان کو بار ٹھیراتے ہوئے سر سے ٹالنا، ایک حال تو یہ ہوتا ہے لیکن ان میں "حسن آفرینی" کی کوشش بس یہی احسان ہے۔ اور تصوف کا مطلب یہی ہے کہ بجائے تکلیف کے دین ہی زندگی کا اقتضاء بن جائے۔ اور یوں دین کے ہر شعبہ میں حسن کے اندر حسن کا اور جمال میں جمال کا اضافہ کرتے چلا جانا چاہیئے۔ یہی الاحسان کے مقام کا اقتضا ہے۔ خیال آتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں "المحسنین" کا لفظ آیا ہے۔ اس کا صحیح مصداق شاہ صاحب کے نزدیک مسلمانوں کا وہی طبقہ ہے جو دینی مطالبات کی تعمیل میں اپنے پیش نظر احسانی نقطہ نگاہ کو رکھتا ہے۔[1]

ان کی تقریروں کو سنے ہوئے عرض کر چکا ہوں کہ چالیس سال کے قریب زمانہ گذر چکا ہے۔ ٹوٹا پھوٹا تحریری نوٹ جو میرے پاس تھا مدت ہوئی وہ بھی غائب ہو چکا ہے لیکن تصوف کے عملی حصہ کے متعلق زمانہ کی اس طویل مدت میں جو کچھ فقیر نے بعد کو پڑھا یا سمجھا یا لکھا زیادہ تر جوہری اثر سب میں شاہ صاحب کی

---

[1] بخاری وغیرہ کی مشہور حدیث ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیئ (الحدیث) سے بھی شاہ صاحب کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ پس جبرئیل امین سے جواب میں یہ جو فرمایا گیا یعنی خدا ہمیں دیکھ رہا ہے اس عام بین الادیانی غیر مشتبہ یقین کی روشنی میں چاہیئے کہ عبادت کرتے ہوئے اپنے معبود خالق کائنات کے ساتھ ایسا ربط پیدا کیا جائے کہ عبادت کرنے والا گویا اس کو دیکھ رہا ہے ساری کائنات اس کے لئے آیات اللہ اور خدا کی نشانی بن جائے۔ گویا الاحسان کے سمجھانے کی ایک مثال تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک کے جواب کو خیال کرنا چاہیئے

اسی تقریر کا تھا۔ اگرچہ افسوس کے ساتھ اس کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ پڑھنے سمجھنے سمجھانے اور لکھنے لکھانے ہی کی حد تک میرا کام محدود رہا۔ اور کرنے کی توفیق میسر نہ آئی لے دے کر اپنا سرمایۂ نازو احساس صرف وہی ہے کہ:۔

احب الصالحین ولست منھم — لعل اللہ یرزقنی صلاحًا

لیکن آہ! کہ۔ مرا لعل اب لیت کے حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ جس چیز کو عمر بھر اچھا سمجھتا رہا اسی کو اپنی عملی زندگی میں داخل کرنے سے کیوں قاصر رہا۔ قسمت کی تہی دستی کے سوا اس کی اور کیا توجیہ کی جائے۔

شاہ صاحب کی بعض باتیں عجیب و غریب تھیں۔ بظاہر ان کے مطالعہ کا موضوع دینیات ہی کی کتابیں تھیں۔ لیکن جب عقلی مسائل پر اتفاقاً کچھ فرمانے کا موقعہ آجاتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نادان بچوں سے زیادہ ان کے سامنے بڑے سے بڑے فلاسفر کی وقعت نہیں ہے۔ ایمان بسیط ہے یا مرکب' یعنی عمل بھی ایمان کا جزء ہے یا نہیں۔ علم کلام کا مشہور خلافیہ ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے کہ مناطقہ (منطقی کے لفظ کی جمع عموماً معقولیوں کے متعلق اسی لفظ کو استعمال کرنے کے عادی تھے۔ اور اسی کیسا تھ علیہم ما علیہم[1] کے توبیخی الفاظ بھی اس موقع پر ان کی زبان مبارک سے خلاف دستور نکل جاتے) بہرحال فرماتے کہ ان مناطقہ کی طرف سے ان لوگوں پر جو ایمان کی حقیقت میں سارے دینی اعمال کو شریک سمجھتے ہیں۔ ان پر اعتراض کرتے ہوئے جو یہ کہا جاتا ہے کہ جزء کے ارتفاع سے قاعدہ ہے کہ کل بھی مرتفع ہو جاتا ہے۔ یعنی کسی کل کا کوئی جزء اگر غائب ہو جائے تو منطقی نقطہ نظر سے کل کل باقی نہ رہا۔ اور اسی بنیاد پر ایمان کو

---

[1] کبر و نخوت کے بیجا جذبات معقولیوں میں جو ابھر آتے ہیں یہ ان ہی کا ردِ عمل تھا ۱۲

مرکب حقیقت قرار دینے والوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کی زندگی میں کوئی اسلامی عمل اگر نہ پایا جائے تو مطلب اس کا یہ ہوا کہ ایمان ہی کا اس سے ازالہ ہوگیا اور وہ مومن باقی نہ رہا۔ حالانکہ ایمان کو مرکب قرار دینے والے بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ایمان مرکب ہے۔ یا بسیط دلچسپ بات اس موقعہ پر شاہ صاحب جو فرمایا کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ذرا ان منطقیوں کی حماقت ملاحظہ کیجئے۔ درخت ایک مرکب حقیقت ہے۔ جڑ۔ تنہ۔ شاخیں۔ برگ و بار سب ہی اس کے اجزاء ہیں۔ فرض کیجئے کہ کوئی ہلکا سا پتہ درخت کا گر گیا۔ تو منطقی کہدے گا کہ درخت باقی نہ رہا اس لئے کہ جزء کا ارتفاع کل کے ارتفاع کو مستلزم ہے۔ لیکن منطقیوں کے سوا کوئی انسان جبتک پاگل نہ ہوجائے اس کا قائل ہوسکتا ہے کہ کسی ایک پتے کے جھڑ جانے سے درخت ہی ناپید ہوگیا۔ کل اور اجزاء کے صحیح تعلق کو بتاتے ہوئے فرماتے کہ دراصل ہر کل میں دو قسم کے اجزاء ہوتے ہیں۔ بعض اجزاء کے نکل جانے سے تو کل یقیناً غائب ہوجاتا ہے۔ مثلاً گردن آدمی کی کٹ جائے، سر اُڑ جائے دل نکل جائے۔ ان کے مقابلہ میں کل ہی کے بعض اجزاء ایسے بھی ہوتے ہیں جو جزء ہونے کے باوجود کل سے اگر غائب ہوجائیں تو کل باقی رہتا ہے۔ جیسے آدمی کا بال گر جائے انگلی کٹ جائے تو کیا کسی بال کے گر جانے سے زید اس لئے زندہ باقی نہ رہا کہ زید کے کل کا بال بھی ایک جزء تھا۔ یا کسی قلعہ کی دیوار کی کوئی اینٹ نکل جائے تو سمجھنا چاہئے کہ قلعہ ہی غائب ہوگیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ کثرتوں کو واحد تعبیر کے قالب میں لاکر کلّی بنا لینا، مناطقہ اسی کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت سے اپنے آپ کو اندھا بنانے کی یہ بدترین شکل ہوسکتی ہے۔

فرماتے کہ میرے نزدیک اعقل الناس فی الناس اہل لغت یا زبانوں کے بنانے

والے ہیں جو کائنات کے ایک ایک ذرہ کی خصوصیت پر نظر جما کر الگ الگ الفاظ بناتے ہیں زبان اور لغت والوں کے بعد فقہار کی تعریف کرتے اور ان کے عقلی رسوخ کی داد دیتے کہ مشتبہ مسائل کے مختلف پہلوؤں کو متعین کر کے ہر ایک پہلو کے متعلقہ احکام کا سراغ لگانا چاہتے ہیں۔

الغرض ہر چیز کے امتیازی اوصاف کا جاننا ان کے نزدیک کمال تھا۔ اور امتیازی اوصاف سے قطع نظر کر کے کلی کی لاٹھی جزوں پر چلانا اندھے کی لاٹھی کے سوا ان کے نزدیک اور کچھ نہ تھی۔

بہرحال خاکسار کو دوسرے علمار اور شاہ صاحب میں جو کھلا ہوا فرق محسوس ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ عموماً لوگوں میں استعدادی علم پایا جاتا ہے۔ یعنی اس پر قناعت کر لیا جاتا ہے کہ جب اپنے متعلقہ علوم کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو مسائل کے مالہا و ما علیہا سے واقف ہو جائیں گے۔ لیکن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو عموماً ہر اس علم سے حضوری تعلق تھا جس سے وہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اور ان علوم کے کلیات و جزئیات کا کافی ذخیرہ فعلیت کے رنگ میں ان کے حافظے کے محافظ خانے میں اس طرح محفوظ رہتا تھا کہ جس مسئلہ کو چاہتے آسانی کے ساتھ اپنے حس مشترک کے سامنے لے آتے۔ طلبہ اسی لئے ان کے دماغ کو کتابوں کی الماری سے تشبیہ دیتے تھے۔ فقیر بجائے الماری کے اسے ایک مستقل کتب خانہ ہی خیال کرتا تھا۔

بہرحال وہ اپنے عہد کے طلبہ کی علمی بے بضاعتیوں کا اندازہ کر کے تکلیف اٹھا کر علاوہ موضوع درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے مثلاً جن مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے ان کی ولادت و وفات کے سنین کے ساتھ ساتھ مختصر حالات۔ اور ان کی علمی خصوصیت، علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے۔ یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا جس کی بدولت شوقین اور

محنتی طلبہ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر علم کے ذیلی ساز و سامان سے مسلح ہو جاتے تھے۔ یا کم از کم مسلح بننے کا ڈھنگ ان کو آجاتا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ہر غریب مدرس اور استاد کے بس کی یہ بات ہے بھی نہیں کہ مطالعہ کئے بغیر جس بڑے عالم کا ذکر آجائے ان کے متعلق مذکورہ بالا تفصیلات سے طلبہ کو آگاہ کرنے پر قادر ہو۔ یہ تو ان کے خصوصی حافظہ کا کمال تھا۔

ایک دلچسپ تجربہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق میرا یہ بھی تھا کہ اشخاص و رجال جن کا وہ تذکرہ حلقۂ درس میں فرمایا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر ایسی ہستیاں تھیں، جو اب دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ زندہ علماء کا ذکر مشکل ہی سے ان کے درس میں ہوتا۔ اور زندہ کیا سچ پوچھئے تو حافظ ابن حجر نویں صدی ہجری کے عالم و محدث کے بعد والوں کے نام بھی ان کی زبان مبارک پر اتفاقاً ہی کبھی آتے ہوں۔ ان کے حلقۂ درس میں پہونچ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ درمیان کی چند صدیاں گویا حذف ہو گئی ہیں۔ اور ہم نویں، آٹھویں اور ان سے پہلے کی صدیوں میں گویا زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پچھلوں کا نہ وہ نام ہی عموماً لیتے تھے۔ اور ان کے کام ہی کا مدعاً یا قدحاً ذکر کرتے۔ انکا معاملہ بس ان ہی گذرے ہوئے اگلے بزرگوں تک محدود رہتا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ اپنے معاصر اور ہم چشم علماء کے متعلق ان کے تاثرات کا دریافت کرنا مشکل تھا۔ اور میرا تو خیال کچھ ایسا ہے کہ کسی قسم کا تاثر اس باب میں وہ رکھتے ہی نہ تھے۔ اس ذریعہ سے حق تعالیٰ نے علماء کے ایک بڑے مہلک اخلاقی رذیل سے ان کو محفوظ فرما دیا تھا۔

اس سلسلہ میں معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ علماء کی علمی اور فنی تنقید کی طرف ان کے جذبہ کا رخ پھیر دیا گیا تھا۔ ان کی علمی چشمک اگر کچھ تھی بھی تو ان ہی وفات یافتہ

بزرگوں سے تھی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک طرف ان کی غیر معمولی عقیدت کا حال یہ تھا کہ جبل العلم حافظ الدنیا کے الفاظ سے ان کی مراد حافظ ہی ہوتی۔ لیکن شافعی ہونے کی وجہ سے اختلافی مسائل میں حنفی مذہب کے متعلق جہاں شاہ صاحب کو محسوس ہوتا کہ جان بوجھ کر حافظ سرد مہری اور لاپروائی سے کام لے رہے ہیں تو اس وقت مسکراتے ہوئے فرماتے حافظ الدنیا نے اس موقع پر کفِ لسانی سے کام لیا ہے۔ کبھی کبھی ان کے طرزِ عمل کو طوطے کی چال سے تشبیہ دیتے۔ جو آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے نکل جاتا ہے۔ اختلافی حدیثوں کے باب میں اصح ما فی الباب کا ترجیحی طریقہ شوافع میں عموماً جو مروج ہے۔ جب ان کے اس اصول کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ لیجئے علماء شافعیہ نے پیچھے ٹٹولنے کا کام شروع کر دیا[1]۔ عموماً وہ اس کا بھی موقعہ تلاش کیا کرتے کہ علاوہ حدیث کے ابتدائی علوم کے طلبہ و علماء کے لئے دوسرے متعلقہ علوم و فنون کے جن اصول و کلیات کا جاننا ضروری ہے۔ ان کا بادنی مناسبت ذکر فرماتے اور مسئلہ کی ایسی تاریخ بیان کرتے جس کے سننے کے بعد معلوم ہو جاتا تھا کہ اس مسئلہ کی ابتداء کس شکل میں ہوئی۔ اور کن کن نقاط نظر سے گذرتے ہوئے اپنے موجودہ حال تک

---

[1] مطلب یہ تھا کہ اسماء الرجال کی کتابوں کو اٹھا کر راوی پر جرح کر کے مخالف کی حدیث کو ناقابل لحاظ بنا دینا۔ اور صرف رجالی رجسٹروں کی مدد سے کسی روایت کو ترجیح دینا، لیکن آثار صحابہ قرآنی آیات کے اقتضاء اور اسلام کے کلی قوانین و اصول سے چشم پوشی کر لینا، حضرت شاہ صاحب شافعیوں کے اس طرزِ عمل کو روایتوں کی ترجیح میں پسند نہیں فرماتے۔ اور جرح کرنے کیلئے رجالی رجسٹروں میں راوی کی کمزوریوں کو ٹٹولنا اسی کا نام انھوں نے پیچھا ٹٹولنا رکھ لیا تھا فرماتے کہ یہ تو قصابوں کا کام ہوا جو جانور کمزور معلوم ہوا اسی کو ٹٹول کر ذبح کر دیا

پہونچا ہے۔ یاد آتا ہے ایک دفعہ مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو کسی زمانہ میں علی گڈھ کالج کی روح رواں جزوکل یا کم از کم غیر معمولی مؤثرہ عنصر تھے۔ پچھلے دنوں جب علی گڈھ اور دیوبند کے درمیانی خلیج کی وسعت کم ہو رہی تھی[1]۔ تو صاحبزادہ مرحوم کبھی کبھی دیوبند تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ صحیح مسلم کے درس میں آکر وہ بھی شریک ہوئے، واپس ہو کر میں نے خود ان سے سنا کہتے تھے کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے لکچر ہال کا منظر مرے سامنے آگیا تھا۔ یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جیسے پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا ہے۔ آج ہندوستان میں مری آنکھوں نے اسی تماشے کو دیکھا۔

یادداشت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ معلومات کا طوفان شاہ صاحب کے اندر تلاطم پذیر رہتا تھا۔ خیال آتا ہے کہ کسی مسئلہ پر تقریر فرماتے ہوئے اسی کی مناسبت سے ان کا ذہن کسی دوسرے مسئلہ کی طرف منتقل ہوتا۔ تو عموماً فرماتے

---

[1] ۱۳۲۸ھ میں دستار بندی کا مشہور تاریخی حفلہ کبیرہ دار العلوم دیوبند کے احاطہ میں جب خاص شان آن بان سے منعقد ہوا تھا تو پہلی دفعہ علیگڈھ کالج کے نمائندے بنکر صاحبزادہ مرحوم اس تقریب میں شریک ہونے کیلئے دیوبند پہونچے تھے۔ انگریزی خوان طبقہ کی طرف سے علماء دیوبند کی طرف رجحان کا اظہار گویا پہلی دفعہ عملی شکل میں ہوا تھا۔ علی گڈھ کی گرم پارٹی پر صاحبزادے صاحب مرحوم کا یہ اقدام کافی گراں ثابت ہوا تھا۔ اٹاوہ کے اخبار "البشیر" کے ایڈیٹر مولوی بشیر نے تو علانیہ صاحبزادے صاحب پر لعنت وملامت کی تھی۔ لکھا تھا کہ اس قسم کی تلو تپو باتوں سے کچھ فائدہ نہیں۔ ان مولویوں سے مصالحت کی امید فضول ہے۔ لیکن تاریخ کے اوراق سیاست کی آندھی میں اچانک الٹ پلٹ گئے۔ اور جس کا تصور بھی ناممکن تھا۔ وہی سب دیکھا گیا۔ اور دیکھا جا رہا ہے ۱۲۔

دفاع ہو گیا مجھے اس مسئلہ کی طرف، ان دفاعی مسائل میں صرف و نحو، معانی، بیان، بدیع وغیرہ فنون تک کے مسائل شریک تھے۔

عربیت سے تعلق رکھنے والے ان علوم سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ان علوم کی اعلیٰ بنیادی کتابوں کا غیر معمولی فکر و نظر کے ساتھ انھوں نے مطالعہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کافیہ اور شرح جامی کے ساتھ مدارس کے عام مولویوں کا جو تعلق ہوتا ہے۔ یہی تعلق شاہ صاحب کو سیبویہ کی الکتاب سے تھا۔ ابن عصفور جس کے نوٹ اور کچھ حواشی سیبویہ کی کتاب پر ہیں۔ اس نام کو پہلی دفعہ ہی خاکسار نے شاہ صاحب ہی سے سُنا تھا۔ اور کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بعد پھر کسی مولوی کی زبان سے یہ لفظ سننے میں نہ آیا۔ دوسروں کی کیا کہوں، سیبویہ کی اس الکتاب کے مطبوعہ نسخہ پر میری نظر تو ضروری پڑی ہے۔ شاید اِدھر اُدھر سے کچھ اس کو دیکھا اور پڑھا بھی ہوگا۔ لیکن ابن عصفور کے حاشیہ کے دیکھنے کا بھی شرف حاصل نہ ہوا، معانی و بیان۔ بدیع کے مسائل میں الجرجانی کی دلائل الاعجاز۔ اسرار البلاغت یا زمخشری کی مفصل کے سوا تفتازانی وغیرہ مصنفوں کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے شاہ صاحب کو فقیر نے کبھی نہیں دیکھا۔ اصول فقہ میں وہ ابن ہمام کی تحریر کے گویا حافظ تھے۔ فقہ میں ابو بکر کاشانی صاحب بدائع شمس الائمہ سرخسی اور ابن نجیم صاحب بحر الرائق سے ان کو بہت متاثر پاتا تھا۔ شامی کے تفقہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ چنداں بھروسہ نہیں فرماتے صاحب ہدایہ کے بڑے مداح تھے۔ عموماً فرماتے کہ ابن ہمام کی فتح القدیر کی جیسی کتاب کے لکھنے کا ارادہ چاہوں تو کر سکتا ہوں۔ لیکن ہدایہ جیسی کتاب لکھنے سے اپنے آپ کو قطعاً عاجز پاتا ہوں

ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ عربی زبان کے کسی مشکل لفظ کی تشریح کرتے ہوئے

یا کسی اور ضرورت سے عربی شعر کو پیش کرنا چاہتے تو گو شہادت کے لئے ایک مصرعہ یا ایک شعر ہی کافی ہوتا۔ لیکن یادداشت کی بے پناہ قوت کا نتیجہ تھا کہ ایک مصرعہ کیلئے بیس بیس پچیس پچیس بلکہ اس سے بھی زیادہ اشعار والی نظموں کو مسلسل سناتے چلے جاتے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہم طالب العلموں کی حیثیت ٹھیک ان بھینسوں کی ہوجاتی تھی۔ جن کے سامنے بجانے والا بین باجہ بجا رہا ہو۔ اور غریب بھینسیں ٹک ٹک اس کو دیکھ رہی ہوں۔ دوسروں کے متعلق تو مجھے کہنے کا حق نہیں۔ لیکن فقیر کی حیثیت تو اس وقت اخفش کے بزہی کی ہوجاتی تھی۔ اپنی یافت اور سمجھ کے مطابق جیسا کہ عرض کرچکا ہوں، شاہ صاحب کی تقریروں کو میں مسلسل نوٹ کرتا چلا جاتا تھا۔ لیکن جب انشاد شعر گوئی کا یہ جذبہ شاہ صاحب پر طاری ہوتا تو میرے قلم اور انگلیوں کو آرام کرنے کا قدرتی موقعہ مل جاتا۔

اسی لئے میری مرتبہ تقریر تقریباً شاہ صاحب کے ان سنائے ہوئے اشعار سے خالی تھی۔ شائد چند ضروری مصرعے یا اشعار مشکل ہی سے اس سلسلہ میں قلم بند ہوئے ہوں مرا اندازہ تھا کہ مجموعی طور پر نصف لاکھ یعنی چالیس پچاس ہزار سے کم تعداد ان عربی اشعار کی نہ ہوگی جو شاہ صاحب کو زبانی یاد تھے جنھیں جس وقت جی چاہتا وہ سنا سکتے تھے۔

فارسی ادب کا مذاق بھی کافی رکھتے تھے۔ کبھی کبھی درسی تقریروں میں فارسی کے موزوں اشعار کو ترنم کے خاص لہجہ میں استعمال فرماتے۔ ؎

مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند   کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں[۵]

---

[۵] تقدیر و تدبیر کے فرق کو بتلاتے ہوئے عموماً اس شعر کو ضرور دُہراتے۔ فرماتے تھے کہ خلیفہ بنانے کا فیصلہ تو بڑے صاحب نے پہلے ہی کرلیا تھا۔ لیکن فیصلہ کا ظہور اس شکل میں ہوا کہ آدم سے غلطی صادر ہوئی اور نور میں پڑجانے کا حکم دیا گیا۔ کہتے کہ خلافت کا فیصلہ یہی تقدیر کی مثال ہے اور جس شکل میں اس فیصلہ کا ظہور ہوا اسی کو تدبیر کہتے ہیں ۱۲

جب توحیدی کیفیت کا غلبہ ہوتا تو مسکراتے ہوئے حافظ کے اس مشہور شعر سے

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　　ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

کو خاص مستانہ انداز میں سناتے۔ فرماتے کہ جی ہاں! یہ سب بڑے میاں کی کارروائی ہے۔
اس وقت ایک خاص قسم کی سرمستی ان کے جبینِ مبارک سے اسارِیرہ میں چمکنے لگتی۔ عموماً یہی
وقت ہوتا جب بٹوا کھولتے۔ چھالیا اور زردہ نکال کر پان کے ساتھ استعمال فرماتے۔
اپنے باطنی حال کے اخفاء میں ان کی کوشش حد سے گذری ہوئی تھی۔ کھلنے کا
موقع اتفاقاً کہیں آجاتا تو اسی وقت ظرافت اور طیبت کا لہجہ اختیار فرما لیتے۔ بظاہر
عام مجلسوں اور صحبتوں میں ان پر سکینت و وقار کی خاموشی طاری رہتی۔ لیکن حلقۂ درس
میں طیبت و مزاح کا جبلّی رجحان ان کا نمایاں ہوجاتا اس وقت ان کی زبان مبارک
پر معصومانہ انداز میں بڑے پُرکیف فقرے جاری ہوتے۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کرتے کہ جی
ہاں! ظرافت کی یہ مد وہاں بھی کافی وسیع ہے۔ بڑے صاحب کے یاں بھی اس کا تماشا
پیش ہوگا۔ پھر مثلاً ان حدیثوں کا ذکر فرماتے جن میں آیا ہے کہ قیامت کے دن بعض گنہگاروں
کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا کہ ان ہی سے ان کے گناہوں کا اعتراف کرا کے حق سبحانہٗ
وتعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ ہر وہ گناہ جس کا اس نے اقرار کیا ہے اس کے مقابلہ میں اسے
نیکی کا اجر دیا جائے۔ اقرار کرنے والا گنہگار اس حکم کو سنکر فرشتوں سے کہے گا کہ ٹھہرو!
میرے گناہوں کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ جب ہر گناہ کے بدلہ میں نیکی کا اجر مجھے دیا
جائے گا تو ان گناہوں کو بھی گن لو۔ او کما قال۔
صحیح مسلم ہی کی مشہور حدیث جس میں جنت کے داخل ہونے والے سب سے کمتر درجہ

کے آدمی کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جہنم سے نکلنے کے بعد اپنے سامنے ایک درخت کو پائے گا۔ عرض کرے گا کہ اے اللہ اس درخت کی چھاؤں کے نیچے پناہ لینے کی اجازت دی جائے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ اس سے اقرار لیں گے کہ اس سے زیادہ تو اپنے مطالبہ کو تو آگے نہ بڑھائے گا، قسم کھا کر اقرار کرے گا کہ بس اس سے زیادہ میں کبھی اور کچھ نہ چاہوں گا۔ اجازت دیدی جائے گی یوں ہی ایک درخت کے بعد اس سے زیادہ گھنا اور بہتر درخت اس کے سامنے آئے گا۔ اور اپنے معاہدہ کو توڑ کر اس سے نیچے جانے کی اجازت چاہے گا۔ تا آنکہ بالآخر سرکتے ہوئے وہ جنت کے دروازے پر پہونچ کر جنت میں داخل ہو جانے کی اجازت چاہے گا۔ اس وقت حق سبحانہ وتعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ:۔

مایصرفنی منک — تجھ سے میرا پیچھا آخر کون چیز چھڑائے گی۔

ایک فرمائش کے بعد اس سے زیادہ بہتر فرمائشیں کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ارشاد ہوگا کہ:۔

"کیا اس پر تو راضی ہو جائے گا کہ تجھے ساری دنیا اور اس دنیا کے مانند دوسری دنیا دیدی جائے۔"

تب وہ غریب گنہگار عرض کرے گا کہ:۔

یارب اتستھزء منی وانت رب العٰلمین — آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں، حالانکہ آپ سارے جہانوں کے مالک ہیں۔

حدیث کے راوی صحابی ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب اس روایت کو بیان کرتے تو ہنسنے لگتے۔ اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یوں ہی اس

حدیث کو بیان کرتے ہوئے ہنستے تھے۔ جب آپ سے ہنسنے کی وجہ پوچھی گئی۔ تو فرمایا تھا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے یہ سن کر کہ سارے جہانوں کے مالک ہو کر مجھ غریب سے مذاق کرتے ہیں"

گنہگار کے اس فقرے پر خود اللہ تعالیٰ کو ہنسی آجائے گی۔

اور اس کے بعد اس غریب بندے سے ارحم الراحمین فرمائیں گے کہ:۔

"میرے بندے میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا۔ لیکن جو میرے جی میں آتا ہے وہ کرتا ہوں"

اس حدیث پر پہونچنے کے بعد شاہ صاحب کے جذبات چھپانے کے باوجود چھلک کر باہر آجاتے تھے۔ اور اس قسم کی عام حدیثوں کو "مذظرافت" میں شریک فرما کر آگے بڑھ جاتے۔

اسی سلسلہ میں کبھی کبھی ان پر خاص جذبہ طاری ہوتا طلبہ کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے تم سمجھتے ہو کہ میں کوئی بڑا کام کر رہا ہوں۔ حالانکہ جانتے ہو، میری حیثیت بھی وہی ہے۔ جو مدرسہ کے منیر[۱] خاں کی ہے۔ منیر خاں بھی چکی پیستے ہیں۔ اور میں دق ہوں۔ دقیق (آٹا) پیستا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اسی موقعہ پر خیال آتا ہے بسا اوقات ان کی زبان مبارک سے فقیران الفاظ کو سنا کرتا تھا۔ فرماتے کہ:۔

---

[۱] مدرسہ کے ایک بوڑھے ان پڑھ ملازم منیر خاں تھے۔ اور مسجد کے احاطہ کی طرف دروازے کے پاس ایک جھونپڑے میں مقیم تھے۔ عموماً مدرسہ کے تعمیری کاموں کے لئے چکی میں چونا پیسا کرتے تھے۔ معلوم نہیں کہ ان کا انتقال کب ہوا۔ شاہ صاحب کے درس میں اُن کا اکثر تذکرہ اسی سلسلہ میں آتا رہتا تھا۔

"مجھے کچھ نہیں چاہئے، صرف دو پیالیاں کشمیری چائے کی[۵۱]، دو بسکٹ، ایک نیزا ایک گھوڑا۔"

بظاہر مطلب حضرت والا کا یہ ہوتا کہ اصلی اور صحیح زندگی ایک مومن مسلم کی یہ ہے کہ "میدانِ جہاد" میں اپنا وقت صرف کرے۔ ان کے دل کی یہی حسرت حقیقی حسرت تھی۔ اس کے مقابلہ میں درس و تدریس تعلیم و تعلم کے جذبات کی ان کی نظروں میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ لیکن جیسے اللہ اور اس کے رسول (علیہ السلام[۵۲]) کیساتھ

---

[۵۱] مشروبات میں یہی ایک مرغوب مشروب انکا تھا، نودرے کی چھت کے جنوبی سمت میں ٹھیک شمالی سمت کے اس کمرے کے مقابلہ میں جس میں شاہ صاحب اور حضرت شیخ الہند درس حدیث سنتے تھے۔ ایک کمرہ تھا کافی وسیع و عریض و طویل مرے زمانہ میں شاہ صاحب کی قیامگاہ یہی کمرہ تھا۔ اسکے ایک گوشہ میں لمحہ بہ لمحہ چولہے پر کشمیری چائے کی دیگچی چڑھی رہتی تھی۔ دودھ ملجانیکی وجہ سے اس کا رنگ گلابی ہو جاتا تھا۔ جب کبھی حاضر ہوتا اس دیگچی کو گرم ہی پاتا۔ اس ساغرِ کرم سے استفادہ کا موقع کبھی کبھی اس فقیر کو بھی میسر آجاتا تھا۔ منیجر اس چارخانے کے مولانا ادریس تھے۔ شاہ صاحب کی مخلصانہ خدمت کی سعادت مدتوں مولانا کو میسر آئی۔ فهنيئاله ثم هنيئاله ۱۲

[۵۲] خاکسار کو شاہ صاحبؒ کے حلقۂ درس میں شرکت کی سعادت جن دنوں حاصل ہوئی تھی اسوقت تک زدواجی تعلق سے آزاد تھے۔ عمر بھی انکی اس زمانہ میں بمشکل چالیس اور پچاس کے درمیان ہوگی۔ اس زمانہ میں ستر حال کی غیر معمولی کوششوں کا انکے یہی رنگ تھا۔ لیکن پچھلے دنوں جب خاکسار حیدرآباد سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں شریک ہونے کیلئے آیا کرتا تھا تو اچانک دیکھا کہ شاہ صاحبؒ کے سیاہ بال سفید ہو چکے ہیں۔ ایکدفعہ خیال آتا ہے۔ دورہ ختم ہو چکا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد طلبہ کو وداعی خطاب سے سرفراز کرنے کیلئے کھڑے ہوئے تو اب انکا رنگ ہی دوسرا تھا۔ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنیکی قوت کھو چکے تھے۔ ذکر مبارک آتا تو آواز بھرا جاتی اور خواص حاضرین طلبہ سے کہتے کہ جاؤ! انجام کار دین کی خدمت کو زندگی کا نصب العین بنالینا ۱۲

اپنے صحیح تعلقات کو کوشش کر کے چھپانے کے عادی تھے۔ اسی طرح وہ اپنی دل کی اس آرزو کے متعلق بجائے لمبی چوڑی تقریروں کے، صرف مزاحی کنایوں اور اشاروں میں کبھی کبھی فرما کر۔

باہم نگرستیم گرستیم و گذشتیم

کے نفسیاتی اثر کے ساتھ گذر جاتے۔

دورہ اختتام کی حد پر جب پہونچتا تو اس وقت اپنے خاص انداز میں فرماتے کہ اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ میں مرغوں کا ڈربہ کھول دوں گا۔ یہ مرغے جو ہمارے اردگرد جمع ہیں ڈربے سے نکلیں گے۔ دیکھتا ہوں کہ بلندیوں پر چڑھ چڑھ کر بازوں کو پھڑپھڑاتے ہوئے کون بانگ دیتا ہے۔ کسی کی آواز کتنی اونچی ہوتی ہے۔ اس قسم کے لطیفوں میں وہ سب کچھ کہدیا کرتے تھے جو کہنا چاہتے تھے۔

نور اللہ ضریحہ وطاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ اللھم اغفرلہ وارحمہ کما ربانی صغیراً۔

حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ درس کی ایک خصوصیت کا خیال ہی نہ آیا۔ حالانکہ درسِ انوری کا یہی لازمی جز تھا شدت ظہور کہتے ہیں کہ کبھی خفا کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے سب سے زیادہ یاد رہنا چاہیئے تھا وہی یاد نہ آیا خیر قصہ یہ ہے مجھ سے پہلے، اور میرے بعد والوں کا مشاہدہ اس باب میں کیا ہے۔ لیکن میں نے تو یہی دیکھا تھا کہ صحیح مسلم کا درس ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ روزانہ ہوا کرتا تھا۔ اور پورا وقت علمی مباحث و مسائل ہی کی شرح و تفسیر تطبیق و ترجیح میں صرف ہوتا تھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ اپنی اور طلبہ کی طبیعت کے ملال۔ اور تکان کا خیال کر کے یہ طرزِ عمل شاہ صاحب نے

اختیار کر رکھا تھا۔ یا فطرت میں ان کی ظرافت و مزاح کا جو فطری جذبہ پوشیدہ تھا یہ اس کا اقتضا رتھا۔ کچھ بھی ہو، درس کے پہلے ہی دن سے دیکھنا شروع کیا کہ ہمارے ایک رفیقِ درس جن کا اسمِ گرامی غالباً مولوی محمد عیسیٰ تھا۔ شاید گھمرہ نامی قصبہ کے رہنے والے تھے۔ بیچارے بڑے متین اور سنجیدہ اور نیک آدمی معلوم ہوتے تھے۔ شدتِ نیکی کی وجہ سے تعلق ان کا علم کے ساتھ بھی کچھ نیک ہی نیک سا تھا۔ شاہ صاحب کے متصل دستِ چپ کی طرف شروع ہی سے اپنی جگہ انھوں نے بنالی تھی۔ وقت پر ٹھیک اپنی اسی مقررہ جگہ پر آکر بیٹھ جاتے۔ شاید کسی دوسرے طالب العلم کی ہمت بھی نہ ہوتی تھی کہ ان کی جگہ پر قبضہ کرے۔ ہوتا یہ تھا کہ کسی بلند و بالا مسئلہ پر شاہ صاحب کے معلومات کا بحرِ ذخار موجیں مارتا ہوا اچلا جا رہا ہے۔ حافظ الدنیا، اور شیخ ابن ہمام شمس الائمہ سرخسی ابن نجیم کا ذکر ہو رہا ہے کہ اچانک شاہ صاحب مولوی محمد عیسیٰ کی طرف تبسمانہ لہجہ میں مخاطب ہو جاتے اور ان کی طرف خطاب کر کے کچھ فرماتے رہتے۔ صحیح الفاظ تو اس وقت یاد نہ رہے اور الفاظ کی نوعیت ایک رہتی کب تھی تاہم حاصل یہی ہوتا تھا کہ جو کچھ بیان کیا گیا گویا مولوی محمد عیسیٰ صاحب سے اس کی تصدیق چاہی جا رہی ہے۔ بیچارے مولوی عیسیٰ صاحب خاموش مسکرانے لگتے۔ سارا حلقہ اس وقت صرف مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تبسم ہی تبسم بن جاتا تھا۔ "ہاں! مولوی عیسیٰ صاحب تو اب آپ کی رائے اس مسئلہ میں کیا ہے۔" یہ یا اسی کے قریب قریب عموماً ان سے سوال کیا جاتا۔ بظاہر مولوی عیسیٰ صاحب کے وجود سے استرواح اور ازالہ ملال و سآمہ کا کام لیا جاتا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایام درس کے اس طویل عہد میں ایسا گذرا ہو جس میں دلوں کے انبساط و انشراح کا یہ موقعہ اول یا آخر یا وسط میں نہ نکل آتا ہو۔ معلوم نہیں ہمارے یہ رفیق درس آجکل کہاں

ہیں کس مشغلہ میں ہیں۔ اسی دنیا میں ہیں۔ یا اپنے محبوب استاذ اور سلف صالحین کے ساتھ لاحق ہو گئے۔ اگر اسی دنیا میں موجود ہوں تو ان سے معافی کا خواستگار ہوں۔ درس انوری کی اس خصوصیت سے سکوت پر دل راضی نہ ہوا۔ اللھم ارحمنی بعبادک الغرّ الکرماء۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، اسلامی علوم و فنون کے دائرے کا شاید ہی کوئی علم یا فن ہوگا جس سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دلچسپی نہ تھی۔ اور ہر ایک علم و فن کے اصولی مسائل کے متعلق کوئی خاص تحقیقی نظریہ وہ نہ رکھتے ہوں۔ بلکہ عہدِ حاضر کے جدید کارآمد علوم کے صحیح معلومات کا بھی کافی ذخیرہ اُن کے پاس موجود تھا خصوصاً ہئیت (اسٹرانومی) کے جدید تمام اصطلات کا انھوں نے تحقیقی و تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔ انگریزی زبان سے تو ناواقف تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی حلقہ درس میں ہی فرماتے کہ اب اگر جیسا کہ مجھے خیال آتا ہے کہتے تھے کہ کشمیر کے کسی عصری اسکول میں کچھ دن شریک ہونے کا موقعہ بھی ان کو ملا تھا۔ لیکن فرماتے کہ انگریزی زبان کے دو لفظ غالباً پگ (Pig) اور فش (Fish) یہی دو لفظ مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

لیکن با ایں ہمہ ایک تو اسلامی عبادات کے متعلق کچھ دنوں سے "فیلاسوفی" نکالنے کا رواج جو چل پڑا ہے مثلاً وضو رباعثِ نشاط ہے۔ اور ورزش جسمانی کا فائدہ نماز کے قیام و قعود سے حاصل ہوتا ہے۔ ازیں قبیل مصالح و حکم ان شرعی امور کے جو بیان کئے جاتے ہیں شاہ صاحب ان کی تعبیر حکمت سے کرتے تھے اور فرماتے کہ ارباب قانون و تفقہ کی نظر حکمت پر نہیں۔ بلکہ حکم کی علت پر ہوتی ہے۔ مثلاً کہتے کہ سفر میں روزے کی تاخیر کی حکمت تو یہ ہے کہ مشقت سے بچانا مقصود ہے۔ لیکن سفر میں تاخیر صوم کی یہ

علت نہیں ہے۔ اسی لئے ایسا مسافر جسے سفر میں روزہ رکھنے کی سہولت ہی کیوں میسر نہو وہ تاخیر صوم کے اس قانون سے مستفید ہو سکتا ہے قانون کا فیصلہ یہی ہوگا۔

بہر حال شرائع کے متعلق حکمت نوازیوں کے اس مذاق کی شاہ صاحب حوصلہ افزائی نہیں فرماتے۔ اسی سلسلہ میں عموماً حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرکے سنایا کرتے تھے کہ کسی نے تشہد میں انگلیوں کے اٹھانے کی مصلحت یا حکمت آپ سے دریافت کی۔ تو سوال کو بے پروائی کے ساتھ سنتے ہوئے۔ اور شاید یہ فرماتے ہوئے کہ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ جی میں آئے تو کہدیا جا سکتا ہے کہ انگلی تشہد کی اٹھا کر اقرارِ توحید۔ اور دوسری انگلیوں کے بند کرنے کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ اسی توحید کے ساتھ اپنے دل کے اعتقاد کو نمازی وابستہ کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نماز و روزہ کے فلسفہ سے شاہ صاحب کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور جیسے کہتے ہیں سور تو حرام اپنی نجاست کی وجہ سے ہے، اور آدمی کا گوشت بھی حرام ہی ہے۔ لیکن کراہت کی وجہ سے اسی طرح حضرت شاہ صاحب کتابوں میں اگر کسی کتاب سے مرعوب اور حد سے زیادہ مرعوب تھے وہ اللہ کی کتاب قرآن تھا۔ قرآنی آیات کی تشریح و تفسیر میں آج جس بیجا جسارتوں کا مشاہدہ ہم کر رہے ہیں۔ اس کو دیکھ کر اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن۔ اور قرآنیات کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کے سکوت کا راز کیا تھا۔

کبھی کبھی اس باب میں ان سے کچھ سنا بھی تو یہ سنا کہ بعض غالی عقیدتمندوں نے یہ جو مشہور کر رکھا ہے کہ دین اور دنیا کا کوئی کلی اور جزئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو قرآن میں موجود نہ ہو۔ یا قرآن سے نکالا نہ جا سکتا ہو۔ اس خیال کی شدت کیساتھ تردید فرماتے۔ فرماتے کسی بڑے غبی کا یہ شعر ہے کہ ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنہ افہام الرجال

یعنی سارے علوم قرآن میں موجود ہیں۔ مگر لوگوں کی سمجھ اُس کے پانے سے قاصر ہے۔ مگر اپنی تقریر کو بس اسی غلط خیال کی تردید تک محدود رکھتے۔ لیکن یہ سوال کہ پھر قرآن میں کیا ہے؟ یا اس کی بحث کا حقیقی موضوع کیا ہے۔ کم از کم اس باب میں ان کا کوئی خاص خیال مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ بعض خانگی صحبتوں میں ڈرتے ڈرتے فقیر نے ایک دفعہ اس پہلو کے متعلق کچھ دریافت بھی کرنا چاہا۔ لیکن کچھ تو ان کے علم و تقوے اور شخصیت سے غیر معمولی مرعوبیت کی وجہ سے اپنے دل کی بات واضح لفظوں میں پیش نہ کر سکا۔ اور انھوں نے میرے اس سوال کو جس توجہ سے چاہئے تھا، سنا بھی نہیں۔ اپا کو "مشکلات القرآن" کے نام سے ان کے بعض ارشد تلامذہ نے ایک مجموعہ شائع بھی کیا ہے۔ لیکن میرا احساس اس کتاب کے بعد بھی یہی ہے کہ قرآن کی غیر معمولی عظمت و جلال ان کو اس کتاب کی طرف اس طریقہ سے متوجہ ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا۔ جیسے وہ انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔

بہر حال سیدنا الامام الکشمیری سے براہ راست قرآن پڑھنے کا موقعہ تو مجھے نہ مل سکا۔ لیکن حدیث ہی کے درس میں جہاں دوسرے علوم و فنون کے مسائل کی طرف شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذہن موقعہ موقعہ سے منتقل ہوتا رہتا تھا۔ اور اپنے اس ذہنی انتقال کا حضرت والا نے اپنی خاص اصطلاح میں "دفاع" نام رکھ لیا تھا۔

درس کی تقریر کرتے ہوئے قاعدہ تھا کہ بیچ بیچ میں فرماتے کہ "دفاع ہو گیا"۔ اس وقت مجھے اصول فقہ کے فلاں مسئلہ کی طرف۔ یا معانی و بیان و بدیع کے نکات

کی طرف پچھلے تینوں علوم یعنی معانی۔ بیان۔ بدیع جن میں عربی زبان کی نثر و نظم کے محاسن اور خوبیوں کے سمجھنے کا سلیقہ کلی قاعدوں کی مدد سے اس لئے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قرآنی تعبیروں کے اعجازی پہلوؤں کی یافت کی صلاحیت طلبہ میں نشوونما پائے۔ لیکن بجز حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کم از کم میں نے تو کسی مولوی کو نہیں دیکھا جسے صرف یہی نہیں کہ ان علوم کے مسائل مستحضر ہوں، بلکہ ان کے کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنے کی مہارت رکھتا ہو۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاہ صاحب نے ان علوم کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور دلچسپی کے ساتھ کیا تھا۔ قرآنی آیات، حدیث کے فقروں، عربی زبان کے اشعار کے ساتھ کبھی کبھی فارسی بلکہ کبھی تو اردو تک کے اشعار کے ان پہلوؤں کو نمایاں کر کے طلبہ کے ادبی مذاق کو بلند کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ سخن طرازی اور عبارت آرائی کی لئے گو فطری مناسبت کی ضرورت ہے لیکن سخن فہمی اور سخن فہمی کا سلیقہ مصنوعی کد و کاوش سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر سچی بات یہی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے درس کا یہ پہلو بھی عموماً طلبہ کے لئے کچھ غیر مفید ہی ثابت ہو رہا تھا۔

محروموں میں دوسروں کے ساتھ خود یہ فقیر بھی تھا۔ تاہم اس ذریعہ سے کبھی کبھی قرآن و قرآنیات کے متعلق شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی نقاط نظر کے سننے کا موقع مل گیا۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ انہی گنی چنی باتوں سے کتنے بے شمار فوائد مجھے حاصل ہوئے۔ مثلاً ایک خیال ان کا یہ تھا کہ:۔

لقد یسرنا القرآن للذکر اور ہم نے آسان کیا ہے قرآن کو چونک پیدا کرنے کیلئے۔

یا اسی قسم کی دوسری آیتوں میں سہولت اور آسانی اپنی خصوصیت قرآن

نے جو قرار دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآنی حقائق و معارف کی گہرائیوں تک ہر کہ و مہ کی رسائی آسان ہے۔ بلکہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی مرضیِ مبارک کیمطابق زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ذکر کچھ ایسے انداز میں قرآن کے اندر کیا گیا ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری سمجھ میں وہ نہ آیا۔ اس بارہ میں قرآن کا طریقۂ خطاب اتنا واضح، صاف و شستہ اور روشن ہے کہ کوئی سمجھنا ہی نہ چاہے تو یہ دوسری بات ہے۔ ورنہ قرآن اپنی حجت پوری کر چکا ہے۔ مثالاً توحید و شرک کے مسئلہ میں قرآن پڑھنے کے بعد بھی خود سوچنا چاہیئے۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بات میری سمجھ میں نہ آئی؟ قرآن پڑھنے اور سمجھنے کے بعد بھی مشرکانہ کاروبار میں کوئی اُلجھا ہوا نظر آئے تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ قصداً و ارادتاً قرآنی مطالبات سے کترا رہا ہے۔ بلکہ کہا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ٹکرا رہا ہے۔ اور بغاوت کی راہ اختیار کر رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اسی نکتہ کو فقیر کبھی کبھی اس تمثیل کے رنگ میں اپنے طلبہ کے آگے پیش کیا کرتا تھا کہ جمادات و نباتات، آب و آتش، خاک و باد وغیرہ کی شکلوں میں مادے کا جو ذخیرہ تمہارے سامنے پھیلا ہوا ہے یہ خدا کا کام ہے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ہر عامی و خاصی، جاہل و عالم کی ضرورت اس سے پوری ہو رہی ہے۔ بلکہ انسانوں سے آگے بڑھ کر دیکھنا چاہیئے تو عقل سے جو محروم ہیں۔ یعنی حیوانات بھی مادے کے اسی ذخیرے سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ان میں ہر ایک کی شخصی و نوعی بقار کی ضمانت استفادے کے اس عام پہلو کیساتھ وابستہ ہے۔ اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق سب ہی اسی سے اپنا اپنا

حصہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے حاصل کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس وقت بھی حاصل کر رہے ہیں۔ آئندہ رہتی دنیا تک عام افادہ واستفادہ کا یہ قصہ یونہی جاری رہے گا۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں مادے کے اسی ذخیرے اور اسی کے مختلف مظاہر کے ساتھ تعلق ہی کی دوسری نوعیت وہ ہے جو سائنس اور حکمت والے اس سے رکھتے ہیں۔ یہی مٹی۔ یہی پانی یہی ہوا۔ یہی لوہا۔ یہی لکڑی۔ یہی معدنیات جمادات ان کے سامنے بھی ہیں۔ جیسے ہر دیکھنے والے کے سامنے ہیں۔ مگر حکمت وسائنس والے انہی پیش افتادہ چیزوں کے اندر غور کرتے ہیں ٹٹولتے ہیں۔ ڈھونڈتے ہیں۔ تجربے کرتے ہیں اور آئے دن ان پر نت نئے نوامیس واسرار کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔ اور کیسے کیسے انکشافات کہ ہم جن باتوں کو سوچ بھی نہیں سکتے تھے، آج ان ہی مادّی انکشافات کی بدولت وہی ہمارے سامنے ہیں۔ سائنس والوں کے طفیل میں ہم بھی اُن کو برت رہے ہیں۔ موٹروں پر چلتے ہیں۔ ہوائی جہازوں پر اُڑ رہے ہیں۔ گھر بیٹھے سارے جہان کی خبریں سنتے ہیں۔

عرض کیا کرتا تھا کہ قدرت کے کام کا یہ رنگ جو نظر آرہا ہے۔ کچھ یہی حال اس قدرتی کلام کا بھی ہے۔ جسے ہم "القرآن" کہتے ہیں۔ ضرورت کی حد تک تو اس کتاب پر ایمان لانے والوں میں سے ہر ایک مستفید ہو رہا ہے اپنی اپنی حاجت کے مطابق اپنا اپنا حصہ ہر ایک اس قدرتی کلام سے حاصل کر سکتا ہے۔ اور کر رہا ہے۔ لیکن اس قدرتی کلام کے ساتھ دوسرا تعلق ان لوگوں کا ہے جو تدبّر وتذکر کی دولت سے سرفراز کئے گئے ہیں۔ یہی لوگ اس قدرتی کلام کے حکما، (سائنٹسٹ) ہیں۔ ان کو ان ہی آیتوں میں جنھیں پڑھنے والے پانچوں وقتوں کی نمازوں میں دُہراتے رہتے ہیں، اسرار ورموز کا سمندر موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔

بعض روایتوں میں قرآن کی خصوصیتوں کو بتاتے ہوئے اسی کی ایک شان کا اظہار

لا تنقضی عجائبہ	اس کے (یعنی قرآن کے) عجائب (یعنی ایسے انکشافات جو
ولا یخلق علی کثرۃ	لوگوں کو حیرت میں ڈالدیں) ختم نہ ہونگے اور بار بار دھرائے
الرد۔	جانیکی وجہ سے یہ کلام کبھی پرانا نہ ہوگا۔

کے الفاظ میں جو کہا گیا ہے۔ سمجھنے والوں کے نزدیک ان الفاظ کا یہی مطلب ہے[۱]۔

میں نے مراجعت کی تو حسن اتفاق سے بخاری شریف کی املائی شرح فیض الباری میں قرآن کے متعلق حضرت شاہ صاحب کے اس نقطۂ نظر کا بھی دیکھا کہ ذکر کر دیا گیا ہے۔ جامع تقریر نے حضرت شاہ صاحب کے مقصد کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ یعنی فرماتے تھے:۔

لیس معنی قولہ تعالیٰ ولقد یسرنا	حق تعالیٰ کے ارشاد لقد یسرنا القرآن۔ (یعنی
القرآن الأیہ ان کنھہ میسر لکل	ہم نے قرآن کو آسان کر دیا) اس کا یہ مطلب
من جل وقل بل معنی یسرہ انہ	نہیں ہے کہ ہر کہہ ومہ کی رسائی قرآن کے کنہہ
یغترف منہ کل غلیل ویشتفی	اور تہ تک آسان کی گئی ہے۔ بلکہ اس آسانی کی
منہ کل علیل فیھتدی منہ کل	مراد یہ ہے کہ ہر پیاسے کو موقع دیا گیا ہے کہ اس

---

[۱] تقریباً تیس اکتیس سال پہلے رسالہ "القاسم" میں خاکسار نے "کائنات روحانی" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع کرایا تھا۔ جس میں قدرت کے کام اور قدرت کے کلام کی باہمی مشابہتوں کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعد کو رسالہ کی شکل میں بعض قدر فرماؤں نے اس مضمون کو چھاپ دیا تھا۔ اب بھی بعض تجارتی کتب خانوں میں یہ رسالہ مل جاتا ہے۔ غالباً مکتبۃ الفرقان (لکھنؤ) گوئن روڈ میں اس کے کچھ نسخے ابھی محفوظ ہیں۔ کوئی صاحب دیکھنا چاہیں تو وہاں سے منگوا سکتے ہیں ۱۲

احسن الی ما یرضی به ربه ولا
ما یسخط عنه ولا یحتاج فی ذلک
الی کبیر تنقیر و تفکیر۔ اما معانیه
الغامضه، ومزایاه الرائقة
ومرامیه الشاسعة، فقد انقصمت
ظهور الفحول عن ادراکها۔
وعجزت الافکار عن التطواف
حول حریمها۔

فیض الباری
ص۳۰ جلد۴

سرچشمہ سے پی سکتا ہے۔ اور ہر بیمار اس سے اچھی شفا
حاصل کر سکتا ہے۔ یعنی جن باتوں سے اللہ تعالے
خوش ہوتے ہیں۔ اور جن باتوں کو ناپسند کرتے ہیں
ان کو وہ پا سکتا ہے اس کے لئے مزید کنج وکاوش
بچار کی ضرورت نہیں۔ باقی قرآن کے گہرے معانی
اور اس کے عمیق شاداب پہلوؤں، اور جن بل آویز
حقائق کی نشان دہی اس کتاب میں کی گئی ہے تو ان
کی یافت آسان نہیں ہے مردانِ راہ کی پیٹھیں اس نے
توڑ دیں۔ ان لطائف و رموز کے احاطہ تک پہنچنا
اُن کے گرد چکر کاٹنا، اس نے بڑے بڑے سوچنے
والوں کو تھکا مارا ہے۔

کیا قرآن میں سب کچھ ہے؟

لیکن اس کے ساتھ حضرت شاہ صاحب وقتاً فوقتاً طلبہ کو اس پر بھی متنبہ کرتے رہتے تھے۔ کہ قرآن کے نادان دوستوں میں عامیانہ خوش اعتقادی جو پھیلی ہوئی ہے کہ "قرآن میں سب کچھ ہے" گویا کچھ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خدا سب کچھ چونکہ جانتا ہے اس لئے چاہئے کہ اس کی کتاب میں بھی سب کچھ ہو۔

ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب
مبین۔

نہیں ہے کوئی تر یا خشک بات مگر کتاب
مبین میں سب کچھ ہے۔

یہ یا اسی کے ہم معنی و ہم مفہوم آیتوں کو تائید میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس میں شک

نہیں کہ اہلِ علم کے سنجیدہ طبقات میں اس قسم کی خوش اعتقادیوں کی کبھی ہمت افزائی نہیں کی گئی۔ لیکن کھُلے کھُلے صاف الفاظ میں اس عامیانہ احساس کا ازالہ شاہصاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں بار بار مختلف پیرایوں میں جس زور اور قوت کے ساتھ کیا جاتا تھا، اس کے تأثرات اب تک اپنے اندر پاتا ہوں۔ ان ہی کی زبان مبارک سے غالباً پہلی دفعہ یہ عربی شعر سنا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کسی "غبی" کا شعر ہے کہ

جمیع العلم فی القرآن لکن　　　تقاصر عنہ افہام الرجال

(یعنی سارے علوم قرآن میں موجود ہیں۔ لیکن لوگوں کی سمجھ اُن کے پانے سے کوتاہ ہو کر رہ گئی)۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے معلومات کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن کو خدا نے نازل کیا ہے۔ اگر یہ مانا جائے تو ساری کائنات بھی کاغذ کی شکل اگر اختیار کر لیتی جب بھی "خدائی معلومات" کے لئے وہ قطعاً کافی نہ ہوتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ غریب جاہل آدمی بھی اپنی معلومات کو قلم بند کرنا چاہے تو اُن کے لئے مجلدات کی ضرورت ہوگی پھر خدائی معلومات تو خدائی معلومات ہیں۔ اور معلومات کا اظہار اگر مقصود نہیں ہے۔ بلکہ نسل انسانی اپنے صحیح انجام تک علم و عمل کے جس نظام کی پابندی کر کے پہنچ سکتی ہے۔ فقط اس نظام کے بنیادی کلیات سے آگاہ کرنے کے لئے قرآن نازل ہوا ہے۔ اور یہی اس کتاب کی بحث کا اساسی و جوہری موضوع ہے بھی تو اس کے سوا قرآن میں خارج از موضوع معلومات کا تلاش کرنا۔ نہ صرف تلاش کرنیوالوں کی غباوت و بلادت ہی کی دلیل ہے بلکہ قرآن کے نازل کرنے والے کی طرف ایک ایسے نقص کو منسوب کرنے کی یہ جرأت ہوگی جسے بہ ثبات عقل و ہوش کوئی صاحب

تمیز و خرد آدمی بھی اپنی کسی تصنیف کے متعلق شاید برداشت نہیں کر سکتا۔ آخر طب کی کسی کتاب میں شرح وقایہ کے فقہی مسائل یا شرح وقایہ میں امیر اللہ داغ کے کلام کے تنقیدی مضامین کو جو ڈھونڈھے گا۔ اس کے جنون میں کیا کوئی شبہ کر سکتا ہے؟

یاد آتا ہے کہ مذکورہ بالا شعر کو شاہ صاحب اکثر دہراتے۔ کبھی تو کہنے والے کو صرف "غبی" ہی کہہ دینے پر اکتفا کرتے اور جب زیادہ جلال آتا تو کہتے کہ "کس غبی الاغبیار" کا یہ شعر ہے[۵۱]۔

---

[۵۱] افسوس ہوتا ہے کہ افواہی قصوں تک بات محدود رہتی تو غنیمت تھا۔ صاحب نور الانوار ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ نے جو علماء ہند میں واقعی غیر معمولی فضل و کمال کے حامل ہیں۔ اپنے عنفوان شباب میں قرآن کی ایک مختصر سی تفسیر لکھی ہے جو تفسیرات احمدیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس عمر میں ملا صاحب کی یہ کتاب واقعہ یہ ہے کہ ان کے اس شاندار علمی مستقبل کی دلیل ہے جس کا مشاہدہ بعد کو لوگوں نے کیا۔ لیکن پھر بھی کم عمری کی وجہ سے تفسیر کے دیباچہ میں ان کے قلم سے یہ فقرہ نکل گیا ہے کہ فما من شئی الا یمکن استخراجہ من القرآن (کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا نکالنا قرآن سے ممکن نہ ہو) اسی سلسلہ میں مثالاً لکھ دیا ہے کہ بعضوں نے قرآن سے علم ہیئت و ہندسہ نجوم کے مسائل بھی نکالے ہیں ملا صاحب کے اسی قول پر تبنی کی کوئی مولوی جن کا نام "المولوی رحیم بخش" بتایا گیا ہے۔ اور لوح کتاب میں ان کے نام کے ساتھ "آیۃ من آیات اللہ" کے الفاظ بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ان ہی المولوی رحیم بخش صاحب نے حاشیہ میں مزید اضافہ یہ فرمایا ہے کہ ہندسہ و ہیئت، و نجوم ہی نہیں قرآن سے تو جبر و مقابلہ نجامت، حدادت، نسج، و غزل (یعنی سوت بنانے تاگا بلنے) فلاحت (زراعت) صباغت (رنگریزی) طباخی وغیرہ وغیرہ فنون کے مسائل نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے دعویٰ کر کے دلائل میں جن آیتوں کی یہ لوگ تلاوت کرتے ہیں تو وہی لطیفہ جاہل پیر کا یاد آجاتا ہے۔ پیر صاحب مریدوں کو باور کراتے تھے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

قرآنی تعبیروں کے متعلق ایک عالمانہ نکتہ

بلکہ اس باب میں قرآن کے پیرایۂ بیان اور طریقۂ تعبیر کے ایک خاص پہلو کی طرف بھی شاہ صاحبؒ اشارہ فرمایا کرتے تھے اس کو اگر سمجھ لیا جائے تو بہت سی غلط فہمیوں کا خود بخود ازالہ ہو جاتا ہے اور بیسیوں بے معنی الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ قرآن میں مثلاً حکم دیا گیا ہے کہ کیا تم اونٹ کو نہیں دیکھتے۔ یا آسمانوں کو، پہاڑوں کو، زمین کو نہیں دیکھتے؟

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کہ قرآن میں سب کچھ ہے اتنے میں کسی نے آکر دریافت کیا کہ ایک شخص مر گیا ہے۔ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ ماں بھی اس نے چھوڑی ہے پھر اس کا ترکہ کس کس کو دیا جائے۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ "تو نے سورہ تبت یدا ابی لہب نہیں پڑھی ہے ؟ اسی میں تو صاف لکھا ہے کہ "ما کسب" یعنی سب کچھ ماں کا ہے۔ ما قدروا اللہ حق قدرہ کے سوا ایسے بوتعوں پر اور کیا پڑھا جائے۔ یہ تفسیرات احمدیہ کے دیباچہ ہی میں ملا صاحب نے لکھا ہے کہ طالب علمی سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے۔ اور عمر آن کی اکیس سال سے متجاوز نہ ہوئی تھی۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے ایام حکومت میں یہ تفسیر لکھی۔ دیکھو مطبوعہ مطبع کریمیہ بمبئی۔
لا رطب ولا یابس وغیرہ جیسی آیتوں کا مطلب یہی ہے کہ اپنے خاص موضوع بحث کے لحاظ سے قرآن میں کوئی بات چھوٹ نہیں گئی ہے۔ بشرطیکہ کتاب مبین سے مراد قرآن ہی ہو۔
تبیاناً لکل شئی وغیرہ کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ تدمر کل شئی (ہوا کی ہر چیز کو ڈھاتی چلی جاتی تھی) اس میں "کل" کا لفظ ظاہر ہے کہ منطقیوں کا موجبہ کلیہ کا سور نہیں ہے جس میں ہر شئی داخل ہو۔ بلکہ ڈھے جانے کی صلاحیت جن چیزوں میں تھی اس کو آندھی برباد کر رہی تھی — ۱۲

الغرض دیکھنا (دیکھنا نظر و بصر) ایک انسانی فعل ہے۔ جس کو قرآن عموماً گرد و پیش کی چیزوں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اب کوئی یہ کہنے لگے کہ آدمی درحقیقت صرف رنگ کو دیکھتا ہے۔ رنگ کو بھی نہیں بلکہ روشنی سے حقیقی تعلق آدمی کی قوت بینائی کا قائم ہوتا ہے۔ اور روشنی کے توسط سے رنگوں (ہرے، پیلے، سبز وغیرہ) کو دیکھتا ہے لیکن جو چیز نہ روشنی ہے اور نہ رنگ اس کے ساتھ تو بینائی کی قوت کا تعلق ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ بینائی کی گرفت میں ہوا مثلاً اسی لئے تو نہیں آتی کہ وہ بے رنگ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم و جدید حکیمانہ تحقیق کا یہی صحیح نتیجہ ہے بھی۔

اب سائنس کی اس تحقیق کو بنیاد بنا کر قرآن پر کوئی معترض ہو کہ جو چیزیں نہ رنگ ہیں نہ روشنی ان کی طرف بصر یا نظر (یعنی بینائی اور دیکھنے) کو منسوب کر کے قرآن نے ایک ایسی بات بیان کی ہے جو واقعہ کے مطابق نہیں ہے۔

شاہ صاحب فرماتے کہ یہ اعتراض قرآن پر اگر اعتراض کرنے والے کے مخبوط ہونے کی دلیل ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اپنے احساسات و تأثرات کی تعبیر کا جو عام طریقہ انسانوں میں مروّج ہے۔ اسی طریقۂ معتبر کو اختیار کر کے قرآن باتیں سمجھاتا ہے۔ اور قرآن ہی کیا؟ یوں بھی سائنس اور فلسفہ کے مسائل کا کوئی خبطی اپنی بیوی سے کہہ بیٹھے کہ "تم کو اگر میں دیکھوں تو تم پر طلاق پڑ جائے"

اس کے بعد بیوی کو دیکھنے کے بعد دعویٰ کرے کہ میں نے بیوی کو کب دیکھا میں نے تو صرف اس رنگ کو دیکھا جو اس کے چہرے کی کھال پر چڑھا ہوا ہے۔ اور اس لئے کہتا پھرے کہ طلاق نہیں پڑی۔ پاگل خانوں کے سوا ایسوں کے لئے اور بھی کہیں جگہ ہو سکتی ہے؟

اس مثال کو سمجھلنے کے بعد فرمایا کرتے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتیں جو پائی جاتی ہیں جن میں حرکت، اور جاری ہونے کے تعلق کو آفتاب و ماہتاب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مثلاً:۔

والشمس تجری لمستقر لھا ؟ اور آفتاب اپنے ٹھکانے کے لئے جاری ہے۔

وغیرہ جیسی آیتوں میں یہی کہا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے بلکہ یہی ہے کہ اپنے مشاہدات و احساسات کی جو تعبیر عموماً لوگوں میں مروّج ہے اسی طریقۂ معتبر و پیرایہ بیان کو قرآن نے اختیار کیا ہے جیسے نظر و بصر (بینائی) کو ان ہی چیزوں کی طرف قرآن نے منسوب کر دیا ہے۔ جس کی طرف منسوب کرنے کا رواج ہے لیکن نظر و بصر کے متعلق جیسے یہ سمجھا جاتا ہے کہ واقعی بینائی کا حقیقی تعلق جن چیزوں سے ہوتا ہے اس حقیقت کا اظہار یہ قرآن کا مقصود نہیں ہے۔

اسی طرح آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی طرف جاری ہونے کے فعل کی انتساب سے یہ سمجھ لینا کہ رات اور دن کا جو چکر ہمارے سامنے جاری ہے اس کی اصل حقیقت کو قرآن واشگاف کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب تو پھر وہی ہوا کہ اپنی معلومات کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن کو حق تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔

لیکن جب معلوم ہو چکا کہ قرآن کے موضوع پر بحث سے جو جاہل ہے وہی اس قسم کے مالی خولیا میں مبتلا ہو سکتا ہے تو حوادث کائنات کی توجیہ و تاویل کے قصوں کو قرآن میں ڈھونڈھنا یا اس سلسلہ میں قرآن کی طرف کسی قطعی فیصلہ کی جرأت خود اپنی عقل کی بھی اہانت ہے۔ اور ایسے عیب و نقص کو قرآن کی طرف منسوب کرنا جیسی عرض کر چکا ہوں، کوئی صحیح العقل آدمی بھی اپنی تصنیف میں پسند نہیں کر سکتا۔ دیوانہ ہی ہوگا جو

تاریخ کی کتاب میں ڈاکٹری نسخوں کا ذکر چھیڑدے یا طب کی کتاب میں شعروادب کی تنقید ڈھونڈھنے لگے۔

بہرحال رات اور دن کے الٹ پھیر کے واقعی اسباب خواہ کچھ ہی ہوں زمین گھومتی ہو یا آفتاب چکر لگا رہا ہو، یا آسمان گردش میں ہو، قرآنی مباحث کے دائرے سے یہ سوالات خارج ہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ اس سلسلہ میں اپنی تعبیروں کو عام انسانی احساسات کے مطابق اگر قرآن رہنے نہ دیتا، مثلاً رات دن کے اسی قصہ میں اعلان کر دیتا کہ زمین کی گردش کا یہ نتیجہ ہے تو مطلب اس کا یہی ہوتا کہ جب تک زمین کی گردش کا مسئلہ طے نہ ہوتا قرآن پر ایمان لانے سے لوگ محروم رہتے۔

کہا کرتے تھے کہ لوگ دن رات ہی کے ایک قصے میں الجھے ہوئے ہیں لیکن حقیقت کی پیش گاہ میں انسانیت جب داخل ہوگی۔

السرائر ——— پوشیدہ حقائق

ابل کر اپنی اصلی شکلوں میں جب سامنے آجائیں گے تو اس وقت پتہ چلے گا کہ دن اور رات کے الٹ پھیر ہی کی صرف یہی ایک بات نہیں بلکہ جو کچھ دیکھا سنا جا رہا ہے چکھا اور چھوا[۵۱] جا رہا ہے۔

---

۵۱ چھونے یعنی قوت لامسہ کی بوالعجبیوں کو دیکھئے۔ موسم سرما میں عموماً سمجھا جاتا ہے کہ کنوؤں کا پانی گرم ہو جاتا ہے۔ اور کتنا گرم کہ تازہ پانی ڈول میں جب نکالا جاتا ہے تو تھوڑی دیر تک اس سے بھاپ بھی نکلتی رہتی ہے لیکن تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ کنوئیں کے پانی کا ٹمپریچر (درجۂ حرارت) جو گرمی کے موسم میں رہتا ہے، سردیوں کے موسم میں کسی قسم کی تبدیلی اس میں نہیں ہوتی۔ البتہ پانی کے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

الغرض ہمارے احساسات کا بڑا حصہ معلوم ہوگا۔ اس کی نوعیت ان حالات سے مختلف ہے جنھیں اس وقت ہم پا رہے ہیں۔ گویا وبدا لھم من اللہ ما لا کی قرآنی خبر چہرے سے نقاب الٹ کر سامنے آجائے گی۔ تب پتہ چلے گا کہ ہم کیا سوچتے تھے۔ اور اب کیا ہو رہا ہے۔

یہ بھی کبھی کہا کرتے کہ لیل و نہار کا انقلاب زمین کی گردش کا نتیجہ ہے، حالانکہ علم کے عصری حلقوں میں اس کو ایک ثابت شدہ غیر مشتبہ فیصلہ قرار دیا جا چکا ہے، لیکن با این ہمہ بولنے والے اب بھی جب بولتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے طلوع ہو رہا ہے۔ سورج سمت الراس پر آگیا۔ یہ کیا ہے؟

وہی بات کہ افہام و تفہیم میں عام قاعدہ یہی ہے کہ عام احساسات کے مطابق تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ بجائے اس کے کوئی طلوع کی اطلاع دیتے ہوئے کہنے لگے کہ گھومتے ہوئے زمین اس نقطہ تک پہنچ گئی جہاں سے آفتاب کا کنارہ دکھائی دیتا ہے۔ اور خیال کریئے کہ واقعہ کی صحیح نوعیت یہی ہے۔ ممکن ہے کہ واقعہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) چھونے والوں کی قوت لامسہ سردیوں میں ٹھنڈک سے متاثر ہو جاتی ہے۔ یعنی ہاتھ آدمی کا زیادہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اس لئے کنوئیں کے پانی کا درجۂ حرارت کے احساس میں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور وہی پانی جو گرمی میں ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا سردیوں کے موسم میں معلوم ہوتا ہے کہ گرم ہے، شدت برودت اور ٹھنڈک کے بڑھ جانے کی وجہ سے بخارات جو گرمی و سردی ہر زمانہ میں پانی سے اٹھتے رہتے ہیں ان ہی بخارات میں فضا کے ٹھنڈے ہونے کی وجہ سے تکالیف کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی سے بھاپ نکل رہی ہے۔ دیکھا آپ نے واقعہ کیا ہے لیکن اسی واقعہ کے متعلق ہمارے احساسات کی نوعیت کیا ہے؟ اسکی بیسیوں مثالیں سائنس کی کتابوں میں آپکو مل سکتی ہیں"

بھی ہو۔لیکن طریقۂ تعبیر غلط ہے۔آپ نے ملازم کو حکم دیا کہ بالاخانے پر چڑھ کر دیکھو آفتاب نکلا یا نہیں؟ دیکھنے کے باوجود آپ کا فلسفی ملازم یہ فلسفہ اگر بگھارنے لگے کہ آفتاب مجھے نظر نہیں آیا۔اور مطلب یہ لے کہ میں نے جس چیز کو دیکھا یعنی روشنی وہ آفتاب کی

سلہ مطلب یہ ہے کہ انقلاب لیل و نہار، یعنی رات دن کے الٹ پھیر کا مشاہدہ تو ایک عام مشاہدہ ہے مگر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیا چراغ گھوم رہا ہے؟ یا چراغ سے جو چیز روشن ہو رہی ہے اس کی گردش سے الٹ پھیر کی یہ صورت سامنے آتی ہے۔حقائق کائنات پر غور کرنے والوں کے حلقہ کا یہ پُرانا سوال ہے حکیم فیثاغورس کا دعویٰ تھا کہ چراغ یعنی آفتاب نہیں۔بلکہ زمین ہی آفتاب کے گرد چکر لگا رہی ہے۔مگر بطلیموسی نظام میں فیثاغورس کے اس نظریہ کو رد کر دیا گیا اور شب و روز نیز موسموں کی تبدیلیوں کی توجیہ یہ تسلیم کی جاتی رہی کہ آسمان گھوم رہا ہے۔جیسا کہ معلوم ہے پچھلے دنوں یورپ کے بعض ارباب نظر نے مختلف آلاتی تجربات سے فیثاغورس کے پرانے خیال کو زیادہ قرین قیاس پایا۔اور ہمارے زمانہ کی جدید ہیئت کے سارے نتائج اسی مسئلہ پر مبنی کر کے پیدا کئے جاتے ہیں لیکن زمین کی حرکت کی نوعیت اس وقت تک غیر منفصل ہی۔حال میں ایک روسی ریاضی داں الگزنڈر ازوطاف کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا ہے کہ ایک ہی محور پر زمین گردش نہیں کر رہی ہے۔جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔بلکہ ازوطاف کے نزدیک تین تین محوروں پر زمین گھوم رہی ہے جنمیں ایک محور قطبی ہے اور دو استوائی۔استوائی گردش دو محوروں پر ہو رہی ہے۔اسکی دلیل یہ ذمیہ موصوف یہ پیش کرتے ہیں کہ قطبین کا ارتعاش دائرے میں نہیں۔بلکہ اہلیلج میں ہوتا ہے انکا خیال یہ بھی ہے کہ خطِ استواء کو دائرہ کی شکل میں جو تصور کیا جاتا ہے یہ صحیح نہیں بلکہ اہلیلجی نما یا بیضوی ہے (صدق جدید ۱۲ر مارچ ۱۹۵۲ء) بی۔ٹی۔آئی کے حوالہ سے اس علمی خبر کو نقل کر کے مولانا عبد الماجد صاحب نے لکھا ہے۔ اور بالکل صحیح ارشاد ہوا ہے کہ ریاضیات جیسے علوم جنکے مسائل سمجھے جاتے ہیں کہ فیصلہ کن قطعی ہوتے ہیں جب انکا یہ حال ہی تو تخمین و ظن پر جن علوم کے نظریات کی بنیاد قائم ہے مثلاً معاشیات (اکانومی) عمرانیات (سوشیالوجی) وغیرہ کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے

نہ تھی۔ اور واقع میں جو آفتاب ہے وہ مجھے نظر نہ آیا؟ تو خود ہی بتائیے کہ اپنے اس فلسفی لازم پر آپ کا غصہ تھم سکتا ہے؟ یا وضوء کے لئے لازم سے کہا جائے کہ کنویں کا گرم تازہ پانی نکال کر لاؤ۔ لازم یہ سوچ کر پانی کا درجہ حرارت تو گرما و سرما دونوں موسموں میں ایک ہی رہتا ہے۔ نہ جائے اور کہنے لگے کہ پانی کنویں کا گرم کب ہوتا ہے جو لاتا۔ تو

لـه قرآن میں بعض مقامات پر اس قسم کی آیتیں بھی ملتی ہیں مثلاً ذوالقرنین کے قصے میں ہے کہ آفتاب کو سیاہ کیچڑ کے چشمہ میں ڈوبتے ہوئے اس نے پایا یعنی وجدها تغرب فی عین حمئة اس میں تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ آفتاب کے غروب کی حقیقت نہیں بیان ہو رہی ہے۔ بلکہ ذوالقرنین کے وجدان اور یافت کی یہ تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین یہ پا رہا تھا کہ سیاہ کیچڑ کے چشمہ میں آفتاب ڈوب رہا ہے۔ اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس قسم کی تعبیروں میں قرآن کے سامنے بجائے واقعہ کے پانے والوں کے وجدانات اور احساسات ہوتے ہیں۔ یہاں پر تو الفاظ بھی ایسے استعمال کئے گئے ہیں جن سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ دیکھنے والے کے احساس کے مطابق تعبیر اختیار کی گئی ہے لیکن اس کو اب کیا کہئے کہ بعض لوگوں نے اسی آیت کی بنیاد پر یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ مغرب کے وقت آفتاب جیسا طویل وعریض جسم جس کے مقابلہ میں زمین کا ہمارا کرہ رائی کے دانہ سے زیادہ وقیع نہیں۔ اسی زمین کے کسی چشمہ میں آفتاب سما جاتا ہے اور ڈوب جاتا ہے۔ اگرچہ ابتداء ہی سے مفسرین اس قسم کی غلط اندیشیوں کی تصحیح کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر اتنی بات تو بہر حال ثابت ہوتی ہے کہ تصریح کے باوجود جب قرآن کے طریقۂ تعبیر کو بعض لوگ نہ سمجھ سکے تو جہاں اس قسم کی تصریحات نہیں ہیں وہاں قرآن کے موضوع پر بحث سے ناواقف لوگوں کو کچھ غلط فہمی ہو جائے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں کھلے کھلے صاف الفاظ میں قرآن کے طریقۂ تعبیر کے اس پہلو کو شاہ صاحب سے پہلے شاید ہی کسی نے اتنی قوت کے ساتھ واضح کیا ہو ۱۲۔

اس کی ملازمت کے سلسلہ کو اس کا فلسفہ آئندہ کیا جاری رہنے دے گا؟

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اسی خیال نے میرے ذہن کو ادھر منتقل کیا۔ کہ قرآنی آیات کو محکمات و متشابہات دو حصوں میں تقسیم کر کے قرآن ہی میں جو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ جن کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ ہے۔ وہی فتنہ انگیزیوں کے لئے متشابہ آیتوں کی تاویل و توجیہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ:۔

فالذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منھم ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ۔ کچھ ادھر دھیان جاتا ہے کہ قدرت کے کلام کی یہی خصوصیت قدرت کے کام میں بھی نظر آتی ہے۔ یعنی جیسے کلامی آیات کی ایک قسم وہ ہے جس کا نام قرآن نے متشابہات رکھا ہے۔ اسی طرح کائناتی آیات اور نشانی آیات اور نشانیاں جنھیں صحیفۂ قدرت پر حق تعالیٰ نے نمایاں فرمایا ہے۔ ان آیات کے بھی بعض مظاہر کی نوعیت تقریباً "متشابہات" ہی جیسی نظر آتی ہے۔ بجائے خود کائناتی آیات کے متشابہات کی تاویل و توجیہ ان کے اسباب و علل کا سراغ اور ٹوہ لگانا یہ دوسری بات ہے۔

لیکن بعض لوگ جنھیں درحقیقت نہ حکمت اور سائنس ہی کا ذوق ہوتا ہے اور نہ دین اور مذہب ہی کی قدر و قیمت کا انھیں صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن اپنی قلبی زیغ اور ذہنی کجی کی وجہ سے خواہ مخواہ ان کو اس کا شوق ہوتا ہے کہ کائناتی آیات کے متشابہات یعنی جن کی توجیہ و تاویل میں مختلف پہلو پیدا ہو سکتے ہیں ان کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اور "دینیات و عقلیات" کے تصادم و تناقض کا ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔

مگر آپ دیکھ رہے ہیں الراسخون فی العلم کا مذاق متشابہات کی دونوں قسموں کے متعلق کتنا صاف و پاک ستھرا اور اجلا ہے۔ ہر ایک کے متعلق اپنے اندر:۔

امنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب (آل عمران)

ہم سب ہی کو مانتے ہیں، سب ہمارے پروردگار کے پاس کی چیزیں ہیں، اور نہ چونکتے مگر وہی لوگ جو مغز والے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ متشابہات خواہ قدرت کے کلام سے ان کا تعلق ہو، یا قدرت کے کام سے، دل میں زیغ اور ٹیڑھ ہو تو دونوں ہی سے فتنہ انگیزی اور فساد پردازی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جن کا علم راسخ ہے اور قلب سلیم ہے وہ جانتے ہیں کہ قدرت ہی نے جن آیات اور نشانیوں میں "تشابہ" کا رنگ بھرا ہے ان میں بہرحال یہ رنگ باقی ہی رہنا ہے۔ اس رنگ کو دور کر کے "متشابہات" کو بھی "محکمات" کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش سچ پوچھئے تو قدرت اور اس کے قوانین سے کش مکش کی یہ ایک گستاخانہ کوشش ہو گی۔

واقعہ یہ ہے کہ مادی کائنات اور قرآنی آیات جنہیں اپنی خاص اصطلاح میں فقیر "روحانی کائنات" بھی کہتا ہے۔ ان دونوں قدرتی آیات اور نشانیوں میں مشابہت و مجانست کے بہاں بیسیوں وجوہ خاکسار پر واضح ہوتے ہیں۔ جن میں بعضوں کا تفصیلی ذکر آپ کو میرے رسالہ "کائنات روحانی" میں ملے گا۔

مناسبت و مشابہت کے ان ہی پہلوؤں میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قدرتی آیات کے ان دونوں ہی شعبوں میں محکمات کے ساتھ ساتھ ایسی آیتیں اور نشانیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کو "متشابہات" کے سوا ہم اور کچھ کہہ نہیں سکتے دونوں ہی کی توجیہ و تاویل میں مختلف شکوک اور احتمالات پیدا ہوتے ہیں۔

یہی رات دن کے الٹ پھیر کے قصہ میں دیکھئے۔ مادی کائنات کے بے شمار مشاہدات میں ایک مشاہدہ یہ بھی ہے۔ لیکن یہ کیوں ہو رہا ہے؟ کیسے ہو رہا ہے؟ سن چکے کہ

مادی کائنات کی اس آیت اور نشانی کی توجیہ میں سوچنے والوں کا دھیان کن کن باتوں کی طرف گیا۔ ہزار ہزار سال گذر چکے ہیں بیسویں صدی عیسوی کا نصف حصہ بھی گذر چکا ہے۔ لیکن قطعی اور محکم فیصلہ جس میں آئندہ کسی ترمیم کی گنجائش باقی نہ رہے ہے۔ اس وقت تک طے نہ ہو سکا۔ زمین ہی کی گردش کا نتیجہ اس کو مان لیا جائے۔ جیسا کہ اس زمانہ میں مان لیا گیا ہے۔ لیکن خود زمین کی اس حرکت اور گردش کی نوعیت کے متعلق مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کی یہ خبر آپ تک پہنچا چکا ہوں کہ صحیح معنوں میں اب تک متعین نہیں ہوئی ہے۔

یورپ و امریکہ کے حکماء اس باب میں جو کچھ مان چکے تھے۔ پھر بحث طلب مسئلہ بن گیا ہے۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ آئندہ سوچنے والے اس راہ میں کن کن خیالات اور تجویزوں کو پیش کرنے والے ہیں۔ اور اسی کو میں "تشابہ" کہتا ہوں یہ مثال تو مادی کائنات کی ایک قدرتی آیت اور نشانی کی ہوئی۔ اب روحانی کائنات میں آئیے۔ دور کیوں جائیے۔ اسی رات اور دن جس کا بہرحال سورج کی روشنی ہی سے تعلق ہے۔ جس وقت تک اس کے جس حصہ پہ سورج کی روشنی پڑتی ہے اس حصہ کا وہ وقت دن ہے اور روشنی اس کی جب اس حصہ سے غائب ہو جاتی ہے تو وہی رات اس حصہ کی قرار پاتی ہے۔

قرآن میں اسی سورج کی طرف تجری کا لفظ منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ہمارے عام احساس کی تعبیر ہے یا خالق کائنات کے علم میں واقعہ کی جو صحیح نوعیت ہے۔ اسی واقعہ کے مطابق تجری کے اس لفظ سے اپنے علم کو حق سبحانہ وتعالیٰ ظاہر فرمانا چاہتے ہیں؟ ذہن دونوں پہلوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے، یہی "تشابہ" کا اقتضاء ہے پھر جن کے دلوں میں کجی ہوگی اور زیغ سے جن کے قلوب ماؤف ہیں وہ اس سے فتنہ انگیزی کا۔

کام لے سکتے ہیں۔ لیکن راسخ علم والے آمنا بہ کل من عند ربنا کو متشابہات کے متعلق اصل قرار دے کر تاویل کی راہ اگر اختیار بھی کریں گے تو وہ ایسی راہ ہوگی جس سے بجائے بھڑکنے کے فتنوں کے دبانے میں مدد مل سکتی ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اسی توجیہ کو دیکھئے، گردش لیل و نہار کی وجہ خواہ کچھ ہو، آسمان یا آفتاب یا زمین کے گھومنے کا یہ نتیجہ ہو، یا آئندہ اس انقلابی مشاہدے کے متعلق سوچنے والوں کا کوئی نیا راز واضح ہو، کچھ بھی ہو ہر حال میں قرآن کے حریم ادب کا تقدس و احترام قائم و دائم باقی برقرار رہتا ہے۔ اس کے سرا پردۂ عصمت و جلال کو حکمت و سائنس کا کوئی نتیجہ بھی ہو، چھو بھی نہیں سکتا۔ یوں فلسفہ و حکمت کے سیمیائی نظریات اور موسمی تاثرات کی دست نگری سے قرآن پر ایمان لانے والے جیسے آزاد رہتے ہیں، ٹھیک اسی طرح کائناتی آیات اور نشانیوں کی توجیہ و تاویل، تلاش و جستجو کے اطلاقی اختیارات پر بھی قرآن کی طرف سے کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ ایمان بھی آزاد، اور عقل بھی آزاد، اپنی اپنی راہوں پر دونوں ہی کسی تصادم اور کشمکش کے بغیر سرگرم سیر رہتے ہیں۔

یقین کیجئے کہ دانش کی پختگی، علم کا رسوخ خواہ قرآنی آیات میں ارزانی ہو، یا کائناتی آیات میں میسر آئے۔ ہمیشہ اس نے اسی خوشگوار ماحول کو پیدا کیا ہے۔ لیکن خام فکروں، خام کاروں کے ہاتھوں میں پہنچ کر پکی باتیں بھی کچی بن جاتی ہیں[۱]۔ عارف روم نے سچ فرمایا ہے

---

[۱] قرآن میں حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف بعض صفات کا انتساب جن الفاظ میں کیا گیا ہے۔ مثلاً وہ بصیر ہے، سمیع ہے یعنی دیکھنے والا سننے والا ہے۔ یہ مان لیا جاتا کہ جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں ان کو بھی جانتا ہے جو سنی جاتی ہیں ان کا بھی عالم ہے تو بات ختم ہو جاتی۔ لیکن دیکھنے کے بعد آنکھوں اور آنکھوں کے بعد آنکھوں کے پردوں اور ان اسباب و آلات کی طرف لوگوں کا ذہن منتقل ہوا۔ جن کے بغیر آدمی (بقیہ برصفحہ آئندہ)

ہر چہ گیرد علتی علت شود | کفر گیرد کاملی ملت شود

اسی مضمون کو کسی ظریف نے یوں موزوں کیا تھا۔

میسیں مرغ سمجھتے ہیں اور ہیں خاموش | سنو گے ٹینیوں میں چون وچرا کا جوش وخروش

تفسیر بالرائے اسی سلسلہ میں قرآن ہی کے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ کی اس اصولی بات کا بھی خیال آتا ہے۔ یہ "تفسیر یا تاویل بالرائے" کا مسئلہ ہے بعض روایتیں جن میں تاویل بالرائے کی ممانعت کی گئی ہے اور اسے جرأتِ بیجا قرار دیتے ہوئے دھمکی دی گئی ہے کہ "اس جرم کا ارتکاب جہنم کو آدمی کا ٹھکانا (مقعد) بنا دیتا ہے"۔ عام طور پر اسی روایت کو بنیاد بنا کر کچھ اس قسم کا خیال پھیلا دیا گیا ہے کہ قرآنی آیات کا مطلب کوئی بیان ہی نہیں کر سکتا۔ جب تک ا، اس مطلب کی تائید میں کسی روایت کی پشت پناہی اسے حاصل نہ ہو۔ اسی وجہ سے تفسیروں کی ان کتابوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ جن میں ہر آیت کے ذیل میں روایات کے درج کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

ابن جریر طبری کی تفسیر کی عظمت کا مدار زیادہ تر اسی پر ہے کہ تفسیری روایات کا غیر معمولی سرمایہ اس کتاب میں جمع ہو گیا ہے۔ یا طبری کے بعد السیوطی کی تفسیر "دُرِ منثور" کی قدر و قیمت کا راز بھی یہی ہے۔

اسی نقطۂ نظر سے کہنے والوں نے "امام فخر الدین رازی" کے متعلق یہ لطیفہ مشہور کر رکھا ہے کہ:۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) دیکھ نہیں سکتا مثلاً رنگ اور روشنی کے دیکھنے کو بھی خدا کے دیکھنے کے متعلق خام کاروں نے چھیڑ دیا مباحث کا طوفان برپا ہو گیا۔ فرقوں پر فرقے بنتے چلے گئے۔ مختصر سی بات کتنی طویل ہو گئی ۱۲

فیہ کل شیٔ الا التفسیر[۵] امام رازی کی تفسیر میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے۔

اشارہ اسی طرف کیا گیا ہے کہ روایات کی طرف امام نے اپنی تفسیر میں جتنی توجہ چاہئے نہیں کی ہے۔ اور اس لحاظ سے کچھ یہ واقعہ بھی ہے۔

نہ سوچنے والوں میں یہ یا کچھ اسی قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں۔ اسی کے مقابلہ میں ایک طبقہ بے باکوں کا بھی ہے جو قرآنی آیات کی تشریح و توجیہ میں نہ اس ماحول ہی کو اپنے سامنے رکھنا چاہتا ہے جس میں قرآن نازل ہوا تھا یا جن بزرگوں کو اپنا مخاطب قرآن نے پہلی دفعہ بنایا تھا (یعنی صحابۂ کرام) قرآنی آیات کے متعلق اُن کے تأثرات کی وہ پروا نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ شوریدہ سری میں عقل باختوں کا یہ گروہ کبھی کبھی ترقی کر کے اس حد تک آپہنچا ہے کہ عربی لغت، اور الفاظ کے لغوی معانی کی رعایت سے بھی اس راہ میں اگر ضرورت ہوئی ہے تو آزاد ہو گیا ہے۔

آج ہی نہیں، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں اس قسم کی ناہمواریوں کا مشاہدہ قرآنی آیات کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ "اتقان" میں سیوطی نے

---

[۵] امام رازی کی تفسیر کے متعلق میرا ہی نہیں عموماً اہلِ بصیرت کا خیال یہی ہے کہ اس فقرے کو مشہور کر کے امام پر اور امام کی کتاب پر ظلم بے جا کیا گیا ہے۔ لیکن منہ سے جو بات نکل جاتی ہے اپنی قیمت وہ کبھی نہ کبھی حاصل ہی کر لیتی ہے۔ ہمارے زمانہ میں مصر کے ایک صاحب جو علامہ طنطاوی کے نام سے مشہور ہیں، شاید پچیس ضخیم جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ عنوان تو کتاب کا یہی ہے کہ "قرآن کی یہ تفسیر ہے"۔ لیکن مطالعہ بعد یہ کہنا پڑیگا کہ "فیہ کل شیٔ الا التفسیر" کا صحیح مصداق اگر کوئی تفسیر ہو سکتی ہے تو طنطاوی صاحب ہی کی یہ تفسیر ہے۔ خدا جانے سیکڑوں سال پہلے خواہ مخواہ امام رازی کی تفسیر کے متعلق اس فقرے کو کس نے استعمال کر دیا تھا لیکن غلط بات اچانک صحیح ہو گئی۔ اور اس کو حقیقی مصداق اپنا مل گیا ۱۲۔

نقل کیا ہے کہ "لیطمئن قلبی" میں "قلبی" کے لفظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایک دوست کی طرف اشارہ کیا تھا جس کا نام "قلبی" تھا۔ مقصد یہ تھا کہ میں تو مطمئن ہوں۔ لیکن میرا دوست قلبی مرنے کے بعد جی اٹھنے کے مسئلہ میں چونکہ متردد ہے اس کی تسکین خاطر کے لئے بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ:۔

رب ارنی کیف تحیی الموتیٰ — اے میرے پروردگار! دکھلا دے مجھ کو مُردے کو تو کیسے زندہ کرے گا

کی استدعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوئی تھی۔

اسی طرح بعضوں کا قول تھا کہ میتہ لحم خنزیر وغیرہ بعض مردوں اور عورتوں کے نام ہیں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ ان سے ملنے جلنے میں پرہیز کریں۔ اور ان حماقتوں کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔ بقول ابو مسلم اصفہانی ان اقوال کا ذکر صرف اس لئے کرنا چاہیئے۔

ان یعلم ان فیمن یدعی العلم — تاکہ معلوم ہو کہ علم کے دعویٰ کرنے والوں میں

حمقی (اتقان صفحہ ۱۸۵ حصہ دوم) — احمقوں کی کمی نہیں ہے۔

اور ان حماقتوں کا تعلق تو "قدیم علم" یا "دانش پارینہ" سے تھا۔ اس کے مقابلہ میں "دانشِ نو" کی بوالعجبیوں کا جو طوفان عہدِ حاضر میں امنڈ آیا ہے اس کا نہ اور ہے اور نہ چھور۔

بھلا اس دعویٰ کے ساتھ کہ قرآن میں نہ غلامی کا ذکر ہے اور نہ تعددِ ازدواج کے قانون کا۔ نہ معجزوں کا۔ نہ کراماتوں کا۔ نہ فرشتوں کا۔ نہ جنوں کا۔ نہ جنت کا اور نہ دوزخ کا اور نہ جنت کی حور کا۔ نہ قصور کا۔ نہ اس کے اشجار کا۔ نہ انہار کا۔ نہ دوزخ کی نار کا۔ نہ اس کے ملائکہ غلاظ شداد کا۔ نہ اس کے زقوم کا۔ نہ غسلین کا۔

الغرض قرآن میں جو کچھ ہے وہی سب کچھ قرآن میں نہیں ہے۔

اس عجیب و غریب ادّعا کے ساتھ قرآنی الفاظ کی تشریح و توجیہ میں جن طلسماتی نیرنگیوں کے تماشے سامنے آسکتے ہیں اور لفظوں کے ساتھ ساحرانہ کھیل کھیلے جاسکتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہر صاحبِ عقل و شعور کرسکتا ہے۔ یہ صرف احتمال نہیں ہے۔ بلکہ یہی کرکے دکھایا گیا ہے۔ اور قرآن کے ساتھ ان بدبختانہ بازیگریوں کا سلسلہ ابتک جاری ہے۔ عربی زبان کی ایک سطر بھی صحیح طریقہ سے جو پڑھ نہیں سکتے ہیں وہی قرآن کے اردو ترجموں کی مدد سے ان ہی ناقابلِ عفو گستاخیوں پر کوتاہ نصیبوں کا یہ گروہ جری ہوگیا ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اپنے ان مذبوحی حرکات پر داد کا بھی طالب ہے آج ان ہی مجرمانہ جسارتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ جس مطلب اور مقصد کو بھی چاہا جاتا ہے۔ قرآن اور قرآنی الفاظ پر اسے تھوپ دیا جاتا ہے۔

بہرحال یہ بھی ہو رہا ہے اور وہ بھی ہو رہا ہے ایک طرف اس پر اصرار ہے کہ روایت کے بغیر کسی آیت کے مطلب کا بیان کرنا جہنم کو اپنا ٹھکانا بنانا ہے روایت کسی درجہ کی ہو، صحیح ہو، حسن ہو، ضعیف ہو، ضعف میں اس کا حال جو کچھ بھی ہو۔ لیکن صحیح تفسیر وہی ہے۔ اور قابلِ اعتماد مفسر وہی ہے جو ان روایتوں ہی کی روشنی میں قرآنی آیتوں کے مطلب اور منشا کو متعین کرتا ہو۔ دوسری طرف آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنے جس وسوسہ اور وہم کو جس کا جی چاہے قرآن کی طرف منسوب کردے۔ بقول اکبر مرحوم۔

مجھے تفسیر بھی آتی ہے، اپنا مدعا کہئے

اسی کو بنانے والوں نے اپنا علمی پیشہ اور ذہنی مشغلہ بنا رکھا ہے۔

بجنسہ پوری تقریر تو محفوظ نہیں ہے۔ لیکن مطلب شاہ صاحب کا یہی تھا کہ مسلمانوں میں نسلاً بعد نسل، لفاً عن خلف جن حقائق سے اسلامی دین کی تعمیر و تقویم ہوئی ہے، جن کے بغیر اسلام کا تصور مسلمان تو مسلمان شاید کوئی لکھا پڑھا، غیر مسلم بھی نہیں کر سکتا یعنی دین کی ضروریات میں جو چیزیں شمار ہوتی ہیں۔ اول سے آخر تک بغیر کسی اختلاف کے اسلام کی جو جانی پہچانی باتیں ہیں۔ ان سے ہٹ کر قرآنی آیات کی توضیح و تشریح کی جرأت، ایمان سوز جرأت ہے۔ گویا فقیر اپنی خاص اصطلاح میں "البینات" سے جن کی تعبیر کرتا ہے۔ دین کے ان بنیاتی مسلمات پر جس تفسیر سے زد پڑتی ہو، قرآنی آیتوں کی جس تاویل سے مذہب کا یہ غیر مشتبہ حصہ متاثر ہوتا ہو۔ تفسیر و تاویل کی یہی وہ قسم ہے جسے شاہ صاحبؒ "تاویل بالرائے" قرار دیتے تھے[۱۵]۔

لیکن یہ بات کہ قرآن کی کسی آیت کا کوئی مطلب تفسیری روایتوں کی پشت پناہی کے بغیر بیان کرنا ہر حال میں "تفسیر بالرائے" ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ قرآن کی تشریح و تاویل اپنے من مانے خیالات کے زیر اثر کر رہا ہے جہاں تک میں جانتا ہوں حضرت شاہ صاحبؒ شدت کے ساتھ اس کی بھی تردید فرمایا کرتے تھے۔ ان سے زیادہ باخبر

---

[۱۵] بخاری کی املائی شرح میں اور شاہ صاحب کی دوسری تحریروں میں لوگ ان کے اس اجمالی دعوی کی تفصیل پڑھ سکتے ہیں۔ مثلاً بخاری کی شرح میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے فاذا اوجب تغیر المسألة المتواترة او تبدیل عقیدة مجمع علیها فذلک هو التفسیر بالرائے وهذا الذی یستوجب صاحبه النار (یعنی متواتر مسئلہ دین کا جس تفسیر سے ادلتا بدلتا ہو یا مسلمانوں کا جو اجماعی عقیدہ ہو اس میں تبدیلی پیدا ہوتی ہو۔ یہی ہے درحقیقت تفسیر بالرائے۔ جس کا مرتکب جہنم کا حقدار بن جاتا ہے) فیض الباری شرح بخاری ص۱۵۱ ج ۴۔

اس حقیقت سے اور کون ہو سکتا تھا کہ تفسیر کی کتابوں میں جن روایتوں کا لوگ ذکر کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ اکثر و بیشتر حصہ ان کا ایسا ہے جس کی اصل نہیں ہے۔

سیوطی نے اتقان میں امام کے اس قول کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

قال احمد ثلاثة کتب لیس لها اصل التفسیر والملاحم والمغازی (ص ۱۷۸ ج ۲)	تین کتابیں روایتوں کی ایسی ہیں جن کی اصل نہیں ہے۔ ایک تفسیر دوسرے ملاحم (آئندہ پیش آنیوالی جنگیں اور فتنے) اور جنگی سرگرمیاں عہد نبوت میں جو پیش آئے ان کے متعلق قصّے جن کو المغازی کہتے ہیں۔

پھر خود بھی سیوطی نے اپنی طرف سے اس دعوے کو پیش کیا ہے کہ:۔

الصحیح من ذلک قلیل جدا بل اصل المرفوع منه فی غایة القلة (ص ۱۷۸ ج ۲)	ایسی روایتیں جو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحت کے ساتھ منسوب ہوں، تفسیر کے متعلق بہت ہی کم ہیں۔

یہ حال تو ان روایتوں کا ہے جن کو اصطلاحاً مرفوع حدیثوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ باقی رہے صحابۂ کرام کے تفسیری اقوال سو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس باب میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ لیکن جو ذخیرہ اس سلسلے میں ان کی طرف منسوب ہے خود سیوطی نے بھی اسی کے متعلق علماء کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ:۔

وهذه التفاسیر الطوال التی اسندوها الی ابن عباس غیر مرضیة ورواتها مجاهیل (ص ۱۸۸ ج ۲)	یہ لمبی لمبی تفسیری روایتیں جو ابن عباس کی طرف منسوب ہیں سنداً ناپسندیدہ ہیں ان کے روایت کرنیوالے نامعلوم اشخاص ہیں۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس کی طرف منسوب تفسیری اقوال کا جب جائزہ لیا

لیا تو اس نتیجہ تک پہونچے کہ:۔

لم یثبت عن ابن عباس فی التفسیر الا شبیہ بمائۃ حدیث ص۱۵۵۔	تقریباً سو روایتوں کے سوا ابن عباس کی طرف منسوبہ اقوال صحیح ثابت نہیں ہوئے۔

جس کی ایک کھلی دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حدیثوں کا سب سے زیادہ معتبر اور صحیح مجموعہ یعنی صحیح بخاری میں تفسیری روایات کا سرمایہ شاید تمام دوسرے ابواب سے مقابلہ میں سب سے زیادہ کم ہے۔ امام بخاری نے بجائے روایتوں کے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح پر زیادہ توجہ کی ہے۔ اور وہ بھی بقول شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا کہ "فیض الباری" میں بھی نقل کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اس راز کو واضح کیا ہے کہ "ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ" کی کتاب "مجاز القرآن" پر امام نے زیادہ بھروسہ کیا ہے۔ شاہ صاحب کا خیال تھا کہ:۔

لم یعرج الی النقد اصلا	امام بخاری نے معمر بن المثنیٰ ہی کے اقوال تنقید کے بغیر اپنی کتاب میں نقل کر دیئے ہیں۔

اسی لئے ابن المثنیٰ کی کتاب میں جو نقائص پائے جاتے تھے وہی کوتاہیاں صحیح بخاری کی "کتاب التفسیر" میں باقی رہ گئی ہیں۔ یہ نکتہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔

شاہ صاحب فرماتے تھے کہ صحیح بخاری میں جو تفسیری اقوال پائے جاتے ہیں، ان کے متعلق یہ سمجھنا مناسب نہ ہوگا کہ یہی امام بخاری کا فیصلہ بھی ہے۔ بلکہ اس باب میں ان کی حیثیت صرف ایک ناقل کی ہے۔[۵۱]

---

[۵۱] مناسب ہوگا کہ ان تفصیلات کے لئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہذا کی طرف بھی مراجعت کی جائے۔ خصوصاً قادیانیوں کے رد میں جو کتابیں حضرت والا نے لکھی ہیں صحیح بخاری کی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

کچھ بھی ہو، کم از کم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جب یہ مانا جاتا ہے کہ ضعاف وحسان ہی نہیں بلکہ خبرِ واحد خواہ محدثین کی اصطلاح کی رو سے مرفوع و متصل صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ باوجود اس کے قرآنی نصوص میں کسی ترمیم کو احاد خبروں کی روشنی میں امام صاحب جائز نہیں سمجھتے تھے۔

اصول فقہ کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں ان کے اسی فیصلہ کی تعبیر یہ کی گئی ہے کہ کتاب میں زیادۃ خبر واحد سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد بھلا یہ کون کہہ سکتا ہے کہ روایتوں کی دستگیری کے بغیر قرآنی آیات کے مطالب کے سمجھنے اور سمجھانے کی اجازت ہی نہیں دی جا سکتی۔ کتنی عجیب بات ہے، قرآنی نصوص قطعیت اور تعین آفرینی کے جس زور اور قوت کے حامل ہیں، واحد خبروں سے ان کے سمجھنے میں مدد لینے کے بعد ان کا یہ زور اور ان کی یہ قوت کیا باقی رہ سکتی ہے؟ واحد خبروں کا مفاد بہرحال ظنی ہے ظاہر ہے کہ یہی مظنونیت کی صفت نصوص قرآن کی طرف بھی منتقل ہو جائے گی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اگر خبر احاد سے کتاب پر زیادت کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ تو بتایا جائے کہ یقین آفرینی اور قطعی سکون بخشی کی طاقت جو قرآنی آیات میں پائی جاتی ہے اس کی حفاظت کی دوسری شکل ہی کیا تھی؟ مگر افسوس ہے کہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کی نظر کی بلندی کا صحیح اندازہ لوگوں کو نہ ہوا۔ بلکہ برعکس اس کے بھی یہی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) املائی شرح ص۳۶۲ میں بھی ان کے خیالات کا کچھ خلاصہ مل جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ابوعبیدہ کے لفظ سے کہیں دھوکہ نہ ہو۔ یہی کنیت مشہور محدث قاسم بن سلام کی بھی تھی جن کی کتاب "الاموال" حال میں شائع ہوئی ہے اور غیر معمولی قیمتی معلومات سے مالا مال ہے۔ بلکہ یہ ابو عبیدہ "مجاز القرآن" کا مصنف دوسرا آدمی ہے۔ اس کا نام معمر بن المثنیٰ تھا ۱۲

پھیلا دیا گیا کہ قرآنی نصوص کے مطالب کو بجائے روایات کے صرف قرآنی الفاظ ہی سے سمجھنے کی جو کوشش کرے گا، یا دوسرے کو سمجھائے گا وہ تفسیر بالرائے کے جرم کا مجرم اور دوزخی ہے۔

خدا جزائے خیر دے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تفسیر بالرائے کے اس غلط مطلب کا اپنے درس میں ازالہ فرماتے رہتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کا یہ فیصلہ بخاری کی املائی تقریر میں بھی درج کر دیا گیا ہے۔ ان کی طرف آخر میں یہ فقرے بھی اسی کتاب میں منسوب کئے گئے ہیں کہ فرمایا کرتے تھے۔

ومن حجر علی العلماء ان لا یبرزوا یبرز معانی الکتب بعد الامعان فی السباق والسیاق والنظر الی حقائق الالفاظ المراعیۃ لعقائد السلف۔

کس نے اہل علم کو روکا ہے اس بات سے کہ کتاب اللہ کے معانی اور مطالب کو آیات کے سیاق وسباق اور الفاظ کے اقتضاء کے مطابق جس میں سلف صالح کے عقیدے کی بھی رعایت کی گئی ہو۔ ان امور کو پیش نظر رکھ کر نہ ظاہر کریں۔

آگے اس کے بعد اسی میں یہ بھی ہے کہ:۔

بل ذلک حظھم من الکتاب فانھم ھم الذین ینظرون فی عجائبہ ویکشفون الاستار عن وجوہ دقائقہ ویرفعون الحجب عن خبیات حقائقہ

بلکہ اللہ کی کتاب میں اہلِ علم کا واقعی حصہ یہی ہے وہ اس کتاب کے نت نئے پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور اس کے پوشیدہ اسرار سے نقاب الٹتے ہیں۔ جو باتیں چھپی ہوئی ہیں انھیں نمایاں کرتے ہیں۔ اگر یہی تفسیر بالرائے ہے۔ تو اہلِ علم کا یہی حصہ ہے۔

فهذا النوع من التفسير بالرائے حظ اولی العلم ونصیب العلماء المستنبطین۔	اور قرآنی آیات سے نتائج پیدا کرنے والے صاحبان آگہی کی خوراک یہی ہے

آخر میں اسی کے ساتھ اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے تھے۔

واما من تکلم فیه بدون صحة الادوات لاعنده علم من کلام السلف والخلف ولاله ذوق بالعربیة وکان من اجلاف الناس لم یحمله علی تفسیر کتاب الله غیر الوقاحة وقلة العلم فعلیه الاسف کل الاسف وذلك الذی یستحق النار۔	مگر قرآنی مطالب سے صحیح واقفیت کیلئے جن قدرتی اسباب وذرائع کی ضرورت ہے جو ان سے تہی دامن ہو۔ اس کے پاس اگلوں اور پچھلوں کے اقوال کا علم نہ ہو اور عربی ادب کا ذوق رکھتا ہو۔ اس قسم کے کمینے آدمیوں میں قرآن کی تفسیر کی جسارت محض بے شرمی اور بے حیائی اور جہالت ہی کیوجہ سے ہو سکتی ہے ان پر افسوس صد افسوس بیشک یہی لوگ جہنم کے مستحق ہیں۔

سمٹنا چاہتا ہوں۔ مگر پھیل جاتا ہوں۔ سیدنا الامام الکشمیری قدس اللہ سرہٗ سے میرے غیر معمولی تاثرات کا یہ شاید شعوری یا غیر شعوری نتیجہ ہے۔ سمجھتا ہوں کہ ان کے متعلق باتیں ختم ہو گئیں کہ ذاکرہ کسی نئی چیز کو سامنے پیش کر دیتا ہے۔ ایسی نئی چیز کہ دل اس کے چھوڑ دینے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ ناظرین شائد تھک چکے ہوں گے دل پر جبر کر کے اپنے محبوب ومرحوم استاذ کے ذکر کو ختم کرتا ہوں۔

آپ انصاف کیجئے، اپنے حقیر وفقیر، جہول وظلوم ادنیٰ ترین شاگرد کی حوصلہ افزائیوں میں جس کا یہ حال ہو کہ دار العلوم دیوبند میں طالب العلمی کی زندگی ختم کرنیکے

بعد کچھ دنوں خاکسار القاسم و الرشید نامی ماہواری پرچوں کی ادارت کے ساتھ کچھ درسی و تدریسی وغیرہ کے خدمات حسب انجام دے رہا تھا۔ لیکن تنخواہ جو مدرسہ سے ملتی تھی ضروریات کے لئے کافی نہ تھی۔ رخصت لے کر مکان آگیا۔ اور دار العلوم کے مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ اطلاع دینے پر مجبور ہوا کہ "موجودہ تنخواہ پر کام کرنا اپنے حالات کے لحاظ سے خاکسار کے لئے دشوار ہے۔" یہ درخواست جب پہنچی اس کا اثر اور انجام کیا ہوا اس کو تو چھوڑئیے۔ کہنا یہ ہے کہ بعد کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے جب نیاز حاصل ہوا تو براہِ راست ان سے یہ سن کر ششدر و حیران ہو گیا۔ فرمانے لگے کہ:۔

> "بھائی! مولانا انور شاہ صاحب تم سے تو غیر معمولی طور پر متأثر نظر آتے ہیں۔ تمہاری وہ درخواست جب پہونچی تو میں نے شاہ صاحب سے اس مسئلہ میں مشورہ لیا۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ آپ کے یہاں جتنے کام کرنے والے ہیں ان کو دیکھتا ہوں کہ جو درس دیتے ہیں وہ تحریر کا کام نہیں کرتے۔ یا نہیں کر سکتے۔ جو تحریری سلیقہ رکھتے ہیں ان سے آپ تقریر و وعظ کا کام نہیں لے سکتے۔ الغرض ان تین شعبوں یعنی درس و تحریر و تقریر کے لئے اسی وجہ سے آپ کو الگ الگ آدمی رکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس غریب سے رسالہ کی ادارت و تحریر کا کام بھی آپ لیتے رہے۔ درس و تدریس کا کام بھی اس کے سپرد کرتے رہے جہاں سے طلبی آئی وعظ و تقریر کے لئے بھی بھیجتے رہے۔ گویا ان تینوں شعبوں کا کام حسب دلخواہ وہ تنہا انجام دیتا رہا۔ اب اگر ان تینوں مدوں کے سلسلہ میں ایک ایک آدمی کی تنخواہ اسے دی جائے تو شائد اس کا یہ ناجائز مطالبہ نہ ہوگا۔"

سفارش کی اس تحلیلی ترکیب کا خطرہ خود میرے دل میں بھی نہیں گذرا تھا۔

بہرحال الفاظ تو بجنسہٖ یاد نہ رہے مفہوم یہی تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے ان الفاظ کو جس وقت میرے کان سُن رہے تھے۔ آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا خیال آیا۔

اُف زنگی کو اس کا آقا کافور ٹھیرا رہا تھا۔ حالانکہ پہلے بھی زنگی ہے اور بعد کو بھی زنگی۔ اس وقت تک زنگی ہونے کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے۔ سوچتا ہوں استاذ مرحوم کی قدر شناسیوں کا دھیان آتا ہے دل کہتا ہے ع

بریں قول گر جاں ببازم رواست

علم و معرفت کا احتساب ایک ذرہ کو چمکا رہا تھا۔ حالانکہ ذرہ کے پاس تھا بھی کیا اور جو کچھ تھا سب آفتاب کا تھا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کی بعض خصوصی عنایات و نوازشوں کا سلسلہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے آخر وقت تک جاری رہا۔ اس زمانہ میں بھی جب دائرۂ اہتمام اور حضرت شاہ صاحب میں شکر رنجیوں کی صورتیں پیش آگئیں یعنی دارالعلوم دیوبند کی تاریخی زندگی کا وہی شہر جس سے گجرات کے مشہور دارالعلوم ڈابھیل کا جزء پیدا ہوا۔ اس زمانے میں بھی جب خاکسار حیدرآباد میں تھا۔ اور کش مکش کی ان صورتوں پر حیدرآباد کا دباؤ بھی پڑ رہا تھا یا چاہا جاتا تھا کہ حیدرآباد کی حکومت بھی اپنا اثر اس پر ڈالے۔ اس زمانہ میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا۔ اور شاید مشہور بھی کر دیا گیا تھا کہ اس دباؤ میں بجائے شاہ صاحب کی جماعت کے فقیر دائرۂ اہتمام کے بزرگوں کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ مجھ تک بھی اس قسم کی بدگمانیوں کی خبریں پہونچائی جا رہی تھیں حضرت

شاہ صاحب کے قلب مبارک کی گرانی کا خیال مجھے بےچین کئے ہوئے تھا کہ عین انھیں دنوں میں قطعاً خلاف دستور اپنے دستخط خاص سے ایک رجسٹرڈ والا نامہ حضرت شاہ صاحب کا اس فقیر کے نام شرف صدور لایا۔ تھرّاتے ہوئے مرتعش ہاتھوں لرزتی ہوئی اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس گرامی نامہ کو کھولا پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ اللہ اللہ سنانیوالے مجھے کیا کیا سناتے رہے اور آنکھیں آج کیا دیکھ رہی ہیں، مودّت و محبت، سرفرازی و محبت بیکراں کے سوا اس میں اور کچھ نہ تھا ایک خاص خدمت کیلئے اس ذرۂ ناچیز کا انتخاب فرمایا گیا تھا۔

حیران تھا کہ ہزار ہزار تلامذہ جسکے اقطار ہند بلکہ اسلامی دنیا کے کناروں میں پھیلے ہوئے ہیں اسی کے حافظہ میں مجھ جیسے کس مپرس ہیچمداں، طالب الدنیا کا خیال اور وہ بھی اتنی خصوصیتوں کیساتھ کیسے باقی تھا۔ افسوس ہے کہ بخت کی تہی دستی اور مزاج کے لاابالی پن کیوجہ سے اس والانامہ کی حفاظت میں کامیاب نہو سکا۔ ورنہ آج جس حالمیں ہوں شاید وصیت کرتا کہ میرے کفن کیساتھ اسکو میرے ساتھ دفن کر دیا جائے تاہم امید ہے کہ اس میں جو "راز" تھا انشاء اللہ وہ اپنے ساتھ ہی دفن ہوگا۔

بہرحال حضرت شاہ صاحب کے ظلِ عاطفت و سایۂ عافیت میں رہنے کا موقع اگرچہ دو ڈھائی سال سے زیادہ اس فقیر کو نہیں ملا ہے۔ لیکن اب میں کیا کروں کہ جن صحبتوں میں قرنہا قرن گذرے انکی یاد پیرانہ سری کے ان ایام میں تقریباً کچھ مٹ ہی سی گئی ہے۔ لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ دو ڈھائی سال کی ان متبرک علم ریز، معارف بیز، محبت خیز ایام کی ایک ایک بات دماغ میں کیوں تر و تازہ ہے۔ اسی لئے سچ پوچھئے تو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتا تھا اسکا عشر عشیر بھی نہ کہہ سکا۔ لیکن پڑھنے والوں کے نفسیات کا خیال کر کے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب دوسرے اساتذۂ کرام کے متعلق ارتسامی تاثرات کو پیش کروں۔ واللہ ولی الامر والتوفیق۔

حضرت الاستاذ محدث کشمیریؒ

از جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامع اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی فضلنا علےٰ کثیر من عبادہ المومنین وجعلنا من ورثۃ الانبیاء والمرسلین - والصلوٰۃ والسلام علےٰ سیدنا ومولانا محمد خاتم الانبیاء وسید الاولین والآخرین وعلیٰ آلہ واصحابہ الاکرمین - وعلینا معھم یا ارحم الراحمین امین یارب العالمین -

اما بعد

ہمارے مولائے برحق، اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے قرآن کریم میں جابجا علماء اور صلحاء کے فضائل اور مناقب اور واقعات بیان فرمائے - اور جابجا اپنے عباد صالحین اور علماء ربانیین کے تذکرہ کا حکم دیا - اور اذکر عبادنا ابراھیم واسحاق ویعقوب الآیۃ ___ واذکر فی الکتاب اسمعیل واذکر فی الکتاب موسیٰ اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں اپنے پاک بندوں کے تذکرہ کا حکم دیا - تاکہ موجب تذکر ہو - اور :-

فاقصص القصص لعلھم یتفکرون میں قصوں کے بیان کرنیکا حکم دیا تاکہ موجب تفکر ہو -

اور سورۂ لقمان جو کہ ایک عالم ربانی کے تذکرہ میں نازل ہوئی وہ اسی عالم کے نام سے موسوم ہوئی جس میں حق جل شانہ نے اُس حکیم ربانی کی پند و نصائح کا تذکرہ فرمایا اور سورۂ کہف میں خلوت گزینوں اور گوشہ نشینوں اور دنیا سے بھاگ کر پہاڑوں اور غاروں میں ٹھکانا ڈھونڈنے والی ایک جماعت کا قصہ بیان فرمایا اور اُن کی کرامتیں ذکر فرمائیں۔

سبحان اللہ خود ہی علم و حکمت عطا فرمایا اور خود ہی کرامتوں سے سرفراز فرمایا اور پھر خود ہی اُن کا ذکر فرماتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ علماء اور صلحاء کا ذکر سنتِ الٰہی ہے جو صد ہزار انوار و برکات کا موجب ہے۔ اور کیوں نہ ہو، علماء، انبیاء کرام کی وارث ہیں اور انبیاء کرام خداوند ذوالجلال والاکرام کے خلفاء ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ کے علوم اور احکام اوّلاً انبیاءِ کرام پر نازل ہوئے۔ اور پھر حضرات انبیاءِ کرام کے صدقہ اور طفیل سے علماء کے سینوں میں منتقل ہوئے اور پھر علماء کے واسطہ سے عوام تک پہونچے۔ اس لئے عوام پر علماء کا حق ہے کہ اُن کا تذکرہ کریں کہ جن کے ذریعہ سے اُن تک خدا کے علوم اور احکام پہونچے۔ اگر علماء نہ ہوتے تو ہم کو انبیاءِ کرام کا دین اور شریعت کون سمجھاتا۔ اور اگر حضرات انبیاء و مرسلین نہ ہوتے تو خدائے تعالیٰ کی راہ ہم کو کون دکھلاتا۔ صلوات اللہ وسلامہ علیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ علی العلماء الربانیین الیٰ یوم الدین

انھیں علماء ربانیین میں سے ہمارے شیخ اکبر حضرت مولانا الشاہ السید محمد انور کشمیری قدس اللہ سرہٗ ہیں جن کا مختصر تذکرہ اس وقت پیش نظر ہے۔ حافظ ابوعمرو بن صلاح مقدمۂ اصول حدیث میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

عند ذکر الصالحین تنزل الرحمۃ صالحین کے ذکر اور تذکرہ کیوقت اللہ تعالےٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔

یہ اس ناچیز کا گمان اور امید ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ بھی انشاء اللہ ثم انشاء اللہ انھیں علماء صالحین میں سے ہیں جن کے تذکرہ سے نزول رحمتِ خداوندی کی توقع اور امید کی جاسکتی ہے۔ اور حدیث قدسی میں ہے انا عند ظن عبدی بی۔ خصوصًا جب کہ وہ تذکرہ شیخ کے افاداتِ علمیہ اور حقائق ومعارف کو بھی ساتھ لئے ہوئے ہو تو علاوہ رحمت وبرکت کے زیادتی علم کا بھی موجب ہوگا جو حسب ارشاد باری۔ رب زدنی علما۔ مطلوب اور محبوب ہے جی چاہتا ہے کہ لکھوں مگر قلت فرصت اور ضعف ونقاہت اور مشاغل کی کثرت مانع ہے۔ خیر مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔ جو کچھ یاد آتا ہے وہ مختصراً ہدیۂ احباب کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ اور بارگاہِ خداوندی میں ملتجی ہوں کہ اے پروردگار یہ تیرا وعدہ حق ہے۔ والحقنا بھم ذریتھم کہ ہم اولاد اور ذریت کو اُن کے آباء صالحین کے ساتھ ملحق فرمائیں گے۔

اے پروردگار تیرے کلام پاک میں ذریت کا لفظ عام ہے۔ ذریت خواہ روحانی ہو یا جسمانی سب کے لئے الحاق کا وعدہ ہے۔ اگر اس نابکار وناہنجار کو بھی اس وعدہ میں شامل فرمالیا جائے تو تیری رحمت سے کوئی بعید نہیں جس طرح تو نے محض اپنی رحمت سے علم کا انعام فرمایا۔ اسی طرح محض اپنی رحمت سے الحاق بالصالحین کے انعام سے بھی سرفراز فرما۔ یا فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین۔ آمین یارب العلمین

سلسلۂ نسب

استاذنا و قدوتنا حضرت مولانا الشاہ السید محمد انور الکشمیری ثم الدیوبندیؒ۔ ابن شیخ معظم شاہ بن شاہ عبد الکبیر بن شاہ عبد الخالق بن شاہ محمد اکبر بن شاہ محمد عارف بن شاہ محمد حیدر بن شاہ علی کشمیری رحمہم اللہ تعالیٰ

حضرت استاذؒ خاندانِ سادات سے تھے۔ اصل آبائی وطن بغداد تھا۔ تقریباً دو صد سال پیشتر یہ مبارک خاندان بغداد سے ہندوستان آیا۔ اور اولاً شہر ملتان میں فروکش ہوا۔ اور پھر ملتان سے لاہور اور پھر لاہور سے کشمیر منتقل ہوا۔ اور کشمیر جنت نظیر کو وطن اور جائے سکونت بنایا۔

ولادت اور تعلیم و تربیت

۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ یوم شنبہ بوقت صبح مقام دُودُوان علاقہ لولاب میں ولادت ہوئی۔ والد مرحوم کی تربیت میں نشو و نما ہوا۔ اول قرآن کریم پڑھا اور پھر فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں۔ اور کشمیر اور ہزارہ کے علماء اور فضلاء سے استفادہ کیا۔ فارسی اور عربی کی نثر اور نظم میں مہارت حاصل ہوئی۔

دار العلوم دیوبند کیلئے شدِّ رحال

جب کشمیر اور ہزارہ کے علماء اور فضلاء کے استفادہ سے فراغت حاصل ہوئی تو بغرض تکمیل دار العلوم دیوبند کا قصد فرمایا۔ جو ہندوستان کے برِ اعظم میں علوم دینیہ کا ایک مرکز اور چشمۂ جاریہ ہے۔ اس وقت اس مبارک درسگاہ کے صدر مدرس۔ محدث العصر قطب دھر، شیخ زمن حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس اللہ سرہٗ تھے۔ جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانیٔ دار العلوم دیوبند۔ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے شاگرد خاص اور جانشین با اختصاص تھے

اور علم حدیث میں مرجع خلائق تھے۔ نورِ علم اور نورِ تقوےٰ چہرے سے نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ اُن کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور علم حدیث اُن سے پڑھا۔

حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس اللہ سرہٗ اپنے زمانہ میں علم اور ورع کے لحاظ سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا نمونہ تھے۔ حدیث کے پروانے آپ کے گرد جمع تھے۔ آپ کے بے شمار شاگردوں میں حضرت مولانا السید انور شاہ امام بخاریؒ کا نمونہ تھے۔ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ امام مسلمؒ کا نمونہ تھے۔ اور حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ ابوداؤدؒ کا نمونہ تھے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ نے جب ہندوستان سے حرمین محترمین کا قصد فرمایا تو صحیح بخاری کا درس مولانا انور شاہ کے سپرد فرمایا اور صحیح مسلم مولانا شبیر احمد عثمانی کے اور سنن ابی داؤد مولانا سید اصغر حسین صاحب کے سپرد فرمائی۔ چنانچہ یہ تینوں حضرات ساری عمر یہی تین کتابیں پڑھاتے گذر گئے جو ان کے امام احمد ان کے سپرد کر گئے تھے۔ آج ہندستان کی سرزمین میں صدہا جگہ بخاری اور مسلم اور ابوداؤد کے درس جاری ہیں۔ جن کے درس دینے والے شیخ الہندؒ کے خدام اور خدام الخدام ہیں۔ لیکن ان اسباقِ ثلاثہ کی خصوصی تقسیم کی خصوصیت سوائے ان حضرات ثلاثہ کے اور کسی کو حاصل نہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کی قائم مقامی

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت مولانا سید انور شاہ باضابطہ دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی کے سبق حضرت شاہ صاحب کے لئے مخصوص ہوئے۔ اور صحیح مسلم حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے لئے مخصوص ہوئی۔

ان دونوں حضرات کا وجود دار العلوم میں ایک عجیب شان رکھتا تھا۔ حضرت مولانا سید انور شاہؒ علم کے بحر ذخار تھے۔ مگر زبان میں کچھ لکنت تھی اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نہایت فصیح اللسان تھے۔ گویا کہ حضرت شاہ صاحبؒ شانِ موسوی کا ایک پرتو تھے۔ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی شانِ ہارونی کا ایک عکس تھے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل حضرت ہارون علیہ السلام افصح لساناً تھے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اَعلم قلباً تھے اور بلا تشبیہ کے جس طرح حضرتِ ہارون، حضرت موسےٰ کے وزیر اور مشیر تھے، اسی طرح حضرت مولانا عثمانی علم میں۔ حضرت شاہ صاحب کے وزیر اور قائم مقام تھے۔ تمام اہلِ علم کا یہ عقیدہ رہا کہ اگر مولانا سید انور شاہ اپنے زمانہ کے بخاری تھے تو مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے زمانہ کے مسلم تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا نکاح اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی حسن تدبیر

حضرت مولانا انور شاہ صاحب پر شانِ یحیوی کا کچھ عکس اور پرتو پڑا تھا۔ عالمِ شباب گذار کر عالمِ کہولت میں داخل ہو چکے تھے۔ مگر نکاح نہیں فرمایا تھا۔ تجرد اور عزلت کو اپنے لئے پسند فرماتے تھے۔ باوجود محمدی ہونے کے سنّتِ یحیوی کے مطابق حصور اور صالح رہنا چاہتے تھے۔ اور بار بار ارضِ حرم کی طرف ہجرت کا ارادہ فرماتے تھے۔ تاکہ ازدواجی تعلق ان کی راہ میں حائل نہ ہو۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اس وقت دار العلوم دیوبند کے مہتمم ثانی تھے۔ وہ اس ارادہ سے پریشان تھے کہ مبادا اگر یہ آفتاب علم

دیوبند سے ہجرت کر جائے تو فقط دیوبند ہی نہیں سارا ہندوستان ظلمت میں رہ جائے گا۔ اس لئے شاہ صاحب کے روکنے کے لئے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے وہ تدبیر اختیار فرمائی جو اہلِ یمن نے حضرت معمر کے روکنے کیلئے کی تھی۔ معمر بصرہ کے رہنے والے تبع تابعین میں سے ہیں۔ بڑے جلیل القدر عالم اور حافظِ حدیث ہیں۔ سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ اور شعبہ اور عبداللہ بن مبارک جیسے اکابر معمر کے تلامذہ میں سے ہیں:۔

لما دخل معمر الیمن کرھوا	معمر (بصرہ کے رہنے والے تھے) جب یمن میں
ان یخرج من بینھم فقال	داخل ہوئے تو اہل یمن نے یہ گوارا نہ کیا کہ معمر یہاں
رجل قیدوہ فزوجوہ	سے واپس چلے جائیں ایک شخص نے کہا کہ اگر
شرح الامام النواوی علی	انکو روکنا چاہتے ہو تو معمر کو یہاں قید کر لو یعنی
البخاری ص ۶۴ ج ۱	انکا نکاح کر دو۔

حضرت شاہ صاحب کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے یہی کیا کہ حسن تدبیر سے گنگوہ کے سادات میں شاہ صاحب کا نکاح کرا دیا تاکہ معمر کی طرح شاہ صاحب دیوبند میں مقید ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو جزائے خیر دے کہ شاہ صاحب کے وجود مسعود کو اس طرح محفوظ فرمایا۔

علم اور فہم اور حافظہ دنیا کے علم میں خیر و شر۔ محمود و مذموم کی تقسیم ہے مگر آخرت اور دین کے علم میں یہ تقسیم نہیں۔ آخرت اور دینِ خداوندی کا علم۔ خیر ہی خیر اور محمود ہی محمود ہے۔ کتاب و سنت علم دین کے فضائل سے بھرا پڑا ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اول مرتبہ ایمان اور اسلام کا ہے اور اس کے بعد علم دین کا ہے

بندہ کا اولین فرض یہ ہے کہ خداوند ذوالجلال کو ماننے اور پھر اُس کے دین اور اس کے احکام کو جاننے پھر اس علم کے لئے دو قوتیں درکار ہیں۔ ایک قوتِ فہم اور ایک قوتِ حافظہ۔ قوتِ فہم اور خداداد عقل سے خدا کے دین کو سمجھے اور قوتِ حافظہ سے اسکو محفوظ اور یاد رکھے۔

حق جل شانہٗ نے حضرت شاہ صاحبؒ کو ان تینوں نعمتوں سے خاص طور پر سرفراز فرمایا تھا جس کی نظیر اس وقت عالم کے سامنے نہیں۔

علم کی خصوصیت یہ تھی کہ ذخیرۂ روایات اور ائمۂ مذاہب کے نقول اور اقوال ہر وقت پیشِ نظر رہتے تھے۔ جب کوئی عالم کسی مسئلہ میں شاہ صاحبؒ کی طرف مراجعت کرتا تو مسئلہ کا مادہ اس کے سامنے کر دیتے۔ اور اس کے بعد اپنا فیصلہ بھی بتا دیتے کہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں میری رائے یہ ہے۔

بارہا حضرت شاہ صاحبؒ سے کسی مسئلہ کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک ہر مسئلہ طے شدہ ہے۔ اختلاف اقوال کی وجہ سے تذبذب اور تردد نہیں بلکہ راجح اور مرجوح متعین ہے۔

فہم کا یہ حال تھا کہ ہر مسئلہ کا اصل اور اس کا سرا معلوم تھا ــــــ اصل کلی کے بتلا دینے کے بعد یہ تبلا دیتے تھے کہ فلاں فلاں مسئلہ اس اصل پر متفرع ہے اور ان مسائل مختلفہ اور متشتتہ میں مابہ الاشتراک یہ ہے۔ اور مابہ الاختلاف یہ ہے۔ جیسا کہ بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد میں ابن رشد کا طریق ہے۔ یہ طریق نہایت دقیق اور عمیق ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک روایاتِ مختلفہ میں فقہاءِ کرام کا منشاءِ خلاف اور سبب اختلاف معلوم نہ ہو مسئلہ کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی۔

حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لیا اور سُن لیا وہ ضائع ہونے سے محفوظ اور مامون ہوگیا۔ گویا کہ اپنے زمانہ کے زھری تھے۔ امام زھری جب مدینہ منورہ کے بازار سے گذرتے تو کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ میرے کانوں میں جو داخل ہوجاتا ہے وہ نکلتا نہیں۔ اس لئے بازار سے گذرتے وقت کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہوں تاکہ بازار کی یہ خرافات میرے کانوں میں داخل نہ ہوسکیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ درس میں جب مسائل خلافیہ پر کلام فرماتے تو جابجا شیخ ابن ہمام کی تحقیقات کو مع نقض اور ابرام کے ذکر فرماتے۔ ایک مرتبہ بطور تحدیث بالنعمۃ فرمایا کہ میں نے تمام فتح القدیر (آٹھ جلد) کا تقریباً چھبیس ۲۶ روز میں مطالعہ کیا۔ اور اب چھبیس سال گذر گئے اور مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی۔ جو مضمون بیان کروں گا، اگر تم اس کی مراجعت کروگے تو انشاء اللہ تعالیٰ بہت کم تفاوت پاؤگے۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

حالانکہ فتح القدیر نہایت دقیق اور غامض کتاب ہے جو فقہ اور اصول کے دقائق اور غوامض پر خصوصاً اور اصول حدیث کے مشکلات پر عموماً مشتمل ہے۔

ایسی دقیق کتاب کا چھبیس روز میں مطالعہ غیر معمولی فہم اور خداداد نور فراست کی دلیل ہے۔ اور پھر مدۃ العمر اس کا بلا مراجعت استحضار قوۃ حافظہ کے کمال کی دلیل ہے۔

شہادتِ اکابر و علماءِ عصر

حضرت شاہ صاحبؒ کا علم اور حافظہ ایسا خارق عادت اور موجب کرامت تھا کہ جس کو دیکھ کر مخلوق حیران تھی۔ اکابر اور معاصر سب ہی اس کی مدح اور ثنا میں رطب اللسان

تھے۔ اور شاہ صاحب کے وجود کو نعمت عظمیٰ سمجھتے تھے۔

محدّث الہند فقیدِ زمن حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند قدس اللہ سرہٗ جو حضرت شاہ صاحبؒ کے استاذ تھے بسائلِ مشکلہ شاہ صاحب سے دریافت فرمایا کرتے کہ تمہاری اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟

حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ نے اپنی مجلس میں ایک واقعہ امام غزالی کا بیان فرمایا کہ ایک عیسائی فیلسوف نے لکھا ہے کہ اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ غزالی جیسا محقق اور مدقق اسلام کو حق سمجھتا ہے۔ یہ واقعہ بیان کرکے حکیم الامت نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ میرے زمانہ میں مولانا انور شاہ صاحب کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے کہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ جو تحقیق و تدقیق اور حسن بیان میں امام ابو الحسن اشعری کی زبان اور ترجمان تھے۔ وہ شاہ صاحبؒ کے متعلق یہ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح ہماری آنکھوں نے شاہ صاحب کا مثل نہیں دیکھا۔ اسی طرح شاہ صاحب کی آنکھوں نے بھی اپنا مثل نہیں دیکھا۔ اور اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ کیا تم نے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید کو دیکھا؟ اور کیا تو نے حافظ ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے تو میں کہوں گا کہ ہاں میں نے ان کو دیکھا۔ جب شاہ صاحبؒ کو دیکھا تو گویا ان کو دیکھا۔

مولانا شبیر احمد صاحبؒ کا یہ کلمہ وہ کلمہ ہے کہ جو اس سے پہلے امام ابو القاسم قشیری اور پھر امام غزالی اور پھر شیخ تقی الدین ابن دقیق العید کے بارہ میں علماء نے کہا ہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، سابق مہتمم دار العلوم دیوبند

یہ فرمایا کرتے تھے کہ شاہ صاحب سلف صالحین کا نمونہ ہیں اور علم کا ایک چلتا پھرتا کتب خانہ ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک وفد عازمِ سفر ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب بھی تھے تو کسی اخبار میں اس وفد کی خبر شائع ہوئی۔ اور یہ لکھا کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک وفد فلاں جگہ جارہا ہے۔ اور ایک کتب خانہ اس کی ساتھ ہے۔ یعنی حضرت شاہ صاحبؒ اس کی ساتھ ہیں۔

سندِ حدیث

شاہ صاحبؒ حدیث شریف شیخ زمَن حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند سے پڑھی اور اجازت حاصل کی

بعد ازاں جنیدِ عصر، شبلیِ دھر، قطبِ دوران، سید طائفہ مردان حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ سے حدیث کی اجازت لی۔

ان ہر دو حضرات کی اسانید اہلِ علم میں معروف اور متداول ہیں۔ یہ دونوں حضرات شریعت اور طریقت اور علم ظاہری اور باطنی کے مجمع البحرین تھے۔

بعد ازاں ۱۳۲۳ھ میں جب حرمین شریفین کی زیارت کو تشریف لے گئے تو شیخ حسین جسر طرابلسی سے مدینہ منورہ میں حدیث کی اجازت حاصل کی۔

علاوہ ازیں اور بھی دیگر علماء وصلحاء سے سند حاصل کی۔ اور یہ اسانید فیض الباری مؤلفہ محب محترم مولانا الحاج مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی اطال اللہ بقاءہ میں مذکور ہیں۔

حسن صورت اور حسن سیرت اور نورِ تقوےٰ

حق تعالیٰ نے شاہ صاحبؒ کو علم وفضل کے ساتھ حسن صورت اور حسن سیرت سے مُحَسَّن اور نور تقویٰ سے بھی مُزَیَّن فرمایا تھا۔ انور شاہ اسم بامسمیٰ تھا۔

انور اسم تفضیل کا صیغہ ہے کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے تفضیل کے حامل تھے کمیت سے مراد نور علم اور نورِ تقویٰ اور نور صورت اور نورِ سیرت۔ یعنی نور کے یہ انواع واقسام مراد ہیں۔ اور کیفیت سے نفسِ علم مراد ہے۔ اس لئے کہ علم مقولۂ کیف سے ہے۔ امام مالکؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ علم کثرت روایت کا نام نہیں۔ علم ایک نورِ خداوندی ہے جس کے دل میں چاہتا ہے اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔

علماء اور حکماء کے نزدیک علم ایک نورانی حالت اور کیفیت کا نام ہی جس سے معلوم کی صورت اور حقیقت اور صفت کچھ نظر آجاتی ہے جس درجہ کی نورانیت ہوگی۔ اسی درجہ کا انکشاف ہوگا۔ حق تعالیٰ نے شاہ صاحب کو اس نورانی کیفیت کے اعتبار سے بھی (الور) بنایا تھا۔

اَنْوَر اگرچہ علم ذات تہا، مگر بطور کنایہ نور علم اور نور تقویٰ پر بھی دلالت کرتا تھا۔ اور یہ دلالت اس درجہ مشہور ہوئی کہ انور شاہ کا نام علم و حفظ پر اس طرح دلالت کرنے لگا جس طرح کہ لفظ حاتم جود و سخاوت کی دلالت میں مشہور ہے۔

شاہ صاحب نہایت حسین و جمیل تھے۔ اور حسن ظاہری کے ساتھ حسن سیرت اور جمال باطنی کے ساتھ بھی موصوف تھے۔ تواضع اور حلم اور وقار اور سکوت اور خاموشی آپ کا طرۂ امتیاز تھا بلا ضرورت کلام نہیں فرماتے تھے۔ اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرنے آتا تو اس کو جواب دیتے اور اس کے بعد اگر وہ بیٹھتا اور باتیں کرتا تو یہ فرماتے۔ جاؤ بھائی آرام کرو۔ آرام بہت اچھی چیز ہے۔ یعنی مالایعنی سے احتراز میں دنیا اور آخرت دونوں کی راحت ہے۔ نور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ جو شخص بھی دیکھتا وہ اول نظر میں یقین کرلیتا کہ یہ خدا کا کوئی نیک بندہ ہے۔ حق یہ

ہے کہ نور تقویٰ اَجلیٰ بدیہیات میں سے ہے مگر حقیقت کی تنقیح بہت دشوار ہے اور درجۂ اتصاف کی دشواری کو تو پوچھو ہی مت۔ وانها لكبيرة الا على الخاشعين الـذين يظنون انهم ملاقوا ربهم وانهم اليه راجعون۔

شاہ صاحب اگر کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے اور باہر سے کوئی اجنبی مجلس میں داخل ہوتا تو دیکھتے ہی یہ سمجھ لیتا تھا کہ اس مجلس میں سب سے بڑا عالم اور متقی یہی شخص ہے۔ ؎

کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور
مردِ حقانی کی پیشانی کا نور

یہ ناچیز جب بھی شاہ صاحب کو دیکھتا تو یہ شعر زبان پر آتا۔ ؎

اَلْمُسْلِمُوْنَ بِخَيْرٍ مَا بَقِيْتَ لَهُمْ
وَلَيْسَ بَعْدَكَ خَيْرٌ حِيْنَ تُفْتَقَدُ

جب تک آپ زندہ ہیں اس وقت تک مسلمان خیر و برکت میں ہیں۔ اور تیرے گم ہونے کے بعد کوئی خیر نہیں طبقات الشافعیہ میں ہے کہ یہ شعر کسی نے امام بخاری کو دیکھ کر پڑھا تھا۔ شاہ صاحبؒ چونکہ اس زمانہ کے امام بخاری تھے۔ اس لئے یہ ناچیز اُن کو دیکھ کر یہ شعر پڑھتا تھا۔

بشارتِ تمام حدیث شریف میں ہے کہ رؤیائے صالحہ مومن کیلئے بشارت ہے۔ دیکھنے والے کے لئے بھی اور جس کے لئے دیکھا گیا اس کے لئے بھی متعدد اشخاص نے سرورِ عالم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں شاہ صاحبؒ کی صورت اور شکل میں دیکھا، جو درحقیقت اس کی بشارت تھی کہ شاہ صاحب العلماء ورثۃ الانبیاء کا مصداق ہیں۔

اس ناچیز نے بھی شاہ صاحبؒ کو بارہا خواب میں دیکھا۔ ایک مرتبہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ حضور تشریف فرما ہیں۔ اور مولانا انور شاہؒ کی شکل میں ہیں۔

ایک مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں رمضان المبارک میں تراویح سے فارغ ہوکر سونے کے لئے لیٹ گیا اور کچھ نیند آگئی۔ یکایک گھر میں سے جگایا کہ دیکھو عائشہ بیگم بچی کو کیا ہوگیا۔ دیکھا کہ جس طرح آسیب زدہ کچھ بولیاں بولا کرتا ہے۔ اس قسم کی بولیاں بول رہی ہے میں نے اس وقت وہ دعا پڑھ کر دم کی۔ جو صحیح بخاری میں ہے کہ جو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے بچوں پر پڑھ کر دم فرمایا کرتے تھے۔ اعیذک بکلمات اللہ التامات من کل شیطان وھامۃ ومن کل عین لامۃ۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ یہ دعا پڑھ کر اور بچی پر دم کرکے لیٹ گیا۔ شب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خواب میں دیکھا کہ تشریف فرما ہیں اور شاہ صاحبؒ کی شکل میں ہیں۔ جب سحر میں اٹھا تو گھر میں یہ خواب بیان کیا اس نے تسلی دی اور بتلایا کہ بے فکر ہوجاؤ۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد سحر اور آسیب کا اثر نہیں رہ سکتا۔ سو الحمد للہ اس کے بعد سے آج تک لڑکی پر کوئی آسیب کا اثر نہیں ہوا۔ الحمد للہ سحر کا وقت تھا۔ اور سحر اور آسیب سے مامون ہونے کی بشارت سامنے تھی۔

پاکستان آنے کے بعد ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ ایک مسجد میں مقیم ہیں۔ اور سفرِ آخرت کی تیاری فرمارہے ہیں اور لوگ عموماً اور اہل علم خصوصاً الوداعی سلام کے لئے حاضر ہو رہے ہیں۔ شاہ صاحب کا کتب خانہ بھی اسی مسجد میں ہے۔ اہل علم میں سے جو ملنے کے لئے آتا ہے اس کو کوئی کتاب ضرور مرحمت فرماتے ہیں۔ اسی اثناء میں یہ ناچیز بھی سلام اور وداع کے لئے حاضر ہوا۔

بہت مسرور ہوئے۔ اور اُٹھ کر اپنے حجرہ میں تشریف لے گئے۔ اور ایک نسخہ صحیح بخاری کا لے کر برآمد ہوئے۔ اور یہ فرمایا کہ صحیح بخاری میں نے تیرے لئے رکھ چھوڑی تھی۔ بعد ازاں آنکھ کھل گئی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

اسی خواب کے متصل ایک دوسرا خواب دیکھا۔ وہ یہ کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہٗ کے یہاں یہ ناچیز مع اہل وعیال کے مدعو ہے اور کھانے کا خاص اہتمام ہے۔ اور اس ناچیز کے علاوہ اُس وقت اور کسی کی دعوت نہیں۔ اہل و عیال حضرت کے یہاں پہلے چلے گئے اور یہ ناچیز بعد میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ حضرت حکیم الامۃ ایک پلنگ پر تشریف فرما ہیں۔ یہ ناچیز پائیتیں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک باتیں فرماتے رہے۔ بعد ازاں ایک نسخہ صحیح بخاری کا اس ناچیز کو عطا فرمایا۔ اور فرمایا کہ یہ لے لو۔ اور اس کے سوا کچھ نہیں فرمایا۔

(تعبیر) تعبیر بظاہر یہ سمجھ میں آئی کہ یہ ناچیز اب تک دار العلوم دیوبند میں بیضاوی شریف پڑھاتا رہا۔ اب پاکستان آنے کے بعد بظاہر یہ خواب اس لئے دکھلایا گیا کہ اب زیادہ توجہ صحیح بخاری کی طرف کرو۔ یہاں اس کے درس کی ضرورت ہے۔ اور حضرت حکیم الامت تھانوی اور حضرت شاہ صاحبؒ دونوں حضرات کی طرف سے صحیح بخاری کا نسخہ عطا ہونے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے لَون (رنگ) اور نوع علم کو ملا کر سبق پڑھاؤ۔ سو الحمد للہ بخاری شریف آج کل پڑھا رہا ہوں اور دونوں بزرگوں کے رفع درجات کے لئے دعا کرتا ہوں اور دونوں بزرگوں کے علوم درس میں بیان کرتا ہوں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ وما توفیقی الا باللہ

درس حدیث درس کی عجیب شان تھی۔ جس کا اب دکھلانا تو ممکن نہیں۔ البتہ بتلانا کچھ ممکن ہے۔

(۱) درس حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے تھے کہ۔ حدیثِ نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت اور بلاغت کے واضح ہو جائے۔ کوشش اس کی فرماتے کہ حدیث کی مراد کو علمی اصطلاحات کے تابع نہ رکھا جائے۔ اصطلاحات بعد میں حادث ہوئیں اور حدیث نبوی زماناً ورتبۃً مقدم ہے۔ حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلافِ ادب ہے۔ نیز جس طرح حضرات مفسرین قرآن کریم کے اسرارِ بلاغت بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح شاہ صاحبؒ حدیث کے اہم بلاغی نکلات پر متنبہ فرماتے۔ چنانچہ اس ناچیز نے جو تعلیق صبیح لکھی وہ حضرت شاہؒ ہی کا ارشاد تھا۔ اور مقصد یہ تھا کہ احادیث کی شرح میں بلاغی نکات کا خاص اہتمام کیا جائے۔ اور فرمایا کہ اس بارہ میں حافظ تورپشتی اور علامہ طیبی کی شرح سب سے زیادہ لطیف اور لذیذ ہے اس لئے اس ناچیز نے طیبی اور تورپشتی کے لطائف اور نکات میں سے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی کہ جو تعلیقِ صبیح میں درج نہ کر دی ہو ــــ تصنیف کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمتِ مبارکہ میں اس تالیف کو پیش کیا۔ اوّل کی تین جلدیں حرف بحرف شاہ صاحبؒ کے مطالعہ سے گذر چکی ہیں۔ فللہ الحمد والمنۃ ۔

(۲) خاص خاص مواضع میں حدیث نبوی کا ماخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے۔ اور اس مناسبت سے بہت سی مشکلاتِ قرآنیہ کو حل فرماتے۔

(۳) بقدر ضرورت اسماء الرجال پر کلام فرماتے۔ خصوصاً جن رواۃ کے بارہ میں محدثین کا اختلاف ہوتا۔ اس جرح و تعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے اپنی طرف سے

ایک قولِ فیصل بتلا دیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابلِ قبول ہے۔ اس کی روایت حسن کے درجہ میں رہے گی یا صحیح کے درجہ میں یا قابلِ رد ہوگی یا قابلِ اغماض اور مسامحت اور اغماض اور مسامحت میں جو فرق ہے وہ اہلِ علم پر مخفی نہیں۔ زیادہ تر فیصلہ کا طریقہ یہ رکھتے کہ جب کسی راوی کے جرح و تعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ تبلا دیتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے۔ اور امام ترمذی نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔

(۴) فقہ الحدیث پر جب کلام فرماتے تو اولاً ائمۂ اربعہ کے مذاہب نقل فرماتے۔ اور پھر اُن کے وہ دلائل بیان فرماتے جو اس مذہب کے فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ قوی ہوتے۔ اور پھر اُن کا شافی جواب اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے۔

حنفیت کے لئے استدلال اور ترجیح میں کتاب وسنّت کے تبادر اور سیاق اور سباق کو پورا ملحوظ رکھتے۔ اور اسبات کا خاص لحاظ رکھتے کہ شریعت کا منشاء اور مقصد اس بارہ میں کیا ہے۔ اور یہ حکمِ خاص شریعت کے احکام کلیہ کے تو خلاف نہیں شریعت کے مقاصدِ کلیہ کو مقدّم رکھتے۔ اور احکام جزئیہ میں اگر بے تکلف تاویل اور توجیہ ممکن ہوئی تو اس کی توجیہ فرماتے۔ اور اگر تکلّف معلوم ہوتا تو قواعد کلیہ کو ترجیح دیتے جو طریقہ فقہاءِ کرام کا ہے۔

فائدہ دربیان تعریف مجتہد

حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ فقیہ اور مجتہد وہ ہے کہ جو جزئیات کو دیکھ کر کلیات کو مستنبط کرے۔ اور مفتی وہ ہے کہ جو اِن کلیات کو معلوم کر لینے کے بعد

یہ سمجھ سکتا ہو کہ فلاں جزئیہ۔ فلاں کلیہ کے تحت میں درج ہے۔ محض چند جزئی احکامِ شرعیہ کے دلائل یاد کر لینے سے انسان مجتہد نہیں بن جاتا۔

اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مجتہد وہ ہے کہ جو پوری شریعت کا کلی مزاج سمجھے ہوئے ہو جیسے طبیب وہ ہے جو طب کے مزاج سے واقف ہو اگر کسی پہاڑی کو دو چار جڑی بوٹیوں کے خواص معلوم ہو گئے تو وہ طبیب نہیں بن جاتا۔

(۵) نقل مذاہب میں قدماء کی نقول پیش فرماتے۔ متأخرین کے نقول پر متقدمین کی نقول کو مقدم رکھتے۔ ائمۂ اجتہاد کے اصل قول پہلے نقل فرماتے۔ اور مشائخ کے اقوال بعد میں۔

(۶) مسائلِ خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بھی بتلا دیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے گویا وہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلبہ کے لئے موجب طمانینت ہوتا۔

(۷) درسِ بخاری میں تراجم کے حل کی طرف خاص توجہ فرماتے۔ اولاً بخاری کی غرض اور مراد واضح فرماتے۔ بہت سے مواقع ایسے بھی آئے ہیں جہاں حل ترجمہ میں شارحین کے خلاف مراد منقح فرمائی۔ اور اس کے دلائل اور شواہد بیان فرماتے جو شاہ صاحبؒ کی شائع شدہ تقریر مسمیٰ بہ فیض الباری کے مطالعہ سے بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں۔

اور ثانیاً یہ بھی بتلاتے کہ اس ترجمۃ الباب میں امام بخاری نے ائمۂ اربعہ میں سے کس امام کا مذہب اختیار فرمایا۔ پوری بخاری کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوا کہ سوائے مسائلِ مشہورہ کے اکثر جگہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کی موافقت کی۔

(۸) درسِ بخاری میں فرمایا کہ حافظ عسقلانی چونکہ امام شافعی کے مقلد ہیں۔ اس لئے امام شافعی کی تائید کے لئے فتح الباری میں جا بجا امام طحاوی کے اقوال اور استدلال نقل کر کے اس کی پوری سعی فرماتے ہیں کہ امام طحاوی کا جواب ضرور ہو جائے۔ بغیر امام طحاوی کے جواب دئے گذرنے کو حافظ عسقلانی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے حق شافعیت ادا نہیں کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس ناچیز کی کوشش یہ رہتی ہے کہ مسائلِ فقہیہ میں بغیر حافظ عسقلانی کا جواب دئے نہ گذرے۔

(۹) اسرارِ شریعت میں شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ عبدالوہاب شعرانی کا کلام زیادہ نقل فرماتے۔

(۱۰) درس کی تقریر نہایت جامع اور نہایت موجز اور مختصر ہوتی تھی۔ ہر کس و ناکس کے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحبؒ دیوبند تشریف لائے۔ بڑے مہتمم صاحب یعنی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے یہاں تھے۔ بڑے مہتمم صاحب نے فرمایا مولانا! آپ مدرسہ کے سرپرست ہیں۔ آپ ہمارے صدر مدرس کا درس تو سنیں۔ فرمایا بہت اچھا۔ درس میں تشریف لیگئے۔ فراغت کے بعد حضرت حکیم الامۃ نے یہ ارشاد فرمایا کہ درس کا ہر ہر جملہ اس قدر موجز اور مختصر تھا کہ ہر جملہ کی شرح میں ایک مستقل رسالہ لکھا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ درس کو دیکھکر محدثین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ جب متون حدیث پر کلام فرماتے تو یہ معلوم ہوتا کہ بخاری و مسلم بول رہے ہیں اور جب فقہ الحدیث پر کلام کرتے تو محمد بن حسن شیبانی معلوم ہوتے۔ اور جب حدیث کی بلاغت پر کلام فرماتے تو تفتازانی اور جرجانی معلوم ہوتے اور جب شریعت کے اسرار بیان فرماتے تو ابن عربی اور شعرانی معلوم ہوتے

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ

از جناب محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" لکھنؤ

خداداد نورانیت و محبوبیت حضرت استاذ قدس اللہ سرہٗ کے کمالات میں یقیناً علم و عمل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر اور مخلوق کی نگاہ میں بھی زیادہ قدر و قیمت علم و عمل ہی کی ہے۔ اس لحاظ سے مجھے پہلے حضرت ممدوح کے وہی واقعات و ارشادات اور اپنے وہی تأثرات ذکر کرنے چاہئیں جن کا تعلق علم و عمل جیسے اعلیٰ کمالات سے ہے۔ لیکن یہ عاجز چونکہ سب سے پہلے حضرت کی ظاہری نورانیت و محبوبیت ہی سے واقف اور متأثر ہوا اس لئے سلسلۂ سخن اسی سے شروع کرتا ہوں۔

آج سے قریباً تیس سال پہلے کی بات ہے، میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور اگلے سال دارالعلوم دیوبند جانے کا ارادہ تھا۔ مراد آباد میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس ہوا۔ یہ عاجز بھی گیا۔ حضرت شاہ صاحب کا ذکر اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا لیکن ابھی تک آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ غالباً صبح کا وقت تھا دیکھا کہ چند حضرات ایک طرف سے تشریف لا رہے ہیں۔ اُن میں ایک بزرگ جو گہرے سبز رنگ کا عبا پہنے ہوئے تھے اور غالباً ہلکے زرد رنگ کا عمامہ زیب سر تھا۔ بڑے متین ذہین

اور بڑے نورانی نظر پڑے۔ آپ سے آپ دل میں آیا کہ شاید یہی دیوبند کے "حضرت شاہ صاحب" ہیں۔ کسی سے پوچھا۔ جواب ملا کہ ہاں شاہ صاحب یہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اس دید ہی سے دل میں ایک خاص محبت و عقیدت ڈال دی۔

اجلاس کے سلسلہ میں تین دن میں مراد آباد رہا۔ اب تک یاد ہے کہ اس تاک میں رہا کرتا تھا اور گھوم پھر کے بھی اس کی کوشش کیا کرتا تھا کہ حضرت کو کہیں دیکھوں۔ غالباً دیکھنا تو بار بار نصیب ہوا۔ لیکن تقریر یا بات سننا کیا معنے۔ اُن دنوں میں آواز سُننا بھی یاد نہیں۔

چند مہینے کے بعد دیوبند پہونچ گیا۔ اُس سال چونکہ میں نے دورۂ حدیث نہیں لیا تھا۔ اس لئے حضرت کے یہاں میرا کوئی سبق تو نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی روزانہ کئی کئی بار آنکھوں کو دید کا موقع ملتا تھا۔ مگر خوب یاد ہے کہ جی بھرتا نہیں تھا اور ہر دفعہ دیکھنے میں لذت ملتی تھی۔ اگلے سال میں نے دورہ لیا۔ اور حسب معمول بخاری شریف اور ترمذی شریف پوری پوری حضرت کے یہاں ہوئیں۔ اور ان دونوں سبقوں کے سلسلہ میں روزانہ قریباً ۳-۴ گھنٹے خدمت میں حضوری کی سعادت نصیب ہوتی تھی۔ لیکن اپنی اس گذشتنی کے ذکر اور اُس کی یاد میں آج بھی لذت محسوس کرتا ہوں کہ حسب توفیق علمی استفادہ کے علاوہ یہ عاجز آنکھوں کے ذریعہ بھی لذت و سرور حاصل کرتا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ میں اس حال میں منفرد نہ تھا۔ بلکہ بہت سے شرکاءِ درس غالباً میرے شریک حال تھے۔

سیرت و باطن کے کمال کے ساتھ ساتھ اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو صورت و ظاہر کی نورانیت و زیبائی اور اُس میں جذب و کشش بھی نصیب فرمائے تو بلا شبہ یہ بڑا انعام ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ افادہ و استفادہ میں اس سے بڑی جان پڑ جاتی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر پیغمبر کو ظاہر و صورت کی زیبائی بھی عطا فرمائی جاتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے:۔

مابعث اللہ نبیاً الاحسن الوجہ حسن الصوت و ماجبکم احسنہم وجھًا واحسنہم صوتًا۔[51]

کمال علمی اور علوم میں جامعیت

یوں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو گوناگوں ظاہری و باطنی کمالات سے نوازا تھا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ آپ کا علمی کمال دوسرے تمام کمالات پر غالب تھا۔ اتنا غالب کہ دوسرے سب کمالات گویا بالکل اس کے نیچے دبے ہوئے تھے۔[52] یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ

---

[51] یہ حدیث امام قاضی عیاض نے اپنی "کتاب الشفا" میں نقل کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے پیغمبر بھی آئے وہ سب خوبرو اور خوش آواز تھے۔ اور ہمارے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ دونوں چیزیں بھی دوسروں سے زیادہ عطا فرمائی گئی تھیں۔ اور آپ اس پہلو میں بھی سب سے فائق تھے ۱۲

[52] حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بعض شخصیتیں جامع الکمالات ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ایک کمال اتنا غالب اور ایسا نمایاں ہوجاتا ہے کہ دوسرے کمالات اس کی وجہ سے دب جاتے ہیں۔ اور لوگ ان کو محسوس بھی نہیں کرتے۔ مثال میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاں شہید، وحضرت شاہ غلام علی صاحب رحمہم اللہ کی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے کہ اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا پایہ فقر و درویشی میں بھی کم نہیں ہے۔ لیکن اُن پر کمالِ علم اتنا غالب ہے کہ اُن کا نام سنکر لوگوں کا ذہن فقر و درویشی کی طرف جاتا ہی نہیں بخلاف حضرت مرزا صاحب شاہ غلام علی صاحب کے کہ اگرچہ وہ علم سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن ان پر درویشی کا ایسا غلبہ ہے کہ ان کا نام سنکر لوگوں کا ذہن علم کی طرف بالکل نہیں منتقل ہوتا۔ بلکہ صرف فقر و درویشی ہی کی طرف سبقت کرتا ہے ۱۲

آپ کے متعلق صرف یہی سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے ایک علامہ تھے اور بعض حضرات جن کی واقفیت اور زیادہ ناقص ہے۔ وہ علوم میں بھی صرف علم حدیث میں آپ کے امتیاز اور علوِ مقام کے قائل ہیں۔ اور آپ کو اس دور کے صرف ایک ممتاز محدّث کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ حضرت کے مقام علمی سے کچھ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرتِ ممدوح کا خاص امتیاز علوم کی جامعیت تھی اور وہ بھی ایسی جامعیت کہ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس علم میں حضرت کی مہارت اور مناسبت نسبتہً زیادہ تھی۔

وسعتِ علم کیساتھ دقّتِ نظر

اس موقع پر بعض حضرات کی ایک اور غلط فہمی کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے کے ایک نامور عالم جنھیں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خصوصیات سے بلا واسطہ واقف ہونے کا غالباً کبھی موقع نہیں ملا۔ اُن کے متعلق میں نے سنا کہ کسی موقع پر انھوں نے حضرت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اور چونکہ حافظہ بہت قوی تھا اس لئے آپ بذاتِ خود ایک وسیع کتب خانہ تھے۔ لیکن نظر میں گہرائی نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ وسیع النظر اور کثیر المعلومات تو تھے۔ لیکن دقیق النظر اور عمیق العلم نہیں تھے۔

یہ عاجز پورے وثوق اور بحمد اللہ پوری بصیرت کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ جن اہل علم و نظر کو حضرت کی علمی خصوصیات سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے انھیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت کے یہاں دقّتِ نظر کا پلّہ کسی طرح بھی وسعتِ نظر کے مقابلہ میں ہلکا نہیں تھا۔ البتہ علم کی سطح ہمارے اس زمانہ کی عام سطح سے اتنی

بلند تھی کہ نہ سمجھ سکنے والے بھی معذور سمجھے جانے کے قابل ہیں۔ ایک دفعہ خود فرمایا:۔
"بعض اوقات بہت نیچے اتر کر بات کرتا ہوں۔ لیکن پھر بھی لوگ نہیں سمجھتے۔"
یہ ایک بڑا علمی سانحہ ہے کہ حضرت ممدوح نے اپنے علم کی نشانی کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ لیکن اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہوئی کہ حضرت کو اہل زمانہ کیطرف سے مایوسی تھی۔ تاہم بعض خاص خاص مسائل اور موضوعات پر جو چند رسالے خود آپ کے لکھے ہوئے ہیں اُن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی سطح زمانہ کی عام سطح سے کس قدر بلند ہے اور آپ کی نظر کتنی دقیق اور علم کتنا عمیق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانہ کے بہت سے اہلِ علم اپنے کو اُن رسالوں کے سمجھنے سے عاجز و قاصر پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تعبیر و ادا میں کوئی اغلاق و تعقید ہے۔ بلکہ یہ صرف علمی سطح کے غیر معمولی تفاوت کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل کے بہت سے اہلِ علم حضرت امام محمد اور امام شافعی کی کتابوں سے اتنی آسانی سے استفادہ نہیں کر سکتے جتنی آسانی سے متأخرین کی کتابوں سے وہ استفادہ کر لیتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت کا طرزِ فکر اور طرزِ استدلال بہ نسبت متأخرین کے متقدمین سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔

قرآن مجید میں تدبر و تفکر

علم کی گہرائی اور دقتِ نظر کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضرت نے اپنا یہ حال خود ایک دفعہ بیان فرمایا کہ:۔

"میں رمضان مبارک میں قرآن مجید شروع کرتا ہوں اور تدبر و تفکر کے ساتھ اس کو پورا کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کبھی پورا نہیں ہوتا۔ جب دیکھتا ہوں

کہ آج رمضان مبارک ختم ہونے والا ہے تو پھر اپنے خاص طرز کو چھوڑ کر جو کچھ باقی ہوتا ہے اُس دن ختم کر کے دور پورا کر لیتا ہوں۔

یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ رمضان مبارک میں کبھی حضرت کے قریب رہنے کا اتفاق تو نہیں ہوا۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ آپ "اُنزِلَ فِیہِ القرآن" والے اس مبارک مہینہ میں زیادہ وقت قرآن مجید ہی کی تلاوت اور تدبر و تفکر پر صرف فرماتے تھے۔ اسکی باوجود قرآن مجید ختم نہیں کر پاتے تھے۔

حدیث میں غور و تدبر

خود حضرت نے ایک دن بیان فرمایا :-
"کہ میں نے غور و فکر کے ساتھ صحیح بخاری کے صرف متن کا تیرہ۱۳ دفعہ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ شروح یا حواشی کے ساتھ جو مطالعہ کیا ہے وہ اس کے علاوہ ہے"۔

قرآن مجید میں تدبر و تفکر کی مثالیں تو بہت سی سُنی ہیں اور کتابوں میں بھی پڑھی ہیں۔ لیکن حدیث میں تفکر کی ایسی مثال نہ سُنی نہ کتابوں میں کہیں نظر سے گذری۔

اور جن لوگوں کو حضرت کے درسِ حدیث سے کچھ مستفید ہونے کا موقع ملا ہے غالباً وہ سب اس کی شہادت دیں گے کہ آپ کے درس کا رنگ بھی یہی تھا کہ اُس میں اسنادی و روایتی بحث و تنقید کے مقابلہ میں معنوی اور درایتی مباحث کم نہیں۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوتے تھے۔ اور اُس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے صرف ایک صاحب روایت محدث کی حیثیت سے حدیث کے متون و اسانید ہی سے واقفیت حاصل نہیں کی ہے اور اسی طرح یہ کہ آپ کے علم کا ماخذ و مبلغ صرف چند حواشی و شروح ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ایک صاحب فکر و درایت اور دقیق النظر فقیہ کی طرح آپ نے احادیث کے معانی و مقاصد پر

بطورِ خود بھی بڑا گہرا غور کیا ہے۔ اور چند خاص خاص مسئلوں پر حضرت کے جو بعض رسائل ہیں وہ بھی حضرت کی اس خصوصیت و جامعیت پر شاہد ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے، جو شاید بہت سے اہلِ علم کیلئے ایک "نیا انکشاف" ہو۔ اچھا ہے اِس بہانہ سے وہ بھی قرطاس کی امانت بن جائے۔

علامہ نیمویؒ کی آثار السنن اور حضرت استاذؒ

حضرت مولانا ظہیر احسن شوق نیمویؒ اور ان کی معرکۃ الآراء ناتمام

"آثار السنن" سے اور اس کی غیر معمولی اہمیت سے کم از کم حضرات اہلِ علم ضرور واقف ہوں گے۔ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں تو علمی اور درسی حلقوں میں اس کتاب کی دھوم مچی ہوئی تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محدثانہ طرز پر حنفیت کی تائید میں یہ کتاب ہمارے اس زمانہ کا شاہکار ہے۔ افسوس یہ پوری نہیں ہوسکی۔ اور اس کے پہلے دو حصّے تالیف فرماکر علامہ ممدوح اس عالم سے رحلت فرماگئے۔

حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن درس میں اس کتاب کے متعلق یہ واقعہ بیان فرمایا کہ:۔

"جس زمانہ میں مولانا ظہیر احسن صاحب نیموی رحمۃ اللہ علیہ آثار السنن تالیف فرمارہے تھے۔ انھوں نے اس کے کچھ اجزا حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) کی خدمت میں اس غرض سے بھیجے کہ ملاحظہ فرماکر مشورے دیں اور جو اضافے فرمائے جاسکیں وہ اضافے فرمادیں۔

حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ نے ملاحظہ فرماکر وہ اجزاء واپس فرمادیئے اور اُن کو میرا پتہ لکھدیا کہ آپ اس مقصد کے لئے اس پتہ پر خط وکتابت فرمائیں،

میں اس زمانے میں اپنے وطن (کشمیر) میں رہتا تھا۔

مولانا ظہیر احسن صاحب نے حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے مجھے خط لکھا۔ اور اس طرح میری اُن کی خط و کتابت شروع ہو گئی۔ اور پھر اُنھوں نے اپنی کتاب بھیجنی شروع فرمائی۔ جتنی لکھ لیتے تھے وہ مجھے بھیج دیتے تھے اور میں اُن کے حکم کی تعمیل میں اضافے کرتا تھا۔ میں نے جو اضافے کئے وہ مقدار میں اُنکی اصل کتاب سے زیادہ تھے۔ لیکن میرے یہ اضافے زیادہ تر معنوی بحثوں سے متعلق تھے۔ کیونکہ مولانا موصوف نے علل و اسانید کی بحثوں کے اضافہ کی گنجائش کسی کے لئے بہت کم چھوڑی تھی۔ مگر چونکہ میری وہ معنوی بحثیں مولانا کے ذوق کی چیز نہیں تھی۔ اور وہ اپنی کتاب میں خالص محدثین کے طرز پر علل و اسانید ہی سے بحث کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے میرے اس باب کے (یعنی علل و اسانید کے متعلق) اضافے تو قبول فرمائے اور کتاب میں لے لئے۔ لیکن معنوی مباحث تمام تر حذف کر دیئے۔"

اس عاجز نے حضرت استاذ سے یہ پوری بات درس میں خود سُنی ہے۔ اور حضرت ہی کے ذریعہ یہ معلوم ہے کہ علامہ شوق نیموی جب تک رہے حضرت سے علمی مراسلت اور مشاورت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ ہی سے سُنے ہوئے بعض جزئیات اس عاجز کو یاد بھی ہیں۔ لیکن وہ خالص علمی باتیں ہیں اس مقالہ میں ان کا ذکر مناسب نہ ہوگا۔

علامہ نیموی حضرت استاذ کی نظر میں

جب علامہ شوق نیموی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آ گیا ہے تو اس واقعہ کا اظہار بھی میرے

لئے ضروری ہے کہ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ فن حدیث میں علامہ ممدوح کا مقام بہت بلند مانتے تھے اور معرفتِ علل و اسانید میں ہندوستان کے کسی دوسرے عالم کو ان کا عدیل و مثیل نہیں قرار دیتے تھے - اس عاجز کو خوب یاد ہے یہاں تک فرماتے تھے کہ مولانا ظہیر احسن صاحب حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (لکھنوی فرنگی محلی) کے شاگرد ہیں - لیکن صناعتِ حدیث میں اُن سے بہت فائق ہیں -

اس سے یہ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کے اکثر علمی حلقوں میں جو یہ بیماری آگئی ہے کہ اپنے خاص حلقہ اور اپنی خاص جماعت سے باہر ان کو کوئی صاحب کمال نظر ہی نہیں آتا اور ہر میدان میں وہ اپنے ہی حلقہ اور سلسلہ والوں کا جھنڈا اونچا رکھنا چاہتے ہیں - حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو الحمدللہ یہ بیماری بالکل نہیں لگی تھی اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں یہ بڑی ہی خراب بیماری ہے -

خیر یہ باتیں تو استطراداً ذکر میں آگئیں - ورنہ میں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خصوصیات کا تذکرہ کر رہا تھا - اب پھر وہیں آجائیے !

حیرت انگیز یادداشت اپنے حافظہ کے انحطاط پر رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ایک دن فرمایا :-

"پہلے میرا یہ حال تھا کہ اگر آج ایک مضمون متعدد کتابوں میں دیکھوں اور مجھے اُن کتابوں کی عبارتیں نقل کرنی ہوں - لیکن کسی وجہ سے آج نقل نہ کر سکوں اور کل بھی موقع نہ ملے تو پرسوں تک بھی اس پر قدرت رہتی تھی کہ ہر کتاب کی اصل عبارت صفحہ کے حوالہ کے ساتھ دوبارہ کتاب دیکھے بغیر نقل کر سکتا تھا - لیکن اب حافظہ اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ صبح کی دیکھی کتابوں کی عبارتیں شام تک تو

نقل کرسکتا ہوں لیکن رات درمیا گذر جانے کے بعد کل نقل نہیں کرسکتا۔"

یادداشت کے متعلق اپنے بعض تجربے دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے کئی سال بعد تک درس وتدریس اس عاجز کا مشغلہ رہا۔

اور اُس زمانہ میں کتابوں کے مطالعہ سے بھی کچھ زیادہ شغف تھا۔ کبھی زیرِ درس کتابوں میں اور کبھی خارجی مطالعہ میں ایسے اشکالات بھی پیش آجاتے تھے جن کے حل کرنے سے اپنا غور وفکر عاجز رہتا تھا۔ میں ایسے تمام اشکالات کو اپنی نوٹ بک میں نوٹ کرتا رہتا تھا۔ اور جب حضرت استاذ کی خدمت میں حاضری میسّر ہوتی تو وہ نوٹ بک جیب سے نکال کر اکثر پہلی ہی ملاقات کی مجلس میں حضرت کے سامنے میں اپنے وہ اشکالات عرض کرتا۔ اور حضرت میرے ہر سوال کا جواب اس طرح دیتے گویا اس سوال کے تمام اطراف پر آپ نے خاص طور سے حال ہی میں غور فرمایا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس تجربہ کی شہادت ہر وہ شخص دے گا جس نے کوئی علمی اشکال کبھی حضرت کے سامنے پیش کرکے جواب چاہا ہو۔

بہر حال مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ جب تک حضرت اس دنیا میں رہے میرا برابر یہ دستور رہا بلکہ اپنے مطالعہ کے اشکالات کے علاوہ بعض دوسرے اہلِ علم واصحابِ درس کے اشکالات وسوالات بھی اُن سے دریافت کرکے میں اپنی نوٹ بک میں لکھ لیتا تھا۔ اگر یہ عرض کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت کی خدمت میں حاضری کے ہر موقع پر میری نوٹ بک کے یہ سوالات ہی حضرت کے لئے میرا خاص ہدیہ ہوتا تھا جس کا میں بڑا اہتمام کرتا تھا۔ اور حضرت کا معاملہ بھی یہ تھا کہ اگر کبھی میں حاضر ہوا اور کسی وجہ سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا تو حضرت خود فرماتے تھے "مولوی صاحب کچھ پوچھنا ہے"؟ اور پھر اس کے بعد میں پوچھتا تھا۔

خیر یہ تو تمہید تھی۔ اب یادداشت اور قوتِ حافظہ کا وہ واقعہ سنئے جس کے لئے مجھے یہ لمبی تمہید لکھنی پڑی ایک دفعہ کی حاضری میں ترمذی شریف کی ایک عبارت کا میں نے حوالہ دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے۔ بہت غور کیا۔ لیکن حل نہیں ہو سکا۔

فرمایا ـــــ "مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا، مجھے خوب یاد ہے جس سال آپ دورہ میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہوگئی ہے۔ لیکن لوگ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں۔ اور انھیں پتہ نہیں چلتا۔ ورنہ جو اشکال آپ کو پیش آیا سب کو پیش آنا چاہئے ـــــ پھر فرمایا ـــــ صحیح عبارت اس طرح ہے۔

بس سارا اشکال جس نے چکر میں ڈال رکھا تھا ایک منٹ میں رفع ہوگیا۔

اللہ اکبر! یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات بتلائی تھی۔

ایک واقعہ اور سنئے! ـــــ سورۂ نسآء کے سولھویں اور سترھویں رکوع کی آیتیں چوری اور دھوکہ بازی کے ایک خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اس واقعہ کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ مجھے طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک خاص مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ کس سنہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں جو تفسیریں مجھے ایسی ملیں جن میں آیات سے متعلق روایات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ میں نے اُن سب کو دیکھ ڈالا۔ مگر واقعہ کا زمانہ اور سنہ مجھے کہیں سے معلوم نہ ہو سکا۔ عاجز آکر حضرت کی خدمت میں

حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ مجھے فلاں واقعہ کے سنہ وقوع کی تلاش ہے۔ کتابوں میں دیکھا مگر مجھے نہیں ملا؟

فرمایا کون کون کتابیں آپ نے دیکھیں؟ "میں نے تفسیر ابن جریر و ابن کثیر و معالم وغیرہ چند تفسیروں کے نام لئے ۔ فرمایا۔ درمنثور میں نہیں دیکھا؟ ۔ میں نے عرض کیا کہ درمنثور کا نسخہ اس وقت کتب خانہ میں موجود نہیں تھا کہیں عاریت میں گیا ہوا ہے۔ اس لئے اس کو تو نہیں دیکھ سکا۔

فرمایا، جاؤ اُس میں دیکھ لو، اُس میں مذکور ہے۔

چنانچہ تلاش کر کے درمنثور کو دیکھا تو ابن سعد کی ایک روایت میں یہ صریح الفاظ اُس میں موجود تھے:۔

وکان ذالک فی شھر ربیع سنۃ اربع (کہ یہ واقعہ ماہ ربیع سنہ ۴ھ میں پیش آیا)

گویا جو چیز بھی کسی کتاب میں کبھی حضرت نے دیکھی تھی وہ حافظہ کے خزانہ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی تھی۔

حدیث کے درس کے وقت صحاح ستہ اور ان کے علاوہ چند اور حدیث کی کتابیں حضرت کے سامنے رکھی رہتی تھیں اور جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ کو کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تھا تو صرف زبانی حوالہ پر اکتفا نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ تقریر جاری رکھتے ہوئے بے تکلف اسی کتاب پر ہاتھ جاتا تھا۔ اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل ایک خاص انداز میں کہتے ہوئے ایسا انداز فرما کر کتاب کھولتے تھے کہ بعض اوقات تو وہی صفحہ کھلتا تھا جس پر وہ حدیث ہوتی تھی۔ ورنہ بس دو چار ورق اِدھر سے یا اُدھر سے

اُلٹنے کے بعد وہ حدیث سامنے ہوتی تھی۔ جن حضرات نے یہ منظر نہیں دیکھا انھیں آج یہ سُنکر غالباً حیرت ہوگی اور شاید بہت سوں کو باور کرنا بھی مشکل ہوگا۔ لیکن جن لوگوں کو حضرت کے درس میں چند روز بھی بیٹھنے کا موقع ملا ہوگا انھوں نے قریباً روزانہ سبق میں یہ عجوبہ دیکھا ہوگا۔

علمی اطمینان اور اتقان

حضرت استاذ کے علمی امتیازات اور خصوصیات میں ایک نہایت اہم اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ جس مسئلہ میں آپ سے رجوع کیا جاتا آپ جواب اس طرح دیتے کہ گویا اس کے سارے پہلوؤں اور تمام مالہٗ د ماعلیہ پر آپ نے ماضی قریب ہی میں غور فرمایا ہے اور آپ بالکل مطمئن ہیں ــ "شاید یوں ہو" یا شاید یوں ہو" ــ والی بات آپ کے یہاں بالکل نہ تھی۔

فقہ حنفی کے بارہ میں اطمینان

جس سال یہ عاجز دورۂ حدیث کا طالب علم تھا (اور وہی سال دارالعلوم دیوبند میں حضرت کے درس کا آخری سال تھا) شعبان کے مہینہ میں جب کہ طلبہ امتحان سے فارغ ہوکر اپنے اپنے وطن جانے والے تھے۔ آپ نے ایک دن بعد نماز عصر تمام طلبہ سے بالعموم اور دورۂ حدیث سے فارغ ہونے والے اپنے تلامذہ سے بالخصوص خطاب فرمایا ــ اُس میں منجملہ اور باتوں کی ایک بات یہ بھی فرمائی:-

"ہم نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال اس مقصد کے لئے صرف کئے کہ فقہ حنفی کے موافقِ حدیث ہونے کے بارہ میں اطمینان حاصل کیا جائے سو الحمد للہ اپنی اس تیس سالہ محنت اور تحقیق کے بعد میں اس بارہ میں مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی حدیث کے مخالف نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مخالفین احناف جس درجہ کی

حدیث سے استناد کرتے ہیں کم ازکم اسی درجہ کی حدیث اس مسئلہ کے متعلق حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے۔ اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہو اور اس لئے وہ اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے"

یہاں مجھے فقہ حنفی کے بارہ میں تو حضرت کا صرف اتنا ہی ارشاد نقل کرنا تھا جو دراصل حضرت نے ایک دوسری بات کے لئے بطور تمہید کے فرمایا تھا۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں وہ اصل بات بھی ذکر کر دی جائے جس کی یہ تمہید تھی۔

حضرت نے فقہ حنفی کے سلسلہ میں اپنی تیس سالہ محنت و تحقیق اور اس کے نتیجہ میں اپنے اس اطمینان کا ذکر فرمانے کے بعد خدام سے فرمایا — سننے والے گوش دل سے سنیں کیا فرمایا — فرمایا :۔

"لیکن اب مجھے افسوس ہے! کاش میرا یہ وقت دین کے اس سے زیادہ اہم اور زیادہ ضروری کام میں صرف ہوا ہوتا تو آخرت میں اُس کے کام آنے کی زیادہ امید کر سکتا تھا"

پھر اسی تقریر میں آپ نے فرمایا :۔

"میں نے اپنے عربی اور فارسی ذوق کو محفوظ رکھنے کے لئے ہمیشہ اُردو لکھنے پڑھنے سے احتراز کیا یہاں تک کہ عام طور سے اپنی خط و کتابت کی زبان بھی میں نے عربی اور فارسی ہی رکھی۔ لیکن اب مجھے اس پر بھی افسوس ہے۔ ہندوستان میں اب دین کی خدمت اور دین سے دفاع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اردو میں مہارت پیدا کی جائے اور باہر کی دنیا میں دین کا کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی

زبان کو ذریعہ بنایا جائے۔ میں اس بارہ میں آپ صاحبوں کو خاص طور سے وصیت کرتا ہوں۔"

آگے کسی موقع سے انشاء اللہ میں اس کا مستقلاً ذکر کروں گا کہ حضرت استاذ کو اس زمانہ میں دو فتنوں کی طرف سے بڑی سخت فکر تھی۔ اندرونی فتنوں میں قادیانیت کا فتنہ۔ اور خارجی فتنوں میں الحاد و مادہ پرستی کا فتنہ اپنی زندگی کے اس دور میں حضرت کی دل کی خاص لگن بس یہی تھی کہ امتِ محمدیہ کو ان فتنوں کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اہلِ علم پوری تیاری اور طاقت سے میدان میں آئیں اور حضرت سمجھتے تھے کہ یہ کام اس زمانہ میں اردو اور انگریزی ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے لئے خاص طور سے فرمایا کرتے تھے۔

اسی سے ناظرین یہ بھی اندازہ فرما سکتے ہیں کہ خالص "کتاب بین عالم" ہونے کے باوجود آپ کے ذہن و فکر میں کتنی وسعت تھی اور آپ کی نظر میں وقت کے تقاضوں کی کتنی اہمیت تھی خیر یہ تو گویا ایک جملہ معترضہ تھا۔ ورنہ میں فقہ کے سلسلہ میں حضرت کی بعض علمی خصوصیات کا تذکرہ کر رہا تھا۔۔ اب آگے اسی سلسلہ میں سنئے:۔

فقہ میں آپ کا ایک خاص اصول

ایک موقع پر فرمایا:۔

"اکثر مسائل میں فقہ حنفی میں کئی کئی اقوال ہیں۔ اور مرجحین اور اصحاب فتوی مختلف وجوہ و اسباب کی بناء پر اُن میں سے کسی ایک قول کو اختیار کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ میں اُس قول کو زیادہ وزنی اور قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں جو از روئے دلائل زیادہ قوی ہو یا جس کے اختیار کرنے میں دوسرے ائمہ مجتہدین کا اتفاق زیادہ حاصل ہو جاتا ہو۔ (اسی سلسلہ میں فرمایا) میرا اپنا اصول تو

یہی ہے۔ لیکن دوسرے اہلِ فتویٰ اپنے اصول پر جو فتوے لکھتے ہیں میں اُن کی بھی تصدیق کر دیتا ہوں۔ اور میری اُس تصدیق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ از روئے فقہ حنفی یہ جواب بھی صحیح ہے۔"

بعض مسائل میں آپ کی خاص تحقیق

وسعتِ علم و نظر اور خاص فقیہانہ فکر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ بعض مسائل میں آپ کی تحقیق ہمارے زمانہ کے عام علماءِ احناف سے الگ بھی۔ بلکہ شاید واقعہ کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہو گی کہ عام علماء و اہلِ فتوے کے لئے فقہ حنفی میں وہ ایک نئی علمی دریافت ہوتی تھی۔ اس کی کئی ایک مثالیں اس عاجز کو یاد ہیں۔ لیکن اُن میں سے ایک ایسی ہے جس کا ذکر اردو کے اس مقالہ میں بھی نامناسب نہ ہو گا۔

فقہ حنفی کا یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر دنیا کے کسی بھی گوشہ میں چاند دیکھا جائے تو دوسرے تمام مقامات پر اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ مثلاً اقصائے مغرب میں رمضان کا چاند ایک دن دیکھا گیا تو اگر شرعاً قابلِ اعتبار ذریعہ سے اس کی اطلاع اقصائے مشرق میں رہنے والوں کو پہونچ جائے تو اُن کو بھی اُسی حساب سے روزہ رکھنا ہو گا۔ خاص علمی اور فقہی تعبیر اس مسئلہ کی یہ کی جاتی ہے کہ "حنفیہ کے یہاں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں اور دوسرے ائمہ کے یہاں اس کا اعتبار ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا عام طور سے علمی اور فقہی حلقوں میں حنفیہ کا یہی مذہب معلوم و مشہور ہے اور عموماً اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ اور حنفی فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں کچھ ایسا ہی لکھا ہوا بھی ہے۔ حالانکہ ہیئت کے حساب سے یہ بالکل ناقابلِ فہم ہے۔

حضرت اُستاذ قدس سرہٗ کی تحقیق اس مسئلہ میں یہ تھی کہ عام مصنفین سے اس کی

تعبیر میں لغزش ہوگئی ہے اور اصل مسئلہ حنفیہ کا یہ ہے کہ ایک اقلیم میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں۔ فرماتے تھے کہ مشرق و مغرب کے درمیان اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کرنا بداہتہً غلط ہے اور حضرت استاذ اپنی اس تحقیق کے سلسلہ میں جہاں تک اب یاد پڑتا ہے ابن رشد کی بدایۃ المجتہد اور فقہ حنفی کی کتابوں میں سے بدائع کا حوالہ بھی دیتے تھے۔

[واضح رہے کہ پہلے تو یہ صرف ایک قابلِ غور علمی مسئلہ تھا جو محض معقولیت پسندوں کے لئے اشکال اور خلجان کا باعث ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ واقعاتی مسئلہ ہوگیا ہے۔ کیونکہ اکثر ممالک عربیہ میں عموماً ہندوستان سے ایک دن پہلے چاند نظر آجاتا ہے — اور ہیئت کے اصول پر ایسا ہی ہونا بھی چاہئے — اور ہوائی جہاز جدہ سے پرواز کر کے ۹ گھنٹے میں بمبئی آجاتا ہے اور ۱۲ گھنٹے سے کم میں دہلی آسکتا ہے۔ پس یہ ہوسکتا ہے کہ مثلاً ۲۹ رمضان کی شام کو کچھ لوگوں نے جدہ میں عید کا چاند دیکھا اور اُسی شب کو وہ ہوائی جہاز سے روانہ ہوکر صبح کو بمبئی پہنچے تو اگر اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے تو اُن لوگوں کی شہادت پر ہندوستان والوں کے لئے اُس دن روزہ ختم کر کے عید منانے کا حکم دیا جائے گا۔ حالانکہ یہاں اُس روز انتیسواں (۲۹)، بلکہ کبھی تو اٹھائیسواں (۲۸) ہی روزہ ہوگا — اپنے زمانہ کے بعض اکابر علماء و اہلِ فتویٰ کے متعلق سُنا ہے کہ جب اُن کے سامنے یہ واقعاتی اشکال اس مسئلہ کے متعلق پیش کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آجائے پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی ناگزیر صورتوں میں کیا جاتا ہے — یہ عاجز عرض کرتا ہے اگر اُن بزرگ کو اس مسئلہ کے متعلق حضرت استاذ

کی منارجہ صدر تحقیق وتنقیح پہنچی ہوتی تو اس مسئلہ میں فقہ حنفی کو چھوڑ کے دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دینے کو وہ ناگزیر نہ سمجھتے]

علم اسرار و حقائق

حضرت استاذ علم اسرار و حقائق میں بلا شبہ اس دور کے شیخ اکبر تھے۔ شیخ ممدوح کے علوم سے خاص مناسبت بھی تھی اور شیخ کے بہت سے نہایت اعلیٰ اور قیمتی افادات زیادہ تر اُن کی مشہور کتاب "فتوحات مکیہ" کے حوالہ سے درس میں بیان بھی فرمایا کرتے تھے۔ اور بلا شبہ بعض مشکل دینی حقیقتوں کے بارہ میں اُن سے بڑا انشراح اور اطمینان حاصل ہوتا تھا۔

حضرت استاذ کے شاگرد رشید مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (مقیم حال مدینہ طیبہ) کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے پہلے انھوں نے فیض الباری[1] میں بھی حضرت کے اس سلسلہ کے افادات کا خاصا حصہ لے لیا تھا اور اب حدیث کی جو ایک نئی جامع کتاب وہ خود مرتب فرمائے ہیں ——— جو اُن ہی کے اردو ترجمہ اور مفصل تشریحی نوٹوں کے

---

[1] مولانا بدر عالم صاحب نے مسلسل کئی سال حضرت استاذ کے درس بخاری میں بیٹھ کر حضرت کے درسی افادات کو خاص محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا اور مجلس علمی ڈابھیل نے بڑے اہتمام سے مصر میں چھپوا کر اُس کو شائع کیا۔ گویا صحیح بخاری کے سلسلہ میں یہ حضرت استاذ کے "امالی" ہیں اسی کا نام "فیض الباری" ہے۔ چار ضخیم جلدیں ہیں۔ حضرت کی علمی و درسی خصوصیات کا ایک خاص حد تک اس سے اندازہ ہو جاتا ہے، مولانا بدر عالم صاحب اور مجلس علمی کا بلا شبہ یہ بڑا کارنامہ اور ہم لوگوں پر بڑا احسان ہے۔ مگر کاش یہ کتاب حضرت کی زندگی میں مرتب ہو کر نظر انور سے بھی گذر چکی ہوتی ۱۲۔

ساتھ "ندوۃ المصنفین دہلی" سے "ترجمان السنۃ" کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔ اور پہلی دو جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں ــــ اُس میں بھی انھوں نے حضرت استاذ کے اس خاص الخاص علمی شعبہ کے نہایت گراں قدر افادات کو اُردو میں منتقل کرنے کی اور غیر عالم اُردو خوانوں کو بھی سمجھا دینے کی بڑی مبارک اور کامیاب کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ اکبر کے مضامین کو صحیح و سالم اور محتاط طریقہ پر اردو جیسی کسی زبان میں منتقل کر دینا یقیناً بڑا مشکل کام ہے۔ مگر ترجمان السنہ کے ابتدائی ابواب ہی کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا بدر عالم صاحب کے لئے اس کو کس حد تک آسان فرما دیا ہے۔

جدید مغربی علوم پر بھی نظر

مصر والوں نے جدید مغربی علوم پر عربی میں جو کتابیں شائع کی ہیں اور مختلف مغربی زبانوں سے جو تراجم کئے ہیں حضرت استاذ اُن کے ذریعہ ان نئے علوم اور نئی تحقیقات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ خاص طور سے طبیعیات میں یورپ نے جو علمی ترقی کی ہے اس کے معترف اور اُس کے افادی پہلو کے قدر دان تھے اور اسی وجہ سے مشہور مصری فاضل طنطاوی جوہری کی تفسیر "جواہر القرآن" کے مطالعہ اور اس سے علمی استفادہ کا مشورہ دوسرے اہلِ علم کو بھی دیتے تھے۔ حالانکہ اُس میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو سخت ناپسندیدہ ہیں۔

سلسلۂ درس کی بعض قابلِ ذکر چیزیں

جو طلبہ صرف و نحو کی خامی اور عربی استعداد کی کمزوری کی وجہ سے حدیث صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور اعراب میں غلطیاں کرتے تھے حضرت اُستاذ اُن کے لئے حدیث پڑھنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر طالب علم سے سبق کی قرأت میں کسی

ایسے راوی کے نام میں غلطی ہوتی جو سلسلۂ سند میں بار بار اور کثرت سے آتا تو اس سے بھی آپ کو بڑی سخت اذیت ہوتی تھی اور گویا یہ تکلیف آپ کے لئے ناقابلِ برداشت تھی ــــ ایک دن ترمذی شریف کا سبق ہو رہا تھا۔ ایک طالب علم نے عبارت پڑھنی شروع کی۔ شاید پہلی یا دوسری حدیث تھی سلسلۂ سند میں آیا "عَنِ الشَّعبِیّ" اُس بیچارہ نے بجائے شَعبِیّ کے شُعبِیّ پڑھا۔ حضرت استاذ نے تصحیح فرماتے ہوئے فرمایا "عَنِ الشَّعبِیّ" لیکن اُس بندۂ خدا کی زبان سے پھر وہی نکلا عَنِ الشُّعبِیّ ــــ حضرت نے اُسی وقت سبق سے اُٹھا دیا اور فرمایا جو لوگ اتنے ناقص الاستعداد اور کم فہم ہوں کہ روزانہ سند میں آنے والے راویوں کے صحیح ناموں سے بھی واقف نہ ہوں اور بار بار بتلانے سے بھی نہ سمجھ سکیں اُنکو دورۂ حدیث میں شریک نہیں ہونا چاہئے۔

صحیح قسم کے طالب علمانہ سوالات سے حضرت بہت خوش ہوتے تھے اور بڑی بشاشت کے ساتھ جواب مرحمت فرماتے تھے۔ لیکن مُہمل قسم کے اور لایعنی یا غیر متعلق سوالات کی بالکل گنجائش اور اجازت نہ تھی ــــ جس سال یہ عاجز دورۂ حدیث میں تھا اُس سال دورہ میں تقریباً سو طالب علم تھے ان میں سے ۴۔۵ کو حضرت نے خود متعین فرمایا تھا کہ صرف یہی سوال کیا کریں اور ان کے علاوہ جس کو سبق کے سلسلہ میں کچھ پوچھنا ہو وہ پہلے انکو بتلادے۔ اگر یہ اس کو پیش کرنے کے قابل سمجھیں تو پیش کریں۔ حضرت کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے کسی فضول اور لایعنی بات میں بالکل وقت ضائع نہیں ہوتا تھا ــــ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت کا یہ ہمیشہ کا رویہ تھا یا اُسی سال یہ طرزِ عمل اختیار فرمالیا۔

حضرت استاذ قدس اللہ سرہٗ کے متعلق اس مقالہ میں ذکر کرنے کے لائق علمی اور درسی سلسلہ کی جو باتیں اس وقت یاد آئیں وہ یہی تھیں جو حوالۂ قلم ہو چکیں۔ اب زندگی کے بعض دوسرے شعبوں سے متعلق اسی طرح کی بعض جستہ جستہ چیزیں جو حافظہ میں ہیں وہ بھی ہدیۂ ناظرین کرام ہیں۔

دو فتنوں کا شدید احساس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ کی امت کے بارہ میں آپ کو دو فتنوں کی طرف سے بڑی گہری فکر تھی۔ خارجی فتنوں میں الحاد و مادہ پرستی کا مغربی فتنہ جو اقوام مغرب کے سیاسی غلبہ اور علوم و فنون میں اُن کی بالاتری کی وجہ سے تمام عالم پر چھایا جا رہا ہے۔ اور داخلی و اندرونی فتنوں میں مسیلمۂ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا فتنہ!۔ ان دونوں فتنوں کی شدت احساس سے آپ بےچین رہتے تھے۔ اور ان کے مقابلہ اور امت کی اِن سے حفاظت کرنے کے واسطے تیاری کرنے کیلئے آپ طلبہ کو بڑے درد کے ساتھ ترغیبیں دیتے تھے اور اس کے لئے درس کے علاوہ آپ مستقل تقریریں بھی کرتے تھے۔ بلکہ اُس زمانہ میں حضرت کی تقریروں کا موضوع عموماً یہی ہوتا تھا۔

قادیانی فتنہ سے آپکی غیر معمولی بےچینی

خاص طور سے مؤخر الذکر قادیانی فتنہ کے بارہ میں آپ کی فکر اور بےچینی کا جو حال تھا جن لوگوں نے دیکھا نہیں وہ اُس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے مختلف علاقوں میں مختلف شکلوں میں ارتداد کی جو وبا پھیلی تھی اور خاص کر مسیلمہ کذاب کی جھوٹی نبوت پر ایمان لانے کا فتنہ جو اُس وقت ایک دم زور پکڑ گیا تھا اُس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی بےچینی

اور حرارتِ ایمانی کا ذکر جو روایات میں آتا ہے، حضرت استاذ قدس سرہٗ کے احوال میں بالکل اُس کی جھلک نظر آتی تھی اور اُس زمانہ میں حضرت اپنی اکثر تقریروں میں اُس فتنۂ ارتداد کے زمانہ کے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے جوشِ ایمانی سے بھرے ہوئے خطبات اور کلمات اکثر دُہرایا کرتے تھے۔ خاص طور سے حضرت صدیق اکبر کا وہ ایمان افروز جملہ جو آپ نے حضرت عمرؓ سے اُس وقت فرمایا تھا جب مرتدین کے خلاف جنگ کے بارہ میں مصلحت اندیشی سے کام لینے کا حضرت صدیق اکبر کو انھوں نے مشورہ دیا تھا۔

وہ جملہ کتب حدیث و سیر میں آج تک محفوظ ہے اور حضرت ابوبکر کے مقامِ صدیقیت کی شہادت دے رہا ہے۔ اس کے الفاظ جو حضرت استاذ اُس زمانہ میں اکثر دہرایا کرتے تھے یہ ہیں:۔

"اجبار فی الجاھلیۃ دخوار فی الاسلام انہ قد انقطع الوحی وتم الدین اینقص وانا حیٌّ"[۱]

بہرحال قادیانی فتنہ کی فکر حضرت اُستاذ کی سب سے بڑی فکر تھی اور اس معاملہ میں آپ کا حال وہ تھا جو اُن بندگانِ خدا کا ہوتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ اپنا کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے اور پھر اس کی فکر اور اُس کے لئے بے چینی اُن پر طاری کر دیتا ہے۔ ایک دفعہ حضرت استاذ نے قادیانیت سے متعلق اپنے تین خواب سُنائے تھے۔

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ "تم جاہلیت میں تو بڑے سخت اور زور آور تھے اور آج اسلام کی حالت میں ایسی کمزوری اور نامردی کی باتیں کرتے ہو۔ نبوت ختم ہو چکی۔ وحی کی آمد کا سلسلہ بند ہو چکا اور دین ہر طرح مکمل ہو گیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں دنیا میں زندہ رہوں اور دین میں قطع و برید ہو۔ ۱۲

جو آپ نے دس دس سال کے فاصلہ سے دیکھے تھے ـــــ اپنی اس نالائقی پر آج سخت رنج وافسوس ہے کہ نہ کہیں ان کو نوٹ کیا اور نہ یاد رکھا۔ اجمالاً صرف اتنا یاد ہے کہ پہلا خواب آپ نے قیامِ دہلی کے زمانہ میں دیکھا تھا۔ دوسرا اُس سے ٹھیک دس سال کے بعد، اور تیسرا اُس کے ٹھیک دس سال بعد دیکھا تھا ان تینوں خوابوں میں آپ کو پنجاب کے اس متنبیٔ کذّاب کے فتنہ سے امتِ محمّدیہ کے ایمان کی حفاظت کے لئے جد وجہد کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور اس راستہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد کی بشارت تھی ـــــ مجھے اجمالاً اتنا ہی یاد رہ گیا ہے۔ حضرت نے ایک موقع پر پوری تفصیل سے یہ تینوں خواب سنائے تھے۔ شاید حضرت کے خدّام اور تلامذہ میں سے کسی اور کو یاد ہوں۔

اس فتنہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو کام حضرت استاذ سے لئے اُن کا ذکر اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اپنے ایک مستقل مضمون میں کر چکے ہیں ـــــ (جو غالباً اس مجموعۂ مضامین میں بھی شامل ہو گا جس کے لئے یہ سطریں یہ عاجز لکھ رہا ہے) ـــــ تاہم اس سلسلہ میں دو تین باتیں ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

(۱) قادیانی فتنہ کے ظہور نے جن مسائل اور مباحث پر گفتگو کا سلسلہ پیدا کر دیا ہے اُن میں دو مسئلے مختلف وجوہ واسباب سے علمی طور پر کچھ مشکل ہیں یعنی ان میں لوگوں کے لئے مغالطہ کھانے کی گنجائش بہ نسبت دوسرے مسئلوں کے کچھ زیادہ ہے ـــــ ایک مسئلۂ حیاتِ مسیح علیہ السلام ـــــ اور دوسرا ایمان وکفر کے حدود کا مسئلہ۔

یہ دوسرا مسئلہ اگرچہ فی نفسہٖ مشکل نہیں ہے۔ بلکہ سیدھی سادی بات ہی لیکن کچھ تو مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی بعض مبہم اور غیر واضح تعبیروں نے اور کچھ تکفیر جیسے سنگین معاملہ میں بعض لوگوں کی بے احتیاطیوں نے مسئلہ کو اچھا خاصا مشکل بنا دیا ہے۔

اور اُس میں ایسی اُلجھنیں پیدا کر دی ہیں کہ بہت سے لوگ خواہ مخواہ اُس میں اُلجھ جاتے ہیں — حضرت استاذ نے ان دونوں مسئلوں کی طرف خود توجہ مبذول فرمائی۔ مسئلہ حیاتِ مسیح پر پہلے ایک رسالہ "عقیدۃ الاسلام فی حیٰوۃ عیسےٰ علیہ السلام" لکھا اس کے بعد بطور اُس کے حواشی یا ضمیمہ کے دوسرا رسالہ "تحیۃ الاسلام" تالیف فرمایا۔ یہ دونوں عربی زبان میں ہیں۔ اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت کا طرزِ فکر اور طرزِ بیان و استدلال متاخرین کا سا نہیں ہے جس کا سمجھنا ہم جیسوں کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ بلکہ ائمہ متقدمین کا سا ہے اس لئے افسوس ہے کہ ہر عربی داں کے لئے بھی اِن دونوں رسالوں کو پوری طرح سمجھ لینا آسان نہیں ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جو سلیم القلب ان دونوں رسالوں کو سمجھ کر پڑھ لے۔ اس کو انشاء اللہ اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں رہے گا کہ قرآن مجید کی قطعی شہادت قادیانیوں کے دعوے "ممات مسیح" کے خلاف ہے اور قادیانیوں کی طرف سے جو سیکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات اس مسئلہ پر لکھے گئے ہیں اُن کی بنیاد یا لکھنے والوں کی جہالت پر ہے یا علمی خیانت اور دھوکہ بازی پر۔

جس سال یہ عاجز دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اسی سال ممالکِ عربیہ میں سے غالباً مصر کے ایک بڑے وسیع النظر عالم اور ممتاز فاضل جو مغربی علوم میں بھی خاص دستگاہ رکھتے تھے اور جرمنی میں ایک عرصہ تک ان کا قیام بھی رہا تھا دیوبند تشریف لائے تھے اور دارالعلوم میں چند روز قیام فرمایا تھا۔ اُن کی تشریف آوری کا باعث جیسا کہ اُس وقت سنا تھا صرف یہ ہوا تھا کہ حضرت استاذ کے رسالہ "عقیدۃ الاسلام" کا نسخہ کہیں اُن کی نظر سے گذرا۔ اُسکو دیکھنے

کے بعد انھوں نے ضروری سمجھا کہ اس علم کا آدمی اگر دنیا میں کہیں زندہ موجود ہے تو مجھے اُس سے ضرور ملنا چاہیئے!

دوسرے مسئلہ کفر واسلام کے حدود پر حضرت استاذ نے رسالہ "اکفار الملحدین فی شئ من ضروریات الدین" تالیف فرمایا۔ یہ بھی عربی میں ہے۔ اور ہر عربی داں کے لئے یہ بھی سہل الفہم نہیں ہے۔ لیکن کفر واسلام کے حدود کی ایسی تنقیح غالباً اس سے پہلے نہیں ہوئی۔ اس کو سمجھ کر پڑھنے کے بعد اس میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کرکے اور اس کی امت نے اس کو نبی مان کے اپنے کو اسلام کے وسیع دائرہ سے اس طرح نکال لیا ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر ایمان رکھتا ہو وہ اب کسی طرح ان لوگوں کو مسلمانوں میں شمار نہیں کرسکتا۔ اور اگر وہ (قادیانیت سے اور قادیانیوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ایسا کرے گا تو اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے بعض اہم حصوں کی تکذیب یا آپ کی بعض واضح تعلیمات میں تحریف کرنی پڑے گی۔ اگرچہ وہ اپنی کج فہمی یا نادانی کی وجہ سے اپنی اس پوزیشن کو سمجھتا نہ ہو)۔

"اکفار الملحدین" کا تعلق چونکہ کفر واسلام کے مسئلہ سے تھا اور اس میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اُس کی امت پر کفر کا حکم لگایا گیا تھا اور بلاشبہ یہ بہت اہم معاملہ تھا۔ اس لئے حضرت نے یہ مناسب سمجھا کہ اُس زمانہ کے دوسرے اکابر اور مشاہیر اہل علم کی آراء بھی اُس کے بارہ میں حاصل کی جائیں۔ چنانچہ کچھ اکابر اہلِ علم مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری وغیرہ کی آراء تو پہلے ہی اڈیشن میں شامل کردی گئی تھیں اور اس عاجز کے پاس اُسی اڈیشن کا نسخہ ہے

لیکن دوسرے حلقوں کے بعض علماء و افاضل کی رائیں اور تصدیقیں بعد میں حاصل ہوئی تھیں۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (صدر یار جنگ) مرحوم کے متعلق راقم سطور کو معلوم ہے کہ پہلے اڈیشن کی اشاعت کے کافی عرصہ بعد موصوف کی تصدیق موصول ہوئی تھی۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ بعد کے اڈیشنوں میں بعد والی وہ تصدیقات شامل ہوئیں یا نہیں۔ اگر نہیں شامل ہوئی ہیں اور کہیں محفوظ ہیں تو ان کو شامل ہونا چاہیئے!

الغرض قادیانی فتنہ کی غارت گری سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں ایک کام تو آپ نے یہ کیا کہ ان دو مسئلوں کو خود صاف کیا۔ لیکن چونکہ اُردو میں لکھنے کی حضرت کو عادت نہ تھی اس لئے مجبوراً یہ دونوں رسالے عربی میں لکھے اور اس امید پر لکھے کہ خود علماء کے ذہن جب ان دونوں مشکل مسئلوں کی بارہ میں ان رسالوں سے صاف اور مطمئن ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ جن کو توفیق دیگا وہ ان کے مضامین کو حسب ضرورت اُردو وغیرہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل کر دینگے۔

ایک رسالہ آپ نے مسئلہ ختم نبوت پر "خاتم النبیین" کے نام سے فارسی زبان میں بھی تحریر فرمایا اور یہ آپ نے خصوصیت سے اپنے وطن کشمیر کی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھا۔ کیونکہ وہاں کے جس طبقہ کو آپ سمجھانا چاہتے تھے اُس کے لئے آپ کے نزدیک فارسی زبان ہی اچھا ذریعہ بن سکتی تھی۔

---

(۲) ان رسالوں کے علاوہ آپ کی فکر اور بے چینی نے آپ کے تلامذہ کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس طرف متوجہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اُن سے اس فتنہ کی انسداد میں مختلف شکلوں میں بہت کچھ کام لیا۔ جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے جس مضمون

کا ابھی اوپر میں نے تذکرہ کیا ہے اُس سے ناظرین کو اس کی کچھ تفصیل معلوم ہو گی۔

سلوک و تصوّف

میں عرض کر چکا ہوں کہ علمی شغف وانہماک اور علمی کمال کا آپ پر اتنا غلبہ تھا کہ دوسرے تمام کمالات اور زندگی کے دوسرے پہلو اُس کے نیچے بالکل دبے ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ کی زندگی کا وہ بلند ترین پہلو بھی جس کو "سلوک و تصوّف" سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اس علمی کمال اور شغفِ علمی سے دبا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کی زندگی کے اس رُخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہ عاجز بھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہے۔ لیکن اجمالاً اتنا ضرور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دولت سے بھی حصّۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ اور یقیناً آپ آراستہ باطن اصحاب احسان میں سے تھے۔ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ سے مجاز بھی تھے۔ لیکن اس لائن کی باتیں کہنے کی عادت نہ تھی۔ البتہ ایک دفعہ ایک واقعہ سُنایا۔ اور اُس سلسلہ میں جو کچھ جوش آگیا تو ایک آدھ بات ہم لوگوں کو ایسی بھی سننی میسر آگئی جس سے کچھ سمجھا جا سکا کہ اس فضا میں بھی حضرت استاذ کی پرواز کتنی بلند ہے —— جو واقعہ حضرت نے سنایا وہ یہ تھا۔

فرمایا کہ ایک دفعہ میں کشمیر سے یہاں کے لئے چلا۔ راستہ کی کافی مسافت گھوڑے پر سوار ہو کر طے کرنی پڑتی تھی۔ راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ یہ پنجاب کے ایک مشہور پیر صاحب کے مرید تھے اور ان ہی کے پاس جا رہے تھے۔ یہ مجھ سے اپنے ان پیر صاحب کا اور اُن کے کمالات اور کرامات کا تذکرہ راستہ بھر کرتے رہے۔ انکی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی اُن پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور اتفاق سے وہ مقام میرے راستہ میں بھی پڑتا تھا۔ میں نے بھی ارادہ کر لیا —— جب ہم دونوں پیر صاحب

کی خانقاہ پر پہنچے تو اُن صاحب نے مجھ سے کہا کہ نئے آدمیوں کو اندر حاضر ہونے کے لئے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے میں پہلے جاکر آپ کے لئے اجازت لیلوں چنانچہ وہ اندر تشریف لے گئے اُن بزرگ نے اطلاع پاکر خود اپنے صاحبزادے کو مجھے لینے کے لئے بھیجا اور اکرام سے پیش آئے۔ خود ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے باقی سب مریدین وطالبین نیچے فرش پر تھے مگر مجھے اصرار سے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ کچھ باتیں ہوئیں اس کے بعد اپنے مریدین کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنے طریقہ پر اُن پر توجہ ڈالنی شروع کی اور اس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو ہو کر لوٹنے اور تڑپنے لگے میں یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر آپ توجہ فرمائیں ـــ انھوں نے توجہ دینی شروع کی۔ اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا مراقبہ کر کے بیٹھ گیا۔ بیچاروں نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی لیکن مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ کچھ دیر کے بعد انھوں نے خود ہی فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

حضرت استاذ نے یہ واقعہ اتنا ہی نقل فرمایا اور اُس کے بعد ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا:ـــ

"کچھ نہیں ہے لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے ایک کرشمہ ہے اور کچھ مشکل بھی نہیں معمولی مشق سے ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے ـــ ان باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں۔"

پھر اُسی سلسلہ میں اور اُسی جوش کی حالت میں فرمایا:ـ

"اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو انشاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی

ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے۔ لیکن یہ بھی کچھ نہیں اصل
چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت و سنت پر استقامت ہے۔"

اس ایک موقع کے سوا حضرت سے کبھی کوئی ایسی بات سننا اس عاجز کو یاد نہیں جس سے حضرت کے اس باطنی کمال کا کچھ سراغ ہم کو ملا ہو۔

اپنے بعض اکابر سے خصوصی تاثر

جیساکہ میں عرض بھی کر چکا ہوں سلوک و تصوف کے سلسلہ کی باتیں کرنے کی حضرت استاذ کی عادت نہیں تھی۔ کم از کم اس عاجز کا علم و تجربہ تو یہی ہے۔ اسی لئے اس سلسلہ کے اپنے اکابر کے خاص احوال و واقعات یا اُن کی زندگی کے خاص اس شعبہ کے متعلق اپنے تاثرات حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے سننے کا ہم نیازمندوں کو کبھی شاذ و نادر ہی اتفاق ہوتا تھا۔ ایک ہی دفعہ کی یاد ہے درس ہی میں کسی سلسلہ میں فرمایا:۔

"ہم یہاں آئے (یعنی کشمیر سے ہندوستان) تو دین حضرت گنگوہی کے یہاں دیکھا۔ اُس کے بعد حضرت استاذ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) اور حضرت رائے پوری (یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ) کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا چاہے وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے یہاں جاکر دیکھے۔"

اپنے سلسلہ کے ان اکابر کے علاوہ ہم عصر مشائخ میں سے دو اور بزرگوں کے بارہ میں بھی حضرت استاذ کے بہت بلند کلمات اس عاجز کو یاد ہیں۔ ایک حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب مجددی نقش بندی اور دوسرے حضرت مولانا احمد خاں صاحب مجددی نقشبندی ان دونوں بزرگوں کے متعلق حضرت فرماتے تھے کہ

اس عصر میں یہ نقشبندی سلوک کے امام ہیں۔

یہ دونوں بزرگ ضلع میانوالی کے تھے۔ دونوں کے وصال کو عرصہ ہو چکا ہے دونوں ایک ہی شیخ کے تربیت یافتہ اور مجاز تھے۔ لیکن بعض مسائل میں نقطۂ نظر کے فرق کی وجہ سے درمیان میں کچھ بعد پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت استاذ دونوں کو سلوک کا امام مانتے تھے۔ یہ عاجز بھی ان دونوں بزرگوں کی زیارت سے مشرف ہوا ہے۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

بعض شمائل نبوی کی جھلک

اگرچہ شمائل واخلاق میری اس تحریر کا موضوع نہیں ہے اور غالباً ان چیزوں پر کوئی اور صاحب مستقلاً لکھیں گے۔ لیکن یہاں پہنچ کر حضرت استاذ کی دو تین عادتیں ذکر کرنے کو بھی بے اختیار جی چاہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اخلاق و شمائل کتب حدیث میں روایت کئے گئے ہیں ان میں ایک یہ عادت مبارکہ بھی نقل کی گئی ہے کہ آپ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے (گویا بلا ضرورت بولتے ہی نہ تھے) حدیث کے الفاظ ہیں:—
کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ اس مبارک عادت کا جیسا کامل نمونہ حضرت استاذ کو دیکھا ایسا کوئی اور دیکھنا یاد نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو صرف علمی و دینی افادہ و استفادہ کے لئے اور ناگزیر ضروری باتوں ہی کے لئے زبان دی گئی ہے۔

اور اس خاموشی میں تنفس کی منضبط کیفیت اور ایک خاص نوعیت سے محسوس کرنے والے صاف محسوس کر لیتے تھے کہ پاس انفاس[۵] کی شغل میں برابر مشغول ہیں (۵ حاشیہ برصفحہ ۱۶۰)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات مبارکہ میں صحابۂ کرام ذکر فرماتے ہیں کہ :-

"مسکرانے کی تو بہت زیادہ عادت تھی لیکن کھل کھلا کر ہنستے کبھی نہیں دیکھا"

بالکل یہی حال حضرت استاذ کا تھا۔

اس زمانہ میں غیبت کی بیماری کس قدر عام اور متعدی ہوگئی ہے اور اُس سے اور اُس کے اُڑتے ہوئے جراثیم سے محفوظ رہنا کتنا مشکل ہوگیا ہے اس کا اندازہ بہت سے حضرات کو شاید نہ ہو لیکن اس عاجز کو خوب ہے اور اس لئے میرا یقین ہے کہ اللہ کا جو بندہ اس دَور میں غیبت سے محفوظ ہو وہ اللہ کی خاص حفاظت میں ہے اور یہ اس کی بڑی "کرامت" ہے۔

مگر حضرت استاذ قدس سرہٗ کو الحمد للہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے غیبت سے زبان کو ایسا محفوظ کیا تھا کہ کبھی اشارۃً کنایۃً بھی غیبت کی قسم کی کوئی بات سننا یاد نہیں۔ بلکہ یہ یاد ہے کہ حضرت کے سامنے کسی نے غیبت کی قسم کی کوئی بات شروع کی اور حضرت نے فوراً روک دیا۔

حضرت استاذ کے متعلق بس یہی کچھ منتشر باتیں اس وقت اس مقالہ میں ذکر کے قابل یاد آئیں جو حوالۂ قلم و قرطاس کر دی گئیں۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ؎۱ صوفیہ کے اشغال میں سے صرف پاس انفاس کے متعلق آپکا خیال تھا کہ اس کی اصل حدیث و سنت سے کچھ معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے خود اپنا شغل بھی تھا اور رجوع کرنے والے نیازمندوں کو تلقین بھی فرماتے تھے ۱۲

اے کہ تو مجموعۂ خوبی؟

از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم۔اے

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

برادرِ عزیزم سید ازہر شاہ سلمہٗ نے حضرتنا الاستاذ العلام مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق چند مضامین کا ایک مجموعہ بصورتِ کتاب چھاپنے کا ارادہ کیا ہے اور مجھ سے بھی اس بزم میں شرکت کی فرمائش کی ہے۔ ارادہ خدا مبارک کرے۔ بہت نیک اور اچھا ہے۔ اور آلعزیز کی طلب پر یہ چند سطریں بھی زیرِ تحریر ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت شاہ صاحب کا جو بھاری قرضہ اُن کے تلامذہ۔ اربابِ حاشیہ اور عقیدت مندوں کے ذمّہ حضرت مرحوم کے روزِ وفات سے اب تک برابر چلا آرہا ہے۔ وہ سب تو کیا اُس کا عشرِ عشیر بھی ایک آدھ کتاب لکھ دینے سے کیونکر ادا ہو سکتا ہے؟

حضرت الاستاذ اپنی ذات سے چند در چند علمی کمالات و فضائل کے باعث ایک انجمن اور صحیح معنی میں اس شعر کا مصداق تھے۔

ولیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

خود میرا اپنا حال یہ تھا کہ علمائے سلف کے شوقِ علم، وسعتِ مطالعہ قوتِ حفظ

ذہانت غیر معمولی وسعتِ علم وعمیق نظر وغیرہ، علمی وذہنی کمالات سے متعلق ایک دو نہیں سینکڑوں حیرت انگیز واقعات پڑھے تھے۔ میں ان کو پڑھتا تھا اور دل میں خیال کرتا تھا کہ مؤرخین نے اپنی عام عادت کے مطابق رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کر دیا ہے۔ ورنہ ایک انسان میں بیک وقت اتنے کمالات کیونکر جمع ہو سکتے ہیں۔ مدتوں دماغ پر یہی خیال مسلط رہا۔ لیکن جب حضرت شاہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھا اور حضرت موصوف کی صحبت میں بیٹھ کر سمندر سے کچھ قطرے حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو اب معاً وہ پہلا خیال بدلا اور یقین ہو گیا کہ جب عالمِ اسلامی کے انتہائی دورِ زوال میں بھی دیوبند نامی ایک قصبہ کے افق سے ایک ایسی شخصیت بلند ہو سکتی ہے جو حفظِ حدیث میں حافظ ابنِ حجر عسقلانی اور علامہ عینی وقسطلانی۔ کتبِ قدیمہ کے علم وتبحر میں حافظ ابنِ تیمیہ اور حافظ ابنِ قیم۔ علمِ معانی وبیان میں سعد الدین تفتازانی اور فخر خوارزم جار اللہ زمخشری، منطق اور فلسفہ میں ملا محب اللہ بہاری اور صدر الدین شیرازی۔ عربی میں حافظ اور بدیع الزماں ہمدانی کا اور فارسی شعرو سخن میں خاقانی وانوری کا ہمپایہ اور حریف وہمسر ہو تو پھر یہ کیونکر مستبعد اور عقلاً محال ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اور مسلمانوں کے دورِ شباب وترقی میں ایسے علمائے اعلام پیدا ہوئے ہوں جن کی نظیر مادرِ گیتی کے بطن سے آج تک پیدا نہ ہوئی۔ گویا حضرت شاہ صاحب کو دیکھ کر اپنے علمائے سلف کی عظمت کا صحیح احساس پیدا ہوا اور پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ اتنے ائمۂ سلف کی نسبت جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں وہ مبالغہ پردازی نہیں۔ بلکہ واقعات کا اصل اور بے کم وکاست بیان ہے۔ ؂

جبتک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم		میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

اس بنا پر حضرت شاہ صاحب کا حق کسی درجہ میں اُسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب کہ تن تنہا کوئی ایک شخص نہیں۔ بلکہ ایک مجلس کی شکل میں مختلف علوم و فنون کے ماہر چند علماء ایک جگہ یکسو ہو کر بیٹھ جائیں اور وہ اپنے اپنے ذوق و استعداد کے مطابق حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات و تالیفات۔ رسائل و مقالات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے یہ معلوم کریں کہ حضرت شاہ صاحب کا کس علم و فن میں صحیح مرتبہ و مقام کیا ہے اور اس علم و فن کے دوسرے ائمہ کے بالمقابل حضرت مرحوم کے امتیازات و مخصصات کیا ہیں؟ حضرت شاہ صاحب کا اصل میں جو اُن کے لئے بقائے دوام اور حیاتِ جاوید کا ضامن ہے وہ ہر علم و فن میں اُن کا یہی امتیاز و اختصاص ہے۔ اس بنا پر حضرت مرحوم کی کوئی سوانح عمری اُس وقت تک مکمل ہی نہیں ہو سکتی جبتک کہ اس میں انھیں علمی امتیازات و مخصصات پر کما حقہٗ روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔

حضرت الاستاذ کا یہی علمی جاہ و جلال تھا جس کے باعث بڑے بڑے فضلائے عصر جو مسلک و مشرب کے لحاظ سے حضرت الاستاذ سے کھلا ہوا اختلاف رکھتے تھے۔ حضرت سے جب کبھی دوچار ہوتے تھے تو ان کے لئے یہی علم و فضل کے اس مسند نشین یگانہ کے سامنے سرِ اطاعت و حلقہ بگوشی خم کرنے کے سوا چارہ نہ رہتا تھا۔ علامہ سید رشید المصری قاہرہ کے نامی گرامی علمی و دینی ماہنامہ "المنار" کے اڈیٹر تفسیر المنار اور بیسیوں بلند پایہ علمی کتابوں کے نامور مصنف مفتی محمد عبدہٗ اور سید جمال الدین افغانی کے مخصوص صحبت یافتہ و جانشین خود عرب اور عربی کے بلند پایہ ادیب و انشا پرداز اور خطیب و مقرر۔ اِن تمام اوصاف و کمالات کے باوجود عالم اسلام کی

جب اس نامور شخصیت نے دار العلوم دیوبند کی مسجد میں حضرت الاستاذ کی تقریر عربی زبان میں سُنی جو مسلسل دو گھنٹہ تک جاری رہی تھی اور جس کا اصل موضوع حدیث اور علمائے دیوبند تھا۔ تو یہ مصری عالم سرتاپا حیرت بنا ہوا تھا اور آخر اسے اعتراف کرنا پڑا کہ اگر ہندوستان کے سفر میں اسے مولانا سید محمد انور شاہ کی زیارت و ملاقات کا اور موصوف کی یہ تقریر سننے کا موقع نہ ملتا تو وہ سمجھتا کہ وہ ہندوستان کے سفر سے تہی داماں آیا ہے۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو کون نہیں جانتا ایک نامور مشہور فلسفی شاعر ہونے کے علاوہ فلسفہ کے دقیق النظر عالم تھے۔ اور فلسفۂ یونانی اور اسلامی بھی، اور عہدِ حاضر کا فلسفۂ مغرب بھی، اس کے علاوہ اُن کا اسلامیات کا مطالبہ بھی وسیع تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے برملا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اپنی انگریزی زبان کے چھ لکچروں (لیکچر The Reconstruction of Religious Thought In Islam. کے نام سے چھپے ہوئے اور بہت مشہور ہیں) کی تیاری میں حضرت الاستاذ سے کافی مدد لی ہے۔ یہاں شاید اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ کہ حضرت الاستاذ کا ایک منظوم رسالہ حدوث عالم کی بحث پر ہے۔ یہ رسالہ حجم میں تو بہت مختصر ہی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس مسئلہ (حدوث عالم) پر سارے قدیم وجدید فلسفہ کا عطر اور اُس پر تنقید ہے اور اس بنا پر جب تک کوئی شخص فلسفہ کا اچھا اور بصر عالم نہ ہو وہ اس رسالہ سے پورے طور پر نفع حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ رسالہ چھپ کر آیا تو اُس کا ایک نسخہ حضرتِ الاستاذ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس بھی تحفۃً ارسال فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب جس ذوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے اُس کے اعتبار سے اُن کے لئے کوئی تحفہ

اس چند ورقی رسالہ سے زیادہ قیمتی ہو نہیں سکتا تھا۔ بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا۔ میں اُس زمانہ میں بسلسلۂ طالب علمی لاہور میں مقیم تھا اور گاہے گاہے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی علمی و ادبی مجلس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم تھا کہ مجھ کو حضرت شاہ صاحب کے ادنیٰ درجہ کے تلامذہ میں سے ہی ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اُس بارگاہ علم و فضل میں شخصی تقرب و اختصاص کا مرتبہ بھی میسر ہے اس بنا پر میرے ساتھ کرم و شفقت بزرگانہ کا معاملہ کرتے تھے۔ اور جب کبھی حاضر ہوتا گھنٹوں بڑی بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ مختلف اسلامی مسائل پر گفتگو فرماتے تھے۔ اسی قسم کی ایک صحبت میں ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تو مولانا انور شاہ صاحب کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی اُن کو اس درجہ درک و بصیرت اور اُس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوثِ عالم پر اس رسالہ میں انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ میرے حوالہ کیا اور فرمایا کہ اس میں چار شعر ایسے ہیں جن کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اُن پر نشان لگا دیا ہے۔ آپ اب دیوبند جائیں تو یہ نسخہ ساتھ لیتے جائیں اور شاہ صاحب سے ان اشعار کا مطلب دریافت کرتے آئیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی۔ دیوبند آکر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہونچایا۔ لیکن حضرت الاستاذ نے مجھکو اُن اشعار کا مطلب سمجھانے کے بجائے یہی مناسب خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو

فارسی میں ایک طویل خط لکھیں اور اُسی میں اُن اشعار کا مطلب بھی تحریر فرمادیں۔
یہ خط میں ہی دستی لے کر لاہور آیا اور ڈاکٹر صاحب کو پہنچا دیا۔

یہ حکیم الامت جس نے خود اپنے متعلق کہا تھا:۔

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

اُس کے دل میں حضرت الاستاذ کی کس درجہ عظمت تھی۔ اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرت الاستاذ نے اپنے عہدۂ صدر الاساتذہ سے استعفا دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے کہ آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تأثر ہو۔ میں بہرحال شاہ صاحب کے استعفے کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا" کیا آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں ہے؟ " فرمایا کیوں نہیں؟ مگر دارالعلوم کو تو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی۔ لیکن اسلام کیلئے اب جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اُس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد انھوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے اُن سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی۔ سیاسی۔ معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت

عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے پھر فرمایا "یہ مسائل کیا ہیں؟ اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑی غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کرونگا۔ اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی" چنانچہ باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ اسی جذبہ کے ماتحت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح شاہ صاحب دیوبند کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئیں۔ اور وہیں مقیم ہو جائیں۔ لیکن افسوس! حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اور حضرت شاہ صاحب لاہور کے بجائے ڈابھیل تشریف لے گئے جس کا ڈاکٹر صاحب کو واقعی بڑا ملال اور صدمہ ہوا۔

باخبر حضرات جانتے ہیں کہ پنجاب کے خصوصًا اور ہندوستان کے عمومًا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں قادیانی فتنہ کی شر انگیزی و اسلام کشی کا جو احساس پایا جاتا ہے اُس میں بڑا دخل ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اُس لکچر کا ہے جو ختم نبوت پر ہے اور ساتھ ہی اُس مقالہ کا ہے جو انگریزی میں قادیانی تحریک کے خلاف شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ان دونوں تحریروں کا اصل باعث حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ ؒ ہی تھے۔

ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب انجمن خدام الدین کے کسی سالانہ اجتماع میں شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لے گئے تو ڈاکٹر صاحب ملاقات کے لئے حضرت موصوف کے قیام گاہ پر آئے اور پھر ایک دن اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت کا

صرف ایک بہانہ تھا۔ ورنہ اصل مقصد علمی استفادہ تھا۔ چنانچہ کھانے سے فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ختم نبوت اور قتلِ مرتد کا مسئلہ چھیڑ دیا جس پر کامل دو ڈھائی گھنٹہ تک گفتگو رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی عادت یہ تھی کہ جب وہ کسی اسلامی مسئلہ پر کسی بڑے عالم سے گفتگو کرتے تھے تو بالکل ایک طالب علمانہ انداز سے کرتے تھے۔ مسئلے کے ایک ایک پہلو کو سامنے لاتے اور اس پر اپنے شکوک و شبہات بے تکلفانہ بیان کرتے تھے۔ چنانچہ اب اس وقت بھی انھوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ شکوک و شبہات اور ایرادات و اعتراضات کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ سنا اور اس کے بعد ایک ایسی جامع اور مدلل تقریر کی کہ ڈاکٹر صاحب کو ان دو مسئلوں پر اطمینان کلی ہوگیا اور جو کچھ خلش ان کے دل میں تھی وہ جاتی رہی۔ اور اس کے بعد ہی انھوں نے ختمِ نبوت پر وہ لکچر تیار کیا کہ جو ان کے چھ لکچروں کے مجموعہ میں شامل ہے اور قادیانی تحریک پر وہ ہنگامہ آفریں مقالہ سپردِ قلم فرمایا جس نے انگریزی اخبارات میں شائع ہو کر پنجاب کی فضا میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔

بہرحال یہ دو تین واقعات صرف اس غرض سے لکھے گئے ہیں کہ جن لوگوں کو براہِ راست یا تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ حضرت الاستاذ کے بحرِ ناپیدا کنارِ علم کی جرعہ نوشی کا موقع نہیں ملا۔ وہ ایک جوہرِ گرانمایہ کی قدر و قیمت کا اندازہ اسی سے کر سکیں کہ دنیا کے جوہریوں کی رائے اس کے متعلق کیا تھی!

شکل و صورت قدرت نے حضرت الاستاذ کو جس طرح اقلیم علم کی تاجداری عطا فرمائی تھی اسی طرح جسمانی ہیئت، ڈیل ڈول، قد و قامت اور شکل و صورت میں بھی ایک خاص امتیاز عطا فرمایا تھا۔ مجھ کو ہندوستان مصر و حجاز

اور دوسرے ممالکِ عربیہ کے بڑے بڑے علماء اور مشائخ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔
لیکن جو وجاہت جو وقار و متانت جو دلکشی اور جاذبیت میں نے حضرت الاستاذ
میں پائی وہ کہیں کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ ہزار علماء میں بھی بیٹھتے تو سب سے ہی الگ اور
سب سے ہی نمایاں رہتے۔ دیکھنے والوں کی نگاہ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد وہیں پہ
جاکر ٹھیرتی اور پھر جمتی تو اس طرح کہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتی۔ کشمیر النسل تھے اس لئے
خوب کھُلا ہوا سپید رنگ۔ کشیدہ و دراز قامت۔ چوڑا چکلا سینہ۔ دوہرا اور گداز
جسم۔ بڑی بڑی مگر رسیلی اور شرمیلی آنکھیں۔ کشادہ و فراخ پیشانی۔ طویل مگر ستواں بینی۔
بڑے بڑے کان۔ پُرگوشت اور فربہ چہرہ۔ ابریشم اور حریر کی مانند نرم و سبک جلد۔
چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک کوہِ گراں سبک گامی کر رہا ہے بیٹھتے تھے تو محسوس
ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک آفتاب نظامِ شمس سے وابستہ ستاروں کو اپنے اردگرد لیکر
بیٹھ گیا ہے۔ وہ کبھی سفید اور کبھی سبز سر پر عمامہ اور وہ قامتِ بالا پر سبز قبا! دیکھنے والے
ڈر ڈر کے دیکھتے تھے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے کہ فرمانِ نبوی ہے العین حق۔
غرض کوئی ایک ادا ہو تو اُس کا ذکر کیجئے۔ کوئی ایک خوبی ہو تو اُس کو بیان
کیا جائے۔ جہاں عالم یہ ہو کہ :- ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم !! کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

وہاں خاموشی کو ہی ترجمانیِ دل کا منصب تفویض کر دینے کے سوا اور کیا
چارہ ہے۔

لطافتِ طبع

اسی حسن و جمال ظاہری و باطنی کے باعث طبیعت میں لطافت بھی
بہت زیادہ تھی۔ بہت صاف اور اجلے کپڑے پہنتے تھے۔ غذا میں

بھی روٹی، گوشت وغیرہ جیسی چیزیں رغبت سے نہیں کھاتے تھے۔ البتہ تازہ پھلوں
اور میوے کے عاشق تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ بیس سال میری زندگی میں ایسے گذری ہیں۔
کہ میں نے پرندوں کے علاوہ کوئی اور دوسرا گوشت کھایا ہی نہیں۔ ۲۵ء میں حضرت
الاستاذ اپنی جماعت کے ساتھ جس میں حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا
سید سراج احمد صاحب رشیدی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا بدرعالم
مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا محمد ادریس سکروڈوی شامل تھے۔ راقم الحروف کی
شادی میں شرکت فرمانے کے لئے آگرہ تشریف لائے (چنانچہ اس خاکسار کو یہ شرف
بھی حاصل ہے کہ نکاح حضرت الاستاذ ہی نے پڑھا تھا) تو اگرچہ والد صاحب قبلہ
مرحوم نے اس جماعتِ مقدسہ کی ضیافت کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کے باورچی کا
الگ انتظام کر دیا تھا، جو دونوں وقت عمدہ قسم کے کھانے تیار کرتا تھا لیکن آگرہ
کے نواح میں ایک مقام ہے متّو۔ یہاں کے خربوزے مشہور ہیں۔ اتفاق سے یہ موسم
انھیں خربوزوں کی فصل کا تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے پہلی مرتبہ ایک خربوزہ کھایا
تو بے حد پسند آیا اور والد صاحب سے فرمایا بس ڈاکٹر صاحب! اگر آپ میری
خاطر تواضع کرنی چاہتے ہیں تو سن لیجئے۔ مجھ کو آپ کی بریانی، قورمہ اور کوفتوں وغیرہ
سے کوئی غرض نہیں۔ آپ میرے لئے تو یہ انتظام کیجئے کہ متّو کے خربوزوں کا ایک
ٹوکرہ ہر وقت بھرا ہوا میرے پاس رکھا رہے اور ساتھ ہی ایک چھری دو پلیٹیں اور
ایک طشت اور ایک بالٹی یہ چیزیں بھی رکھی رہیں تاکہ میں جس وقت اور جس قدر بھی
کھانا چاہوں کھا سکوں! والد صاحب قبلہ نے اس ارشاد کی تعمیل کی۔ اور پھر تو
حضرت الاستاذ کا حال یہ تھا کہ کھانا برائے نام کھاتے تھے اور شکم سیری خربوزوں سے

کرتے تھے۔ بھنے ہوئے مرغ کے بھی بڑے قدرداں تھے۔ چنانچہ ڈابھیل میں ہم نے دیکھا ہے کہ خونی بواسیر کے شدید دورے پڑ رہے ہیں چہرہ بالکل زرد ہوگیا ہے۔ لیکن اس عالم میں بھی ناظمِ مطبخ کو ہدایت ہے تو یہی کہ بھنا ہوا مرغ تیار کیا جائے۔ ہم خدام ہر چند بڑے ادب سے عرض کرتے کہ بواسیر کے دورہ کی حالت میں تو مرغ نقصان کرے گا۔ مگر نہ مانتے۔ اور ایسے موقع کے لئے حضرت کا ایک خاص جملہ تھا جو فرمایا کرتے تھے اور وہ یہ کہ "طبیعت بہترین حاکم ہے" یعنی طبیعت جب کسی چیز کو قبول کررہی ہے تو وہ نقصان نہ پہونچائے گی۔

اخلاق علم و فضل میں اللہ تعالیٰ نے جو سربلندی و سرفرازی عطا فرمائی تھی اُسی کے تناسب سے اخلاق بھی نہایت بلند اور پاکیزہ تھے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی سائل حضرت الاستاذ کے پاس آیا ہو اور وہ نامراد گیا ہو۔ جیب میں اس وقت جو کچھ ہوتا' روپیہ ہو یا اٹھنّی سائل کے حوالہ کردیتے۔ ایسی بات کہنے سے احتراز فرماتے تھے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ ایک مرتبہ امرتسر تشریف لے گئے۔ وہاں کے ایک نامی گرامی بیرسٹر صاحب بھی بربنائے عقیدت خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ بیرسٹر صاحب ڈاڑھی مونچھ صاف رکھتے تھے اس لئے حضرت الاستاذ کے سامنے بیٹھے ہوئے شرمندگی سی محسوس کررہے تھے۔ اور بھنچے بھنچے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت الاستاذ نے اُن کی یہ دلی کیفیت بھانپ لی۔ اور فرمایا "بیرسٹر صاحب! آپ کیوں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہے ہیں! ہم دونوں کا فعل اگرچہ مختلف ہے۔ لیکن غرض و غایت دونوں کی ایک ہی ہے۔ یعنی دنیا کمانا! میں اگر مولوی ہوکر ڈاڑھی نہ رکھوں تو مجھے کوئی روٹی نہ دے۔ اسی طرح اگر آپ بیرسٹر ہوکر ڈاڑھی صاف نہ کرائیں

تو ہر شخص سے کہے گا کہ او بے ان کو بیرسٹر کس نے بنایا۔ یہ تو ملاجی ہیں تو پھر آپ کو بھی بیرسٹری کے نام کی روٹی نہ ملے۔ پس جب ہم دونوں کی غرض ایک ہی ہے تو محض اختلاف فعل پر آپ کیوں شرمندہ ہوں۔

مزاح مزاح لطافتِ طبع کی نشانی ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب بھی گاہے گاہے بہت لطیف قسم کا مزاح فرماتے تھے۔

ایک واقعہ لکھتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت الاستاذ کو مزاح کے ساتھ ساتھ چھوٹوں کی دلجوئی اور اُن کی دلدہی کا کس قدر خیال رہتا تھا۔ اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت الاستاذ میری شادی میں شریک ہوئے اور حضرت نے ہی میرا نکاح پڑھا تھا۔ یہ مہینہ مئی کا تھا۔ جو آگرہ کے لئے بہت ہی شدید اور انتہائی سخت موسم ہے۔ بارات کو اعتماد پورہ جو آگرہ سے تین چار اسٹیشنوں کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں جانا تھا۔ ریل کے اوقات کی مجبوری کی وجہ سے دوپہر کو تقریباً دو ڈھائی بجے کے قریب ہم لوگ آگرہ سے روانہ ہوئے اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اعتماد پور کے اسٹیشن پر پہونچ گئے۔ مگر منزل ابھی دومیل دور تھی۔ اسٹیشن سے قیام گاہ تک جانے کے لئے اُس نواح کی مخصوص اور سخت تکلیف دہ سواری یعنی یکہ میں بیٹھنا تھا پھر اس پر لطف یہ کہ راستہ نہایت ناہموار جگہ جگہ گڈھے اور نشیب و فراز وہ کہ الامان! گرمی اپنے شباب پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قافلہ یکوں پر سوار ہوکر اسٹیشن سے شہر کی جانب روانہ ہوا تو راستہ کی ناہمواری اور گڈھوں کی فراوانی کے باعث بُرا حال ہوگیا حضرت شاہ صاحب ٹھیرے ایک نہایت ہی لطیف اور نازک مزاج بزرگ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہی یکہ رکوایا اور پاپیادہ ہوگئے۔ چلچلاتی دھوپ پڑرہی اور لو چل رہی ہے

چاروں طرف سے مٹی کے تودے ہیں کہ فضا میں گشت لگاتے پھر رہے ہیں۔ اور اسی عالم میں حضرت شاہ صاحب منھ اور کانوں کو رومال لپیٹے ہوئے حسبنا اللہ ونعم الوکیل پڑھتے ہوئے قدم بڑھائے اعتماد پور کی آبادی کی طرف چلے جا رہے ہیں آخر خدا خدا کر کے مقام آیا۔ ایک بڑے مکان میں انتظام تھا وہاں ہم لوگوں کو پہنچا دیا گیا۔ یہاں لوگ پہلے سے موجود تھے۔ کوئی پنکھا لے کر دوڑا۔ اور کوئی پانی سے بھرا لوٹا لے کر آیا کہ سخت گرمی میں چل کر آئے ہیں۔ ذرا منھ ہاتھ دھو کر ٹھنڈے ہو لیجئے حضرت شاہ صاحب کو صدر مجلس میں ایک قالین پر بٹھا دیا گیا اور دو تین آدمی بڑے بڑے پنکھے لیکر جھلنے کھڑے ہو گئے۔ جب ذرا پسینہ خشک ہو گیا اور دم میں دم آگیا تو دودھ کے شربت کا ایک بھرا ہوا گلاس میں خود لے کر حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں آنے کو آ تو گیا۔ ورنہ حق یہ ہے کہ شرم کے مارے نگاہ نہیں اُٹھتی تھی۔ کہ میری وجہ سے مولانا شبیر احمد صاحب اور دوسرے حضرات کو عموماً اور حضرت الاستاذ کو خصوصاً کس قدر شدید تکلیف پہونچی ہے۔ اسی قسم کے خیالات اور احساسِ ندامت و شرمندگی تھا جن سے میں اُس وقت دوچار ہو رہا تھا۔ اسی عالم میں دودھ کی شربت کا گلاس حضرت الاستاذ کی طرف بڑھایا۔ حضرت میرے چہرے بشرے سے سمجھ گئے۔ گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور خوش مزاجی کے ساتھ فرمایا:۔ ع

الا یا ایہا الساقی اَدِر کاساً و ناولہا۔

پھر ایک دو گھونٹ لینے کے بعد میری طرف دیکھ کر ذرا تبسم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

اور مولوی صاحب "کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا"

اللہ اکبر کیا اخلاق تھے؟ ایک عبدِ حقیر و بے مایہ کی کیسی دلجوئی و دلدہی تھی! ایک بندۂ گنہگار و ہیچمدان پر کیسی بزرگانہ شفقت کہ مسکراتے ہوئے متوجہ کر کے ایک خاص انداز سے حضرت حافظ شیرازی کا یہ مصرعۂ دوم پڑھنا تھا کہ میری ساری ندامت و شرمندگی اُسی وقت کافور ہوگئی اور پھر حضرت شاہ صاحب نے اپنی کسی بات سے یہ قطعاً محسوس نہیں ہونے دیا کہ سفر کی شدید صعوبتوں کی وجہ سے حضرت کے دل پر ناگواری کا کوئی بھی اثر رہے۔

خودداری

عام اخلاق و فضائل کے ساتھ حضرت میں خودداری بھی انتہا درجہ کی تھی۔ برار کے قضیہ کے سلسلہ میں نظام حیدرآباد دہلی میں آئے ہوئے تھے کہ نظام کی خواہش پر حضرت شاہ صاحب بھی دیوبند سے دہلی تشریف لائے اور ایک وقت مقررہ پر نظام کی قیام گاہ پر پہونچے۔ خبر ہوتے ہی نظام نے اندر بلالیا لیکن حضرت شاہ صاحب پہونچے تو عام آداب و شرائط کا لحاظ اور نہ کسی شاہی دستور و آئین کی پابندی۔ روبرو ہوتے ہی شاہ صاحب نے پیش قدمی کی اور خالص اسلامی طریقہ پر "السلام علیکم" کہا۔ نظام پیشوائی کے لئے آگے بڑھے اور وعلیکم السلام کہکر شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ ایک کرسی پر لے جاکر بٹھادیا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ زیادہ تر دائرۃ المعارف کے کام سے ہی متعلق تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے حدیث کی چند اہم کتابوں اور اُن کے قلمی نسخوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ اگر آپ ان کو بھی حاصل کر کے دائرۃ المعارف کی طرف سے شائع کردیں تو بے شبہ علم حدیث کی اور اُس کی واسطہ سے اسلام کی یہ بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی۔ اُس زمانہ میں دیوبند سے ایک ہفتہ وار اخبار مہاجر نکلتا تھا' جو دارالعلوم دیوبند کی اصلاح طلب جماعت کی ترجمانی

کرتا تھا۔ اس کے اڈیٹر نے اس ملاقات کی خبر چھاپنے کا ارادہ کیا تو عام ذہنیوں کے مطابق "بارگاہِ خسروی میں حضرت علامہ کشمیری کی باریابی" یا اسی مفہوم کی کوئی اور عبارت بطورِ عنوان خبر لکھی۔ اتفاق سے اخبار ابھی چھپا نہیں تھا کہ حضرت شاہ صاحب کو اس عنوان کی اطلاع ہوگئی تو حد درجہ برہم اور خفا ہوئے اور فرمایا کہ "میں ہر چند ایک مردِ بے مایہ و بے بضاعت ہوں لیکن اتنا منکسر المزاج بھی نہیں کہ یہ عنوان گوارا کرلوں کیسی بارگاہِ خسروی اور کیسی اس میں باریابی؟ صاف لکھئے کہ نظام اور انور شاہ کی ملاقات"۔

ایک مرتبہ حیدر آباد کے مولوی نواب فیض الدین صاحب ایڈوکیٹ نے حضرت شاہ صاحب کو اپنی لڑکی کی شادی میں بلایا۔ چونکہ نواب صاحب اور اُن کے خاندان کو علمائے دیوبند کے ساتھ قدیم رابطہ اور قلبی علاقہ تھا۔ اس لئے شاہ صاحب حیدر آباد تشریف لے گئے۔ دورانِ قیام میں بعض لوگوں نے چاہا کہ حضرت شاہ صاحب اور نظام کی ملاقات ہو جائے۔ حضرت کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا "مجھ کو ملنے میں عذر نہیں ہے۔ لیکن اس سفر میں میں نہیں ملوں گا۔ کیونکہ اس سفر کا مقصد نواب صاحب کی بچی کی تقریب میں شرکت تھا۔ اور بس! اور میں اس مقصد کو خالص ہی رکھنا چاہتا ہوں"۔ چنانچہ ہر چند لوگوں نے کوشش کی اور ادھر نظام کا بھی ایما تھا مگر شاہ صاحب کسی طرح رضامند نہیں ہوئے۔

اسی قیامِ حیدر آباد کے زمانہ کا واقعہ ہے جو مجھ کو میرے ماموں قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی نے سنایا تھا۔ موصوف اُس زمانہ میں مستقلاً نواب فیض الدین صاحب کے مکان پر ہی رہتے تھے۔ ماموں کہتے تھے کہ شاہ صاحب کے قیام

کے دنوں میں ایک روز مسٹر اکبر حیدری کا ٹیلیفون آیا کہ میں مولانا انور شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب کو یہ پیغام پہونچایا گیا تو فرمایا "میں تو یہیں ہوں ابھی کہیں جانا نہیں۔ حیدری صاحب آنا چاہتے ہیں تو آجائیں"۔ حیدری صاحب کو یہ پیغام پہونچا تو انھوں نے پھر ٹیلیفون پر کہا کہ بہت اچھا میں حاضر ہوتا ہوں۔ لیکن ایک شرط ہے وہ یہ کہ میرے پہونچنے پر شاہ صاحب کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوں تو اُن کو اٹھا دیا جائے میں تنہائی میں شاہ صاحب سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت الاستاذ کو حیدری صاحب کا یہ پیغام پہونچایا گیا تو فوراً ارشاد فرمایا "یہ ناممکن ہے کہ میں حیدری صاحب سے باتیں کرنے کے لئے حاضرین مجلس کو چھوڑ کر الگ جا بیٹھوں یا اُن لوگوں سے میں کہوں کہ چلے جائیں۔

اسلامی غیرت و حمیت

حضرت شاہ صاحب طبعاً بڑے حلیم اور بردبار تھے۔ لیکن اسلامی اور دینی معاملات میں وہ کسی طرح کے تہاون و تکاسل یا غفلت شعاری کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈابھیل سے دیوبند تشریف لے جا رہے تھے۔ میں اُس زمانہ میں مدرسہ فتحپوری دہلی میں مدرس تھا۔ حضرت کو دہلی سے اسٹیشن پر دیوبند کے لئے گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ اور کئی گھنٹہ وہاں قیام کرنا پڑتا تھا۔ اس فرصت کو غنیمت جان کر میں چند احباب کے ساتھ اسٹیشن پہونچ گیا اور جب تک دیوبند والی گاڑی چھوٹ نہیں گئی اسٹیشن پر حضرت الاستاذ کے ساتھ ہی رہا۔ اس موقع پر دورانِ گفتگو میں حضرت الاستاذ کو معلوم ہوا کہ ابھی حال میں دہلی میں قادیانیوں کا ایک جلسہ تین دن تک ہوتا رہا۔ جس میں ہر قسم کی تقریریں کی گئیں۔ لیکن علمائے اسلام میں سے کسی شخص نے قادیانیوں کے

جلسہ میں پہونچ کر اُن کو مناظرہ کی دعوت نہیں دی۔ قادیانی فتنہ کا استیصال حضرت شاہ صاحب کے دل کو لگا ہوا تھا۔ یہ سنکر بھی انھیں بے حد صدمہ ہوا۔ اور خصوصًا اس بنا پر کہ دہلی میں دیوبند کے پڑھے ہوئے بیسیوں علماء موجود ہیں لیکن اس کے باوجود قادیانی تین دن تک اطمینان سے اپنا جلسہ کر گئے اور کسی عالمِ دین کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ تقریرًا یا تحریرًا مسلمانوں کو اس فتنہ کی ہلاکت انگیزی سے باخبر کر دیتا۔ اُس مجمع میں غالبًا میں ہی ایسا شخص تھا جو حضرت الاستاذ کی توجہات عالیہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمانے لگے "مولوی صاحب! کسی شریف آدمی کی توہین گالی سننے سے ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر وہ کوئی اپنے مرتبہ سے گرا ہوا کام کرے تو اُس سے بھی اُس کی توہین ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ گالی وغیرہ سے۔

اس پر ایک واقعہ سنایا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں ایک متمول اور باعزت شخص نے ایک شاعر زبرقان نامی کے خلاف شکایت کی کہ اُس نے ایک شعر میں اُس کی بڑی شدید ہجو کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے شاعر سے جواب طلب کیا تو اُس نے کہا "امیر المومنین! میں نے تو اُس کی مدح کی ہے نہ کہ مذمت۔ چنانچہ دیکھئے میں کہتا ہوں:۔

دع المکارم لا ترحل لبغیتها　　　اقعد فانك انت الطاعم الکاسی

ترجمہ:۔ تو چھوڑ بزرگیوں اور بڑی طاقتوں کو۔ مت سفر کر اُن کی طلب میں۔ تو بیٹھا بھی رہ (اپنے گھر کے اندر) کیونکہ تو کھلانے والا بھی ہے اور پہننے والا بھی ماشاء اللہ خوب کھاتا پیتا آدمی ہے۔

حضرت عمر نے یہ شعر سنا تو فرمایا استغاثہ بالکل صحیح ہے۔ درحقیقت ایک

شریف انسان کی توہین اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ حصول مکارم کو غریبوں کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے۔

بہر حال یہ چند سطریں صرف اس مجلس میں شرکت کی غرض سے لکھی ہیں۔ جو میاں انزھر سجائے ہیں۔ ورنہ میں خود اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان سے حضرت الاستاذ کا حق کیا ادا ہو سکتا ہے۔

اللہ اکبر کیسے مبارک تھے وہ لمحات زندگی جو اس علم و عمل کے ایک زندہ پیکر کی معیت و صحبت میں بسر ہوئے اور کیسی لطف آفریں و روح پرور ساعتیں تھیں وہ جو اس شجرۂ صلاح و تقویٰ کے زیر سایہ گذریں۔ فرحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً ونور برھانہٗ

حضرت امام العصر شاہ صاحب رحمہ اللہ اور ان کی تصانیف

از مولانا محمد یوسف صاحب بنوری

علمی دنیا کی تاریخ میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کے ذاتی کمالات و علوم کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دنیا ان کے کمالات سے واقف بھی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم مخلوق میں اور اللہ تعالیٰ کی اس وسیع سرزمین میں کتنی ایسی ہستیاں گذری ہوں گی جن کا صحیح علم اور ان کی علمی گہرائیوں کا صحیح اندازہ کسی کو نہ ہوا ہو۔

اور یہ بھی ایک مسلم امر ہے کہ کوئی شخص تصانیف کے محض عددی کمیت و اکثریت کی بنا پر علامۂ عصر بن جائے ایسا نہیں ہو سکتا۔ علماءِ اسلام کے علمی سمندر میں کثرت سے ایسی بیش بہا موتی موجود ہیں جو کبھی کسی تاجِ مرصع کی زینت نہیں بنے

قدرت کے معدنی کائنات میں ایسے بے بہا جواہرات موجود ہیں کہ "کوہِ نور" نامی ہیرے اور اس کی چمک و تابانی کے سامنے ماند پڑ جائیں۔ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا

خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم (حجر-۲۱)

حافظ حدیث امام تقی الدین ابن دقیق العید رحمہ اللہ جیسے محقق عصر حق کے متعلق حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ میں ایسا دقیق النظر محدث نہیں گذرا۔ اگر ان کی کتاب "احکام الاحکام" یا "کتاب الامام" "شرح الالمام" کی ناتمام نقول کتابوں میں نقل نہ ہوتیں تو شاید موجودہ نسل کو ان کے کمالات کا کچھ علم بھی نہ ہوتا۔

کیا کوئی یہ گمان کرسکتا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی مصری اپنی کثرت مصنفات کی وجہ سے ابن دقیق العید جیسے محقق روز گار سے سبقت لے جائیں گے ؟!

بسا اوقات دفتر تاریخ کی ورق گردانی سے بھی اس کا پورا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ معاصرین فیض یافتہ، اور چشم دید کمالات کے مشاہدہ کرنے والوں کو جن علمی حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان کے مؤلفات کے صفحات پڑھنے والوں کو پورا احساس سے بے حد مشکل ہے۔ پھر قدرت کا عجیب نظام ہے کہ علماء امت اور ارباب ولایت کے مزاج بھی اتنے مختلف ہیں کہ عقل نارسا حیران رہتی ہے۔ کوئی دینی خدمت۔ تعلیم وارشاد، افادہ وافاضہ کے پیش نظر تالیف وتصنیف میں مشغول نظر آتا ہے، کوئی اصلاح وتربیت کے حرص کی خاطر حلقۂ صحبت واستفادہ کو وسیع کرنے کی فکر میں مصروف ہے۔ کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ خمول پسندی وتواضع وشہرت سے نفرت کی بناء پر گمنامی کو اپنا شیوہ امتیاز بنائے ہوئے ہے۔ نہ نظام قدرت کے عجائبات کی انتہاء ہے۔ نہ کائنات کی نیرنگیوں کا شمار۔

عبارات تفنی الدہر مانی حسنہا
دونها ما ذکرنا الحسن وزنا

امام العصر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک طرف علمی تبحر، تحیر الافکار جامعیت، حیرت افزا دقت نظر، فوق العادہ حافظہ، کتب بینی و مطالعہ کا عجیب شوق و ذوق عطا فرمایا۔ دوسری طرف خمول پسندی، وجاہت و شہرت سے نفرت اور تواضع و فروتنی کے کمالات سے سرفراز فرمایا۔ حضرت امام العصر کی پوری زندگی مطالعۂ کتب میں گذری اور ساری زندگی میں کچھ نہ کچھ جواہر ریزے قلم سے نکلتے رہے مشکلات و حقائق پر یادداشتیں لکھتے رہے اور علمی افکار و نظریات بھی قلمبند کرتے رہے۔ لیکن کبھی مستقل تالیف و تصنیف کا شوق دامنگیر نہ ہوا۔

کاش اگر حضرت کو اپنے علوم و معارف کے پیش نظر تصنیف و تالیف کا سواں حصہ بھی شوق ہوتا تو آج علمی دنیا کا دامن ان کے علوم و تحقیقات سے پُر ہوتا۔ اور ان کے علمی جواہرات سے اہل علم مالا مال ہوتے۔ اور آئندہ کی نسلیں صحیح معنے میں ان کی معرفت و قدردانی میں کوتاہی نہ کرتیں۔

لیکن تاہم الحمد للہ قرآن کریم واحادیث و فقہ اسلامی کے بعض مشکلات علم کلام کے مشکل ترین مسائل، خلافیات امت کے معرکۃ الآراء مسائل پر اور عقائدِ محمدیہ کے امہات واُصول پر چند ایسے رسائل یادگار چھوڑ گئے جن کی نظیر اس علمی ذخائر میں مشکل سے ملے گی۔ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھایا کیا مجال کہ بعید سے بعید نقل، دقیق سے دقیق نکتہ، عقلی و نقلی کوئی پہلو تشنہ رہ جائے دنیائے اسلام کے وسیع النظر محقق عالم شیخ محمد زاہد کوثری مرحوم نے قاہرہ میں ایک دفعہ دوران ملاقات میں فرمایا کہ احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام

صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدث و عالم امت میں نہیں گذرا۔ اور پھر فرمایا کہ یہ کوئی کم زمانہ نہیں۔ غالباً موصوف کے الفاظ یہ تھے :۔

"لم یأت فی الأمة بعد الشیخ ابن الهمام مثله فی استثارة الابحاث النادرة من الاحادیث ولیست هذه المدة بقصیرة اھ" اور حیرت یہ ہوتی تھی کہ کسی موضوع پر جب کچھ تحریر فرمایا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید ساری زندگی اسی ایک موضوع کی نذر ہوئی ہے۔

ایک دفعہ ۱۳۴۷ھ میں مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی مرحوم حیدر آباد سے دیوبند تشریف لائے تھے اس وقت مرحوم امور مذہبی کے صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ حضرت کی زیارت کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ نے مشکلات القرآن کا کچھ تذکرہ فرمایا اور بطور مثال سورۂ مزمّل کی پہلی آیتوں میں علماء کو جو علمی اشکال تھا اس کا ذکر فرما کر اپنی طرف سے ایک ایسی تفسیر بیان کرکے ایسی تحقیق کی کہ وہ مشکل حل ہو جائے۔ شیروانی صاحب نے حیران ہو کر بے ساختہ فرمایا کہ حضرت بات بالکل صاف ہو گئی ۱۳۴۸ھ کا واقعہ ہے کشمیر سے واپسی پر حضرت لاہور ایک دو روز کے لئے اُترے۔ آسٹریا بلڈنگ میں قیام تھا میزبان نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کو بھی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے حضرت شاہ صاحب نے بہت سے علمی جواہرات بیان فرمائے۔ انمیں ایک موضوع یہ تھا کہ امت میں سائنس و طبعیات میں جو حیرت انگیز ترقیاں ہوئی ہیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں ان کی نظیریں موجود ہیں، اور انبیاء کرام کی معجزات میں یہ چیزیں قدرت نے اس لئے ظاہر کرائیں کہ یہ آئندہ امت کی ترقیات کیلئے

تمہید ہوں۔ اور فرمایا کہ "ضرب الخاتم" میں اسی کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے راقم الحروف نے حضرت کی ایماء پہ یاد سے وہ شعر سنائے جنمیں ایک شعر یہ تھا:۔

وقد قیل ان المعجزات تقدمت بما لم تقی فیہ الخلیقۃ فی مدی

میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم بے حد محظوظ ہوتے رہے۔

بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی مصنف نے بقصد تقریظ لکھوانے کوئی کتاب حضرت کے سامنے پیش کی اور ظاہر ہے کسی اہم موضوع پر کوئی محقق سنجیدہ اہل قلم یا معیاری مصنف علمی کتب خانوں کی اس فراوانی میں کیا کسر باقی رکھے گا۔ لیکن دیکھا یہ گیا کہ حضرت سرسری نظر میں اہم ترین اصلاحات فرما کر بیش قیمت اضافہ بھی فرما دیا کرتے تھے جس سے مصنف حیرت میں پڑ جاتا تھا۔ افسوس کہ میں اس مختصر مقالے میں اس کے نظائر پیش نہیں کر سکتا۔ راقم الحروف کی کتاب "نفحۃ العنبر" میں اس کی کچھ مثالیں ملیں گی جو امام العصر کی حیات کے چند صفحے اب سے اٹھارہ بیس برس قبل راقم کے قلم سے بطور نقش اول نکل چکے ہیں۔ اور اس حیرت انگیز کمال پر یہ کمال کہ جب تک کوئی شخص خود مسئلہ نہ دریافت کرے اپنی طرف سے کبھی سبقت نہ فرماتے تھے۔ درحقیقت اس حیرتناک علمی تبحر کے ساتھ یہ وقار و سکون اور علم کے اس متلاطم سمندر کے ساتھ یہ خاموشی امام العصر کی مستقل کرامت ہے۔

مخدوم و محترم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کا ایک بلیغ جملہ اس حقیقت کے چہرے سے پوری نقاب کشائی کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

مرحوم کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں (معارف غالباً جون ۱۹۳۳ء) غرضکہ

حضرت امام العصر رحمہ اللہ نے باوجود اس تحیر العقول جامعیت، تبحر، کثرت معلومات وسعت مطالعہ، حیرت ناک استحضار و قوت حفظ کے شوق سے کبھی تالیف و تصنیف کا ارادہ نہیں فرمایا۔ اور امت کے دل میں یہ تڑپ رہی کہ کاش کسی اہم کتاب حدیث پر کوئی خدمت یادگار چھوڑ جاتے۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے ایک دفعہ عرض کیا کہ اگر جامع ترمذی وغیرہ پر کوئی شرح تالیف فرما دیتے تو بہت بڑا ذخیرہ ان کے لئے سرمایہ ہوتا۔ غصہ میں آکر فرمانے لگے کہ زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو پڑھا کر پیٹ پالا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی حدیث کی خدمت بیچی رہے۔ ہاں دینی اور کچھ علمی شدید تقاضوں کی وجہ سے چند رسائل یادگار چھوڑ گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ علمی دنیا کچھ نہ کچھ ان کی علمی تحقیقات و خصوصیات سے مستفید رہے۔ نیز ان کے تلامذہ و اصحاب کی وساطت سے بھی اچھا خاصا ان کے علمی کمالات کا ذخیرہ امت کے ہاتھ آیا۔ اس طرح یہ حقیقت ہے کہ یگانۂ عصر جامع کمالات جامع الکمالات امام دنیا میں علم کا آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔ میرے ناقص علم میں غیر منقسم ہندوستان کی سرزمین میں جامعیت و تبحر کے اعتبار سے ایک حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور ان کے بعد حضرت امام العصر کشمیری کی نظیر نہیں ملے گی۔

ہندوستان کے غیر مقلد حضرات کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر بھی چند رسائل کی تالیف کی نوبت آئی جن میں "فاتحہ خلف الامام" "رفع یدین" "مسئلہ وتر" زیر بحث آئے ہیں۔ ضمناً اور بہت سے مسائل آگئے ہیں۔ فتنۂ قادیانیت کی تردید کے سلسلہ میں چند تالیفات فرما چکے ہیں جن میں امت محمدیہ کا قطعی عقیدہ "ختم نبوت"

کی تحقیق بھی آگئی ہے جو دینِ اسلام کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس طرح کفر و ایمان کا مدار جن امور پر ہے اس کی تحقیق واضح طور سے ہو گئی۔ حیاتِ مسیح علیہ السلام کے عقیدہ کی تفصیلات بھی آگئی ہیں۔ اس طرح علمِ کلام کے چند مشکل ترین مسائل کا فیصلہ بھی فرما چکے ہیں۔

حضرت امام العصر کی تالیفی خصوصیات

"فیض الباری" کے مقدمہ ص۲۱ پر راقم نے لکھا تھا:-

ومنھا انہ کان عنی بحل المشکلات اکثر منہ بتقریر الابحاث وتکریر الالفاظ۔

منجملہ حضرت شیخ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ زیادہ تر اہتمام مشکلات کے حل کرنے کا فرماتے تھے۔ بحثوں کو پھیلانے اور الفاظ بار بار استعمال کرنے پر زیادہ توجہ نہیں فرماتے تھے۔

ومنھا انہ کان یھمہ اکثار المادۃ فی الباب دون الاکثار فی بیانھا وایضاحھا۔۔۔ ثم ان ھذا الایجاز فی اللفظ والغزارۃ فی المادۃ اصبح لہ دابا فی تدریسہ وتالیفہ وبیانات کما قال علی رضی اللہ عنہ ما رأیت بلیغا قط الا ولہ فی القول ایجاز وفی المعانی اطالۃ۔ حکاہ ابن الاثیر الادیب فی المثل السائر وکأن ما یہ ما کشف

نیز یہ کوشش فرماتے تھے کہ موضوع کے متعلق مادہ زیادہ پیش کیا جائے اسکی توضیح و تشریح کے زیادہ درپے نہیں ہوتے تھے۔ لفظوں میں اختصار اور معانی میں کثرت ان کی طبیعت و عادت بن گئی تھی۔ خواہ تدریس میں ہو یا تصنیف و تالیف میں۔

حضرتِ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب کسی بلیغ کو دیکھا تو یہ دیکھا کہ الفاظ کے اختصار کے ساتھ معانی میں تفصیل کرتا ہے

عنه ابن النديم فی الفهرست ۔	ابن ندیم کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں:۔
النفوس (اطال اللہ بقاءک) تشرئبّ الی النتائج دون المقدمات وترتاح الی الغرض المقصود دون التطویل فی العبارات اھ	طبیعتیں نتائج کی منتظر رہتی ہیں نہ مقدمات کی۔ اور مقاصد سے خوش ہوتی ہیں نہ صرف عبارت کی طوالت سے۔
وبلغنی ان حکیم الامۃ الشیخ التھانوی یقول۔ ان جملۃ واحدۃ من کلام الشیخ ربما تحتاج فی شرحھا وایضاحھا الی تالیف رسالۃ اھ	مجھے پہنچا ہے کہ حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی فرمایا کرتے کہ بسا اوقات حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ایک جملہ کی تشریح میں ایک رسالہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

یتیمۃ البیان مقدمہ مشکلات القرآن ص۳ میں اور نفحۃ العنبر ص۱۰۸ پر راقم الحروف نے حضرت امام العصر کی تالیفی خصوصیات کو وضاحت تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے:۔

جامعیت، دقت نظر و سرعت انتقال ذہنی و کثرت آمد کی بنا پر طبیعت اختصار کی عادی بن گئی تھی۔ معلومات کی فراوانی کی وجہ سے ضمنی مضامین کثرت سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ حدیث کے لطائف میں جب علم عربیت وبلاغت کے نکات کا بیان شروع ہوجاتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علوم عربیت کی تحقیقات ہی شاید کتاب کے اصلی موضوع ہیں۔ بعید ترین و نادر ترین مآخذ سے وہ نقول پیش فرمایا کرتے جن سے محققانہ شروح حدیث کا دامن بھی خالی ہوتا تھا۔ افسوس کہ اختصار کی وجہ سے میں اس کی مثالیں پیش نہیں کر سکتا۔

اس لئے عام نگاہیں ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں اور بہ مشکل عام طبیعتیں لذت اندوز ہوتی تھیں حضرت کے مختصر سے مختصر رسالے کے لئے بھی سارے علوم سے نہ صرف مناسبت بلکہ مہارت ان میں ضروری ہے۔ ان تصانیف کی صحیح قدردانی وہی عالم کرسکتا ہے کہ کسی موضوع میں ان کو مشکلات پیش آئی ہوں اور پورے متعلقات کی چھان بین کر چکا ہو اور تشفی نہ ہوئی ہو۔ پھر حضرت امام العصر کی تالیف کا غور سے مطالعہ کی توفیق ہو اس وقت قدرشناسی و قدردانی کی نوبت آئے گی اور حقائق مطلوبہ کے چہرے سے پردے ہٹتے چلے جائیں گے۔ خالی ذہن غیر مبتلا شخص جس کو کبھی کسی مشکل کی خلش ہی پیش نہ آئی۔ سطحی مضامین، وشگفتہ عبارت سے مانوس ہو وہ کبھی قدر نہیں کرسکتا۔

حضرت استاذ محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کی کتاب "کشف الستر عن صلاۃ الوتر" کی قدر اس وقت ہوئی کہ اس مسئلے پر جتنا ذخیرہ حدیث کا مل سکا سب کا مطالعہ کیا پھر رسالہ مذکورہ کو اول سے آخر تک بار بار پڑھا اس وقت اس کی صحیح قدر ہوئی۔ اب میں اس مختصر تمہیدی مضمون کو امام مسروق بن الاجدع المتوفی ۶۳ھ کے ایک تاریخی کلام پر ختم کرتا ہوں جس کو امام تاریخ ابن سعد نے اپنی کتاب "الطبقات" میں ذکر کیا ہے۔ طبقات ابن سعد (جلد ۲ صفحہ ۱۱۵) باسناد صحیح مسروق سے روایت ہے، مسروق (کوفہ کے کبار تابعین میں سے ہیں۔ مخضرم ہیں یعنی عہد نبوت کو پا چکے ہیں) فرماتے ہیں:۔

لقد جالست اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوجدتھم کالاخاذ۔ فالاخاذ یروی	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی مثال تالابوں و حوضوں جیسی ہے

الرجل، والاخاذ یروی الرجلین، والاخاذ یروی العشرۃ، والاخاذ یروی المائۃ والاخاذ لو نزل بہ اھل الارض لاصدرھم فوجدت عبد اللہ بن مسعود من ذلک الاخاذ اھ

یعنی چھوٹا و بڑا کوئی تالاب ایک آدمی کی سیرابی کیلئے کافی ہوتا ہے کوئی دو کیلئے کوئی دس کیلئے کوئی سو کیلئے اور بعض ایسے تالاب ہیں اگر روئے زمین والے سب پینے کیلئے آئیں تو سب سیراب ہو کر جائیں حضرت عبد اللہ بن مسعود کی مثال اسی تالاب کی ہے

راقم الحروف کہتا ہے کہ علماء امت کی مثال بھی یہی ہے۔ اور حضرت امام العصر شاہ صاحب کی مثال عبد اللہ بن مسعود کی ہے کہ ان کا وجود باوجود پوری امت کی سیرابی کے لئے کافی تھا۔

اب ان تصانیف کی فہرست پیش کرتا ہوں جو حضرت اپنے قلم حقیقت رقم سے تالیف فرما چکے ہیں۔

امام العصر کی تصانیف

(۱) عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام۔

یہ کتاب ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ عقیدۂ حیات مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم کی کیا ہدایات ہیں۔ اس کی تفصیل ہے اس میں احادیث کا استقصاء و استیفا نہیں کیا گیا ہے۔ بقدرِ ضرورت ضمناً احادیث کا ذکر ہے اس لئے اس کا دوسرا نام ہے حیاۃ المسیح بمتن القرآن والحدیث الصحیح ضمنی مسائل کی تحقیقات کئی آگئی ہیں۔

عقیدہ حدوث عالم۔ عقیدہ ختم نبوت۔ کنایہ حقیقت ہے یا مجاز؟

ذوالقرنین ویاجوج وماجوج کی تحقیق۔ سد ذی القرنین کی تعیین وغیرہ وغیرہ۔ حضرت شیخ عثمانی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحب کی سب کتابوں میں واضح ومفصل وشگفتہ ہے۔

(۲) تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسٰے علیہ السلام۔

یہ کتاب ۱۵۰ صفحات کی ہے "عقیدۃ الاسلام" کی تعلیقات اور اس پر اضافات ہیں۔ ادب وبلاغت کی عجیب وغریب ضمنی تحقیقات آگئی ہیں۔

(۳) التصریح بما تواتر فی نزول المسیح۔

نزول مسیح علیہ السلام کے متعلق احادیث وآثار صحابہ کو اس میں بہت تفتیش ودیدہ ریزی سے جمع کیا گیا ہے۔ جن کی تعداد تقریباً سو تک پہنچ جاتی ہے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا اس پر ایک نفیس مقدمہ بھی ہے۔

(۴) اِکفار الملحدین فی ضروریات الدین۔

۱۲۸ صفحہ کا ایک عجیب وغریب رسالہ ہے۔ جس میں کفر وایمان کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالی گئی اور اصولی طور پر بحث کی گئی ہے کہ مدار ایمان کیا کیا امور ہیں اور کن عقائد واعمال کے انکار سے کفر لازم آتا ہے اور کس قسم کے عقائد میں تاویل کرنا بھی موجب کفر ہے۔

اس موضوع پر امت میں سب سے پہلے امام غزالیؒ نے قلم اٹھایا تھا۔ "فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" ان کا رسالہ مصر وہندوستان میں عرصہ ہوا کہ شائع ہو چکا ہے۔ اس رسالے کی عمدہ تحقیقات حضرت شیخ نے چند سطروں میں نقل فرمائی ہیں۔ عصرِ حاضر میں یہ ایک اہم ترین دینی خدمت تھی

وہ حضرت نے پوری فرمادی۔ اس پر سارے علماء دیوبند کی رائیں اس لئے لکھوادی ہیں تاکہ اہلِ حق جماعت میں اس اہم ترین مسئلہ میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

(۵) خاتم النبیین۔

یہ عقیدہ "ختم نبوت" میں عجیب رسالہ ہے۔ جو ۹۶ صفحات پر پھیل گیا ہے۔ فارسی زبان میں ہے۔ لیکن دقیق۔ حضرت کا خاص اسلوب علمی کمالات۔ اور وہبی علوم کے نمونے پورے طور پر جلوہ آرا ہیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب نے بھی ایکدفعہ ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ بہت دقیق ہے عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

(۶) فصل الخطاب فی مسئلۃ أم الکتاب

مسئلہ "فاتحہ خلف الامام" جو عہدِ صحابہ سے لے کر آج تک معرکۃ الآراء موضوع رہا ہے۔ اس پر ۱۰۶ صفحات کا محققانہ رسالہ ہے۔ حدیث عبادہ بروایت محمد بن اسحاق کی عجیب وغریب تحقیق کی گئی۔ بڑی تدقیق کے ساتھ اس اہم موضوع کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ لفظ "فصاعداً" کی تحقیق میں ۱۲-۱۳ صفحات پر مشتمل دقیق ترین مضمون آگیا ہے۔ یہ مضمون چونکہ عام دسترس سے بالکل باہر تھا راقم الحروف نے اپنی کتاب معارف السنن شرح ترمذی (مخطوط) میں اس کی جدید اسلوب عصری سے اس کی تحلیل تشریح کی ہے۔ اور شگفتہ عربی میں اس کی تسہیل کی کوشش کی ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم کو ڈابھیل میں جب یہ مضمون سنایا نہایت محظوظ ہوئے۔ اور بے ساختہ فرمایا کہ حق تعالیٰ جزاءِ خیر عطا فرمائے۔

کہ اس مشکل ترین دقیق و غامض مضمون کی ایسی افصاح کی کہ شاید مقدور میں اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔

(۷) خاتمۃ الخطاب فی فاتحۃ الکتاب

مسئلہ" فاتحہ خلف الامام" پر فارسی زبان میں لطیف رسالہ ہے۔ بلا مراجعت کتاب دو روز میں محرم ۱۳۲۰ھ میں تالیف فرمایا ہے مسئلہ پر جدید انداز میں استدلال ہے۔

حضرت مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ کی اس پر تقریظ بھی ہے۔ حضرت شیخ نے وقت نظر کی خوب داد دی ہے۔

(۸) نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین

۱۴۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مسئلہ خلافیہ نماز میں رکوع سے پہلے اور بعد میں ہاتھوں کو اٹھانے کے موضوع پر نہایت عجیب انداز میں تحقیق فرمائی ہے۔ اور نہایت انصاف سے محققانہ انداز میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ مسئلہ میں اختلاف عہدِ صحابہ سے ہے اور اس میں اولویت کا اختلاف ہے۔ جائز ناجائز کا اختلاف نہیں ضمنی طور پر بہت نفیس مباحث آگئے ہیں۔

(۹) بسط الیدین لنیل الفرقدین

سابق الذکر موضوع پر ۴۲ صفحہ کا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ سابق "نیل الفرقدین" کا تکملہ ہے۔ اس موضوع پر قدماء محدثین سے لے کر متاخرین اور عصرِ حاضر تک بہت کچھ خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ اس پائے مال موضوع پر ایسے محققانہ اسلوب میں جدید استدلالات دقیق استنباطات پیش کرنا یہ حضرت شاہ صاحب ہی کا حصہ

ہے۔ الشیخ الامام محمد زاہد الکوثری اپنی کتاب "تانیب الخطیب فیما ساقہ فی ترجمۃ ابی حنیفۃ من الاکاذیب" صہ۸ میں رقم طراز ہیں:۔

وھذا البحث ای رفع الیدین طویل	رفع الیدین کے موضوع پر جانبین سے
الذیل الفت فیہ کتب خاصۃ من	مخصوص کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس موضوع
الجانبین ومن احسن ما الف فی ھذا	پر بہترین کتابیں علامہ حبر و بحر مولانا محمد
الباب نیل الفرقدین وبسط الیدین	انور شاہ صاحب کشمیری کی دو کتابیں ہیں
کلاھما للمولانا العلامۃ الحبر البحر	نیل الفرقدین وبسط الیدین جن میں
محمد انور شاہ الکشمیری وھو جمع	سارا لب لباب آگیا ہے اور یہ شافی
فی کتابیہ لب اللباب فشفی وکفی اھ	وکافی ہیں۔

درحقیقت صحیح قدردانی ایسے محققین ہی کر سکتے ہیں۔

(۱۰) کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر۔

مسئلہ "وتر" کے بارے میں امت میں جو اختلافات چلے آئے ہیں، کل خلافیات سولہ سترہ تک پہنچ جاتے ہیں ان میں جو مشکل ترین وجوہ ہیں انکی ایسی تحقیق وفیصلہ کن تدقیق فرمائی ہے کہ کسی منصف مزاج کو مجال انکار باقی نہیں رہتا رسالہ ۹۸ صفحوں میں تمام ہوا۔ دوسرے ایڈیشن میں بمقدار ایک ثلث تعلیقات کا اضافہ فرمایا ہے۔ مسئلہ آمین بالجہر، وضع الیدین علی الصدر وغیرہ مسائل کی تشفی کن تحقیق فرمائی گئی ہے۔ شروع میں خطبہ کے بعد ایک فصیح وبلیغ عربی کا قصیدہ جو نہایت ہی مؤثر اور رقت انگیز ہے۔ ہر حیثیت سے قابل دید ہے۔

(۱۱) ضرب الخاتم علی حدوث العالم۔

"حدوث عالم" علم کلام و فلسفہ کا معرکۃ الآرار موضوع ہے متکلمین و فلاسفۂ اسلام نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں مستقل رسائل کا موضوع بحث رہا ہے شیخ جلال الدین دوانی نے بھی اس پر ایک رسالہ "الزوراء" کے نام سے تصنیف کیا ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ نے اس سنگلاخ وادی میں قدم رکھا ہے اور الٰہیات و طبعیات، اور قدیم و جدید فلسفہ کی رو سے اتنی کثرت سے دلائل و براہین قائم کئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اور "حدوث عالم" کا مسئلہ نہ صرف یقینی بلکہ بدیہی بنجاتا ہے لیکن افسوس کہ حضرت نے ان براہین و دلائل و شواہد کو چار سو شعر میں منظوم پیش کیا ہے ظاہر ہے کہ شعر کا دامن تفصیلات سے خالی رہتا ہے۔ لیکن اس کے ایضاح و حل کے لئے ہزاروں حوالے کتب متعلقہ کے دیدیئے گئے جن میں صدرؔ شیرازی کی "اسفار اربعہ" فرید وجدی، وبستانی کے دائرۃ المعارف خصوصیت رکھتی ہیں راقم الحروف نے حضرت کے علم سے متعلقہ حوالہ جات تقریبًا ایک سو صفحات میں بڑی عرق ریزی سے جمع کئے تھے جس سے حضرت بے حد مسرور تھے۔ اور میری اس ناچیز خدمت کو ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے سامنے بہت سراہا تھا۔ فرماتے تھے کہ اصل موضوع تو "اثبات باری" تھا۔ لیکن عنوان میں ایک قسم کی شناعت تھی۔ اس لئے "حدوث عالم" کا عنوان تجویز کیا۔ اور آخر میں دونوں کا مفاد ایک نکلتا ہے۔

(۱۲) مرقاۃ الطارم لحدوث العالم۔

سابق الذکر موضوع پر ۶۲ صفحات میں رسالہ ہے۔ رسالہ کیا ہے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس رسالے میں ادلہ و براہین کے استقصار کا ارادہ نہیں

فرمایا۔ بلکہ یہ "ضرب الخاتم" کے لئے مقدمات وتشریح وتفسیر کا کام دیتا ہے نظائر و شواہد موضوع پر اتنے پیش کئے ہیں کہ عقلی برہان سے پہلے ذوق ووجدان فیصلہ کر لیتا ہے۔ ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفٰے صبری جو قاہرہ میں جلاوطنی کے بعد مقیم تھے۔ اور ردِّ مادیینؒ دہریین میں نہایت ہی متخصص جلیل القدر عالم تھے۔ ترکی و عربی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں تالیف فرما چکے تھے۔

۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں یہ رسالہ ان کو راقم الحروف نے دیا تھا۔ مطالعہ فرمانے کے بعد اتنے متأثر ہوئے اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ فلسفہ وکلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں زندہ ہے۔ اور پھر فرمایا:۔

انی اُفضّل ھذہ الوُریقات علی جمیع المادۃ الذاخرۃ فی ھذا الموضوع وانی افضلھا علی ھذہ الاسفار الاربعۃ للصدر الشیرازی۔ یعنی جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور یہ اسفار اربعہ (ان کے سامنے رکھی ہوئی تھی) اتنی بڑی کتاب پر اس رسالہ کو ترجیح دیتا ہوں۔ پھر اس وقت "القول الفیصل" کے نام سے ردِّ دہریین میں ایک مبسوط کتاب تالیف فرما رہے تھے۔ اس میں اس رسالہ سے بہت نقول لئے اور اس کتاب میں اس رسالہ کی بڑی تعریف کی۔

ایک حصہ اس کا طبع ہو چکا ہے نہ معلوم یہ عبارت اس حصہ میں آگئی یا نہیں۔ ضمناً اس رسالہ میں کلام وتصوف الٰہیات وطبعیات کے بہت سے حقائق کا فیصلہ فرمایا گیا ہے۔

(۱۳) اِزالۃ الرین فی الذب عن قرۃ العینین۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتاب قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین کا حیدرآباد دکن میں کسی شیعی مزاج عالم نے رد لکھا تھا۔ حضرت امام العصر نے شاہ دہلوی کی تائید میں اس کی تردید لکھی۔ نہایت عمدہ کتاب ہے ۱۹۶ صفحات میں پھیل گئی ہے۔ اس میں قال المولی المؤلف کہہ کر شاہ دہلوی کی عبارت نقل فرماتے ہیں۔ قال المعترض سے تردید کہنے والے کی عبارت اور اقول سے اس کی تردید فرماتے ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے کشمیر میں ملا تھا ابتداء سے ۸ صفحے غائب ہیں۔ اس لئے نام مجھے نہ معلوم ہو سکا۔ اور سوءِ اتفاق سے حضرت شیخ سے پوچھنے کی نوبت نہ آئی "ازالۃ الرین" میرا تجویز شدہ نام برائے نام ہے۔

(۱۴) سہم الغیب فی کبد اہل الریب

تاریخی نام —— "قسی سہم الغیب"

ہندوستان کی سرزمین جہاں بدقسمتی سے بہت سے بدعات اور عقائدِ شرکیہ بعض سادہ لوح مسلمانوں میں رائج ہو گئے ہیں۔

ایک ان میں سے "علم غیب" کا عقیدہ ہے اور سید احمد رضا خاں صاحب بریلوی اور ان کے اتباع نے اس کو علمی رنگ میں پیش کیا۔ اور ایک عرصہ تک ہندوستان میں یہ موضوع بحث رہا ایک شخص بریلوی نے اس میں ایک رسالہ لکھا اور اہلِ حق کے مسلک کے خلاف اپنے نامۂ عمل اور نامۂ قرطاس کو سیاہ کیا۔ اور اپنا نام عبد الحمید دہلوی ظاہر کیا۔ حضرت شیخ کا قیام اس زمانہ میں دہلی میں تھا۔ آپ نے جواب ترکی بہ ترکی عبد المجید بریلوی کے نام منسوب کر کے اس کا جواب شائع فرمایا۔ رسالہ کے آخر میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور

حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی رحمہما اللہ کے مناقب میں عربی میں ایک قصیدہ ہے رسالہ کی زبان حضرت شیخ کے عام تصنیفی مذاق کے خلاف اردو ہے۔

یہ چودہ تصانیف تو امام العصر شاہ صاحب کی وہ ہیں کہ اپنے قلم سے تالیف فرما چکے ہیں۔

امام العصر حضرت شاہ صاحب کی دوسری قسم کی مصنفات

دوسری قسم کی وہ تصنیفات ہیں کہ آپ کی یادداشتوں سے مرتب کی گئی ہیں۔ اس کا ذکر کرنا بھی میرے خیال میں ضروری ہے۔

(۱) مشکلات القرآن۔

قرآن کریم کی جن آیاتِ کریمہ کو مشکل خیال فرمایا تھا۔ خواہ وہ اشکال تاریخی اعتبار سے ہو یا کلامی حیثیت سے۔ سائنس کی رو سے ہو یا کسی عقلی پہلو سے یا علوم عربیت و بلاغت کی جہت سے ہو ان پر یادداشت مرتب فرمائی تھی۔ اگر کہیں اس پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔ اس کو نقل فرمایا۔ یا حوالہ دیا اور نہیں تو خود غور و فکر کے بعد جو حل سانح ہوا تحریر میں لایا گیا۔ یہ یادداشت بہ شکل مسودات مختلف اوراق میں موجود تھی مجلس علمی ڈابھیل نے مرتب کر کے اسے شائع کیا۔ اور راقم الحروف نے مجلس علمی کی خواہش پر "یتیمۃ البیان" کے نام سے ۸۴ صفحہ کا اس کا مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ اصل کتاب ۲۸۷ صفحات پر ختم ہوئی۔ قرآنی علوم اور قرآنی معارف کا نہایت بیش قیمت گنجینہ ہے۔ اگر جدید اسلوب سے اس کو پھیلایا گیا تو ایک ہزار صفحات میں کہیں جا کر کتاب ختم ہوگی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے متعلق کچھ اور مسودات بھی نکل آئے تھے۔ جن کی زیورِ طبع سے

آراستہ ہونے کی نوبت ابھی نہیں آئی۔

(۲) خزینۃ الاسرار۔

یہ ایک رسالہ ہے جس میں کچھ اوراد و ادعیہ کچھ مجربات و اذکار وغیرہ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ سب علامہ دمیری کی کتاب "حیاۃ الحیوان" کے اقتباسات ہیں کہیں کہیں حضرت شاہ کی طرف سے اضافات بھی ہیں۔ یہ رسالہ حضرت کے قدیمی مسودات جو کشمیر میں تھے ان میں دستیاب ہوا تھا۔ مجلس علمی ڈابھیل نے اس نام سے شائع کیا:۔

(۳) فیض الباری بشرح صحیح البخاری۔

یہ حضرت شاہ صاحب کے درس صحیح بخاری کی املائی شرح ہے جسکو حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنیہ نے کئی سال کی محنت و عرق ریزی کے بعد فصیح و بلیغ عربی زبان میں مرتب کیا ہے۔ یہ حضرت امام العصر کے علوم و کمالات کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔ جہاں حافظ شیخ الاسلام بدر الدین عینی اور قاضی القضاۃ حافظ ابنِ حجر عسقلانی جیسے بلند پایہ محقق شارحین عاجز آگئے ہیں وہاں شیخ کی خصائص و کمالات جلوہ آرا نظر آئیں گے۔ زیادہ تر اعتنا بھی معارف حدیث کا کیا گیا۔ جہاں شارحین ساکت نظر آتے ہیں۔ حضرت شیخ کے آخری عمر کے مجرب علوم و اذواق خصوصی احساسات و علمی خصوصیات، دقت نظر و تحقیقی معیار کے نمونے اہل علم و یارانِ نکتہ داں کے لئے صلائے عام دے رہے ہیں۔ یہ چار ضخیم جلد کا بحرِ بیکراں مصر میں آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ قرآن و حدیث فلسفہ و کلام و معانی و بلاغت وغیرہ کے نہایت بیش بہا ابحاث سے مالا مال ہے۔ (اس پر راقم الحروف اور حضرت جامع

(مرتب کے قلم سے دو مبسوط مقدمے ہیں ۸۰ صفحات پر مشتمل ہیں) عام عبارت نہایت شگفتہ وسلیس ہے۔ بعض بعض مقامات میں خاصی ادبی لطافت ہے۔

(۴) العرف الشذی بشرح جامع الترمذی۔

یہ حضرت شاہ صاحب کی درس جامع ترمذی کی املائی شرح ہے۔ جس کو جناب مولانا محمد چراغ صاحب ساکن ضلع گجرات نے بوقتِ درس قلم بند کیا ہے۔ اور زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔ جامع ترمذی کے مشکلات احادیث احکام پر محققانہ کلام ہر موضوع پر عمدہ ترین کبار اُمت کے نقول اور حضرت کی خصوصی تحقیقات کا ذخیرہ ہے۔ طلبۂ حدیث اور اساتذۂ حدیث پر عموماً اور جامع ترمذی کے پڑھانے والوں پر خصوصاً اس کتاب کا بڑا احسان ہے۔

(۵) انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد۔

یہ سنن ابی داؤد کے درس کی املائی تقریر وشرح ہے جس کو مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی مرحوم نے جمع کر کے شائع کیا ہے۔ کُل دو جلدوں میں ہے مرتب وجامع نے بہت سی کتابوں کی اصلی نقول کو مراجعت کر کے لفظ بلفظ درج کر دیا ہے کتاب کے تسمیہ میں حضرت شاہ صاحب اور ان کے شیخ حضرت شیخ الہند کے نام کی تلمیح کی گئی ہے۔

(۶) صحیح مسلم کی املائی شرح۔

سنا ہے کہ ہمارے محترم دوست فاضل گرامی جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے صحیح مسلم کے درس کی تقریر قلم بند فرمائی تھی یہ اب تک نہ طبع ہوئی۔

نہ راقم الحروف کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

(۷) حاشیہ سنن ابن ماجہ۔

جناب محترم مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈوی سے سنا تھا کہ آپ نے سنن ابنِ ماجہ پر کتاب کے حواشی و ہوامش پر تعلیقات اپنے قلم سے لکھی تھیں۔ راقم الحروف کو اس کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

یوں تو حضرت نے جن کتابوں پر تعلیقات لکھی ہیں۔ اگر استقصار کیا جائے تو متعدد کتابیں نکل آئیں گی۔

"الاشباہ والنظائر" جو ابن نُجیم کی فقہ میں مشہور کتاب ہے۔ اس پر تعلیقات حضرت کے قلم سے خود میں نے کشمیر میں دیکھے ہیں۔

یہ کل اکیس کتابیں ہوئیں جن سے حضرت امام العصر کے کمالات کے کچھ پہلو نمایاں ہو سکتے ہیں۔ کتاب کی پوری حقیقت اس وقت منکشف ہوتی کہ کتاب کے مضامین یا خصوصیات کا واضح تعارف کراتا اور جن مشکل ابحاث میں حضرت کے کمالات نظر آ رہے ہیں۔ ان کی تفصیلات سامنے آتیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کسی مقالے کے لئے موزوں نہیں تفصیلی تبصرہ اور علوم و معارف کے نمونے پیش کرنے کے لئے ایک مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔

راقم الحروف کی کتاب "نفحۃ العنبر" جو حضرت کی حیات طیبہ کے چند صفحے ہیں اس میں کچھ تفصیلات ناظرین کو ہاتھ آئیں گی۔ تالیفات کے متعلق جو کچھ وہاں لکھا ہے اگر اس کی تشریح ہی کی جائے تو اس مقالہ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ اس وقت بہت عجلت وارتجال میں چند سطریں لکھنے کی توفیق ہوئی۔ حضرت امام العصر

کے کمالات کا کوئی گوشہ بھی لیا جائے تو تفصیل کے لئے داستان کی ضرورت ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ قلم اپنی جولانیاں دکھلاتا رہے۔

مدحتک جهدی بالذی انت اهله ۔۔۔۔ فقصر عما صالح فیک من جهدی

میں نے چاہا کہ جس تعریف کے مستحق ہیں اتنی تعریف کر سکوں لیکن میری کوشش ناکام رہی۔

فما کل ما فیه من الخیر قلته ۔۔۔۔ ولا کل ما فیه یقول الذی بعدی

جو کمالات ان میں ہیں نہ میں کہہ سکا اور نہ میرے بعد آنے والا کہہ سکیگا

نورُ الانور

الاُستاذ الامام السیّد محمد انور شاہ الکشمیریؒ نوّر اللہ ضریحہ

از حضرت مولانا محمد طیّب صاحب مدظلہ مہتمم دار العلوم دیوبند

مخدوم و معظم حضرت مولانا محمد طیّب صاحب مدظلہ العالی سے احقر نے یہ مضمون ایسے وقت میں لکھنے کی فرمایش کی جب حضرت ممدوح دار العلوم کی ابتداء سال کی انتظامی مہمات سوانح قاسمی کے مسودہ کی خواندگی اور نظرثانی اور اپنے دوسرے علمی مشاغل کی وجہ سے بے حد مشغول، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کثرتِ کار کی وجہ تھکے ہوئے تھے۔ مگر یہ موصوف کی بزرگانہ شفقت اور علمی دلچسپی کا کرشمہ ہے کہ اسی عالم میں آپ نے چار پانچ گھنٹہ کی ایک مجلس میں یہ قیمتی مقالہ تحریر فرما دیا۔

مضمون کے متعلق اپنے کسی تأثر کے اظہار کا حق مجھے اس لئے حاصل نہیں کہ میری پوری زندگی میں موصوف کی حیثیت ایک بلند رتبہ بزرگ اور ایک بیدار مغز مربی کی ہے۔ کسی چھوٹے کو یہ حق کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں اور بڑوں کے تحریری اور علمی کمالات پر ناقدانہ نظر ڈال سکے لیکن میں اگر یہ عرض نہیں کروں گا تو میرے ضمیر کو اپنے زبان و قلم سے کم سخنی، کم گوئی

بے جا خاموشی اور کتمانِ حق کا شکوہ ہو گا کہ حیاتِ انور" کے نام سے اگر میں
صرف حضرتِ ممدوحؒ کا یہ ایک ہی مقالہ اس مجموعہ میں پیش کر دیتا تو میرے خیال
میں اس موضوع پر یہ مضمون کافی و شافی ہوتا۔

(سیّد محمد ازھر شاہ قیصر)

الحمد للہ وسلام علےٰ عبادہ الذین اصطفےٰ۔ دار العلوم دیوبند نے
اپنی نوے سالہ زندگی میں علم و فضل کے ایسے ایسے رجال پیدا کئے کہ ان آخر کی
صدیوں میں دُور دُور تک تاریخ اُن کی مثال پیش کرنے سے عاجز نظر آتی ہے۔ ہر
ایک اپنے فن، کردار، سیرۃ اور بلند ذوقی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہی تھا۔
جو حضرات نصف صدی پیشتر گذر چکے ہیں اُن سے شاید نئی دنیا واقف نہ ہو۔ اور
ممکن ہے کہ تعارف کرانے کے باوجود وہ اُن سے متعارف نہ ہو سکے۔ لیکن ماضی
قریب کے مشاہیرِ دیوبند کی ایک بڑی جماعۃ ہے جو اپنے شہرۃ العامہ کے لحاظ سے
محتاجِ تعارف نہیں۔ اُس کے علم و سیرۃ کی مثالیں بھی دور دور تک نہیں ملتیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ، حضرت مولانا احمد حسن محدث
امروہیؒ، حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا عبد الحق مفسّر
حقّانی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت
مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ حضرات اپنے شہرۂ آفاق علم و فضل اور کردار و سیرۃ
کے لحاظ سے عزت و شہرۃ کی اونچی سطح پر پہونچے ہیں۔ قلم و زبان انھیں عام طور پر
جانتے پہچانتے ہیں۔ پھر ایسی تعداد کی تو کوئی شمار ہی نہیں جو مشاہیر میں نہیں لیکن
اپنی مضبوط علمی و اخلاقی سیرۃ کے ساتھ وہ زمینوں سے زیادہ آسمانوں میں مشہور ہیں۔

اور وہاں اچھے القاب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اور زمین کے کتنے ہی خطوں کے ایمانوں کو نہائے ہوئے ہیں۔

بہرحال دارالعلوم دیوبند ایک شجرۂ طیبہ ہے جس کے خوش ذائقہ اور خوشبودار پھل پھول سے دنیائے اسلام کا دل و دماغ معطر اور پُر کیف بنا ہوا ہے۔ اور اس آخری صدی میں اُس کی جماعت مجموعی حیثیت سے اُٹھی تو اُس نے مجددانہ اور اسلامی علم و عمل کو غیر اسلامی اثرات کی آمیزشوں اور شرک و بدعات کے لوث سے پاک کر کے نکھار دیا اور ستھرا کر کے دنیا کے آگے رکھدیا۔

دیوبند کی ان آفتاب و ماہتاب ہستیوں میں نہایت تیز اور شفاف روشنی کا ایک جلیل المرتبت ستارہ حضرت الاستاذ علامۂ دہر فریدِ عصر حافظ الدنیا محدثِ وقت مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی مبارک ہستی بھی ہے جو مجموعی حیثیت سے آیۃ من آیات اللہ اور اپنے غیر معمولی علم و فضل کی لحاظ سے دین کا ایک روشن منارہ تھے۔ اور آپ کی ذات بلا مبالغہ عالمِ جلیل فاضلِ نبیل۔ تقی و نقی محدث مفسر و متکلم ادیب و شاعر۔ صوفی صافی نورفانی فی السنۃ ذات تھی۔

لیس علی اللہ بمستنکر   أن یجمع العالم فی واحد

آپ ۱۳۱۰ھ میں داخل ہوئے جبکہ منشی فضل حق صاحب دیوبندی کا دورِ اہتمام تھا اور ۱۳۱۴ھ میں تمام علوم و فنون کی تکمیل سے فارغ ہو کر جب کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا زمانہ اہتمام تھا۔ یہاں سے واپس ہوئے۔ چند سال مدرسہ امینیہ دہلی میں مسندِ درس پر متمکن رہے۔ اور وہاں سے اپنے وطن کشمیر تشریف لے گئے۔ وہاں سے بنیۃ ہجرت

حجازِ مقدس کے قصد سے روانہ ہوئے۔ دیوبند میں اپنے اساتذہ و شیوخ سے ملنے کے لئے اُترے۔

آپ کے شیوخ و اساتذہ نے جو آپ کے جوہروں کو جاننے اور پہچانتے ہوئے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ دارالعلوم کی مسندِ درس کے شایاں شان یہ ایک ہستی ہے جسے دارالعلوم نے گویا اپنے ہی لئے پیدا کیا ہے۔ آپ کو دیوبند روک لیا اور آپ نے بھی غایت تواضع و انکسارِ نفس سے اپنے اساتذہ کی بات اونچی رکھتے ہوئے قیامِ دیوبند کا ارادہ فرمالیا۔

حضرت ممدوح کے ٹھیرانے سے ابتدائی منصوبہ اور مقصد یہ تھا کہ ترمذی اور بخاری کی شرح حضرت ممدوح سے لکھوائی جائے۔ لیکن عملاً یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ جس کی وجوہ نامعلوم ہیں۔ شاید یہ ہوں کہ درس کی مصروفیات بڑھ گئیں واللہ اعلم

بہرحال آپ نے بامتثال اکابر دارالعلوم میں درس شروع فرمادیا۔ البتہ غلبۂ زہد و قناعت سے مشاہرہ لینے پر راضی نہ ہوئے۔ اور لوجہ اللہ کام شروع کردیا۔ اس اصرار پر اُن کے اکابر نے بھی سکوتِ رضا سے کام لیا۔ اور تنخواہ کا مسئلہ کلیۃً اُنہی کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

لیکن حضرت والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد یہ گوارہ نہیں کیا کہ طعام و ضروریاتِ طعام کے مصارف خود اُن کے سر ڈالے جائیں۔ اور فرمایا کہ اگر مدرسہ سے حضرت ممدوح لینا نہیں چاہتے تو اُن کے سر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

تیسری متعین صورت یہ ہے کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں۔ اسے حضرت ممدوح

نے منظور فرمایا لیا۔ اور اس طرح تقریباً دس برس تک یہ صورت قائم رہی۔ حضرت والد ماجد علیہ الرحمہ نے بھی اپنی معروف آبائی اور روایتی مہمان نوازی سے آپ کو مثل اپنے اہلبیت کے سمجھا اور نہایت انشراح و انبساط کے ساتھ یہ دَور پورا ہوا۔

اس دور میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حضرت شیخ الہند اور حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے یاد فرمایا اور قیام دیوبند پر مجبور کیا۔ ممدوح بھی یہاں رُک گئے اور وہ بھی اس پوری مدّت میں حضرت والد ماجد ہی کے مہمان رہے۔ یہ دستر خوان بظاہر کھانے کا دستر خوان ہوتا تھا۔ لیکن حقیقتاً اہل علم و فضل کی ایک پاکیزہ مجلس ہوتی تھی جس میں حضرت والد ماجد قدس سرہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ، حضرت مولانا انور شاہ صاحب قدس سرہٗ، مولانا عبیدہ اللہ سندھی قدس سرہٗ اور اکثر و بیشتر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور متعدد دوسرے اکابر اساتذۂ دار العلوم شریک رہتے تھے۔ علمی مسائل میں مکالمے ہوتے۔ بحثیں ہوتیں معارف و حقائق کھُلتے اور خصوصیت سے حضرت شاہ صاحب اور مولانا سندھی مختلف علوم و فنون کے کافی دلچسپ مباحث چھیڑتے۔ اور آخر کار بزرگانِ مجلس کی طرف سے کبھی مزاحی رنگ میں اور کبھی سنجیدہ اور متین رنگ میں فیصلے اور مکالمے سنائے جاتے ——

حاضر الوقت خدام و طلبہ کو شاید درس و تدریس کی لائن سے برسہا برس میں وہ تحقیقات ہاتھ نہ لگ سکتی تھیں جو اس حلقۂ طعام میں یکی یکائی اک دم مل جاتی تھیں۔ ان دونوں بزرگوں میں حاضر الوقت اکابر کے کمال ادب و احترام کے ساتھ سلسلۂ مسائل حق گوئی میں کبھی کوئی ادنیٰ اضمحلال یا تہاون پیدا نہ ہوتا تھا۔

اور ہر ایک دوسرے کے خلاف برملا اور بہت صاف ریمارک کرتا۔

اس طرح کھانے پینے کا یہ دسترخوان مائدۂ علم وفضل بن جاتا۔ اور اس دسترخوان پر صرف بدنی غذا ہی جمع نہ ہوتی تھی۔ بلکہ روحانی غذاؤں کے قسم قسم کے الوان جمع ہوجاتے تھے اور دسترخوان اس شعر کا مصداق بن جاتا۔

بہارِ عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد   برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنے را

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں غذا کے بارہ میں لطافت تھی ــــ مگر شوقینی نہ تھی۔ غذاؤں کے تنوع اور کھانوں کے الوان کی طرف طبیعت جھکی ہوئی نہ تھی۔ جو مل گیا کھالیا جو آگیا شکر ورضا سے اُسے قبول کرلیا۔ میری جدّۂ محترمہ رحمۃ اللہ علیہا جن کی مہمان نوازی اپنے دَور میں مشہور تھی۔ اور خود حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے بھی اس بارہ میں یہ کہہ کر شہادۃ دی تھی کہ "ہماری مہمان نوازی تو احمد کی والدہ کی بدولت ہے"۔

کبھی کبھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میری معرفۃ یہ کہلا کر بھیجتیں کہ حضرت کبھی تو اپنے کسی مرغوب کھانے کی فرمائش کردیا کیجئے۔ تو متأثرانہ لب ولہجہ سے جواب دیتے کہ میری طرف سے سلام گذارش کیجئے اور یہ عرض کردیجئے کہ "دسترخوان پر ہمہ نعمت موجود ہوتے ہوئے میں کاہے کی فرمائش کروں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں میری جنت کی نعمتیں یہیں تو نہیں تمام کی جارہی ہیں"۔

قیامِ دیوبند کی یہ صورت قائم ہوجانے پر حضرت شاہ صاحب نے باشارۂ اکابر درس وتدریس کا مستقل سلسلہ جاری توفرمادیا۔ لیکن ہجرت کی پاک نیت سے دست بردار نہ ہوئے۔ اور برابر حاضریٔ حرم نبوی وحرم الٰہی کا جذبہ آپ کو دیوبند

چھوڑنے کی طرف مائل کرتا رہتا تھا جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا۔ اور یہ اکابر بلطائف تعبیر اُسے ٹلاتے جاتے۔ لیکن خطرہ انھیں بھی رہتا تھا کہ نہ معلوم کس وقت یہ جذبہ غالب ہو جائے۔ اور دار العلوم کو ایسی جامع اور مستقبل کی بڑی بڑی امیدوں کی محور ہستی سے دست بردار ہونا پڑ جائے۔ اس لئے یہ حضرات بھی اُنھیں مستقل جما دینے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

آخر کار اُنھیں پابند بنانے کے لئے ان بزرگوں نے اُن کے پیروں میں بیڑی ڈالنے کی تدبیر سوچ ہی لی۔ اور ارادہ کیا کہ حضرت ممدوح کا نکاح کر دیا جائے۔ گو اس سے حضرت ممدوح کو انکار تھا۔ مگر بلطائف تدبیر اُنھیں راضی کر کے گنگوہ کے سادات کی ایک خاندان میں نکاح کر دیا گیا۔ میری دادی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا اور حضرت والد ماجد قدس سرہٗ نے اس کی کفالت فرمائی۔ اور نکاح کی اس تقریب کو اُسی طرح انجام دیا جس طرح وہ اپنی اولاد کی کوئی بھاری تقریب کر سکتے تھے۔ بھوپال بارات گئی، علماء کی ایک جماعت ساتھ تھی۔ بڑی پُر مسرت فضا میں نکاح ہوا۔ دلھن آئی تو حضرت جدۂ مرحومہ نے اُسی طرح گھر میں اُتارا جیسے اپنے گھر کی دلہن اُتاری جا سکتی تھی۔ ولیمہ کی لمبی چوڑی دعوت کی۔ اور احقر کے زنانہ مکاں کے بالاخانے پر حضرت شاہ صاحبؒ مع اہلیہ محترمہ فروکش ہوئے۔

اس پر تقریباً ایک دو سال ہی گذرے تھے کہ اولاد کی امید ہوئی۔ ہمارے گھر میں اس کی ویسی ہی خوشی تھی جو اپنے گھر میں اہلبیت سے اولاد ہونے کی ہوتی ہے۔ اُس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ گھر میں عرصۂ مدید گذر چکا تھا کوئی بچہ نہیں تھا جس کی سب کو تمنا تھی اس امید سے کہ حضرت ممدوح کے یہاں بچہ ہونے والا ہے۔ سب

گھر والوں کو بالخصوص میری دادی صاحبہ مرحومہ کو بے حد خوشی تھی۔ اور جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہوتا ہے، اُنھوں نے عقیقہ کی تقریب کا سامان بھی شروع کر دیا تھا۔ کہ اچانک حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو مشورہ دیا گیا اور ممکن ہے کہ خود اُن کے قلب میں ہی یہ داعیہ از خود پیدا ہوا ہو اُنھوں نے حضرت جدّۂ مرحومہ سے عرض کرایا کہ دس سال تک تو میں تنہا تھا۔ اب دو سال سے متأہل ہوں اور آپ ہی کے یہاں مقیم ہوں۔ اب اولاد کی امید ہے تو اب میں ایک اور دو کے ساتھ ایک عائلہ کا بار ڈالنے اور ڈالتے رہنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اجازت دی جائے کہ الگ مکان لیکر رہوں۔ حضرت ممدوحہ اور والد ماجد اس پر راضی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اُدھر سے اصرار بڑھا تو اُنھوں نے با دلِ ناخواستہ اسے قبول فرمالیا۔ اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوان کے محلہ کے ایک مکان میں فروکش ہو گئے۔

اس صورتِ واقعہ کے بعد ذمہ دارانِ مدرسہ کے لئے موقع آگیا کہ وہ تنخواہ لینے کے لئے حضرت ممدوح پر اصرار کریں۔ چنانچہ کیا۔ اور تأہل کی زندگی اور اس کے وسیع ہوتے رہنے کی صورتِ حال کے ماتحت طوعاً و کرہاً حضرت ممدوح کو بھی یہ اصرار قبول کرکے تنخواہ لینے پر راضی ہو جانا پڑا۔ اور اب ایک گھرستی کی طرح اُن کی عائلی زندگی کا دَور شروع ہو گیا۔

اس مکان کی رہائش کے بعد اُسی میں عزیزم مولوی ازہر شاہ سلمہٗ کی بہن عابدہ مرحومہ پیدا ہوئی اور پھر میاں ازہر شاہ سلمہٗ معرضِ وجود میں آئے۔ تجرد سے تأہل ہوا تھا اور اب تأہل سے عائلی اور خاندانی زندگی کی داغ بیل پڑ گئی اور زندگی کے علائق ایک ایک کرکے بڑھتے رہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ وہی نکلا جو ایک تدبیر کے اختیار کرنے والے

بزرگوں نے سوچا تھا کہ حضرت شاہ صاحب مقید ہو گئے۔ اور ہجرت کر جانے کا وہ جذبہ سست پڑ گیا۔ بالآخر ترک کر دینا پڑا۔ اور باطمینانِ خاطر دار العلوم میں مسند نشین درس ہو کر علمی افادات میں مشغول ہو گئے۔

اسی دوران میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے حجازِ مقدس کا قصد فرمایا۔ اور شہرت ہوئی کہ حضرت بہ نیت ہجرت تشریف لے جا رہے ہیں۔ یہ شہرت تو غلط ثابت ہوئی۔ لیکن تشریف بری محقق تھی۔ مگر شیخ زمانہ اور دار العلوم کے شیخ حدیث کا دار العلوم سے جانے کا ارادہ کرنا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ زمانہ بھی پُر آشوب ہو گیا تھا حضرت کی نسبت برطانوی حکومت کو شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے۔ اور حضرت شیخ اور دار العلوم کے بہی خواہوں کو ایک تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں گورنمنٹ آپ کو تھام لے۔ اور اوپر سب سے بڑا خطرہ دار العلوم کی ایسی فردِ فرید شخصیت نمونۂ اکابر و اسلاف اور یگانۂ روزگار ہستی سے محروم ہو جانے کا تھا۔ جو کچھ کم حادثہ نہ تھا۔ لیکن دار العلوم کے ذمہ دار مبصرین نے حضرت شاہ صاحبؒ کو دار العلوم میں روک کر پہلے ہی آنے والے خطرہ کی روک تھام کر لی تھی۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ جیسی یکتائے زمانہ ہستی کو دار العلوم میں لا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ کی دار العلوم سے اس عارضی جُدائی اور مخصوص روحانی برکات سے برائے چندے محرومی کا اثر تو ضرور ہوا۔ لیکن علمی حلقہ کے خلاء کا خطرہ روبراہ نہ آ سکا مسند بھری بھرائی گویا موجود تھی۔ اگر شیخ الہند برائے چندے سامنے نہ رہے تو شیخ کے مثل سامنے تھے۔

چنانچہ حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے قائم مقام صدر مدرس کی حیثیت سے درسِ ترمذی و بخاری کو سنبھال لیا۔ اور علمی

پیاسوں کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحرِ ذخّار سے محروم ہو گئے ہیں۔ بلکہ اُنھیں محسوس ہوا کہ اگر سمندر سامنے نہیں رہا تو اس سمندر سے نکلا ہوا ایک عظیم الشان دریا اُن کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے ساتھ بدل انغلط نہیں بلکہ بدل صحیح ہے جس سے بلا تأمل علوم کے پیاسے سیراب ہونے لگے اور آبِ حیاۃ سے قدیم وجدید سیرابی میں اُنھیں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا۔

بلکہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ حدیث میں کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے دروس میں نہ تھیں۔ اور حضرت شاہ صاحب کا اندازِ درس درحقیقت دنیائے درس وتدریس میں ایک انقلاب کا باعث ثابت ہوا۔

اولاً آپ کے درسِ حدیث میں رنگِ تحدیث غالب تھا فقہ حنفی کی خدمت وتائید وترجیح بلاشبہ اُن کی زندگی تھی۔ لیکن رنگ محدثانہ تھا۔ فقہی مسائل میں کافی سیر حاصل بحث فرماتے۔ لیکن اندازِ بیان سے یہ کبھی مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ آپ حدیث کو فقہی مسائل کے تابع کر رہے ہیں اور کھینچ تان کر حدیث کو فقہ حنفی کی تائید میں لانا چاہتے ہیں بھلا اس کا قصد وارادہ تو کیا ہوتا؟ بلکہ واضح یہ ہوتا تھا کہ آپ فقہ کو بحکمِ حدیث قبول کر رہے ہیں۔ حدیث فقہ کی طرف نہیں لیجائی جا رہی ہے۔ بلکہ فقہ حدیث کی طرف لایا جا رہا ہے وہ آ رہا ہے اور کلیتہً حدیث کے موافق پڑتا جا رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر گویا حدیث کا سارا ذخیرہ فقہ حنفی کو اپنے اندر سے نکال نکال کر پیش کر رہا ہے۔ اور اُسے پیدا کرنے کے لئے نمودار ہوا ہے۔

سنہ ۱۳ھ میں علامہ رشید رضا، مدیر المنار مصر جب بسلسلۂ صدارت اجلاس ندوۃ العلماء لکھنؤ ہندوستان آئے اور دیوبند کی دعوت پر دار العلوم میں بھی تشریف لائے۔ حضرت شیخ الہند کی موجودگی میں خیر مقدم کا عظیم الشان جلسہ نودرہ ہال میں منعقد ہوا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی برجستہ عربی تقریر میں اُن کا خیر مقدم کرتے ہوئے دار العلوم کے علمی مسلک پر روشنی ڈالی۔ جس کا اہم جزو یہ تھا کہ ہم تمام مختلف فیہ مسائل میں فقہ حنفی کے مسائل کو ترجیح دیتے ہیں اور تمام متعارض روایات کی تطبیق و ترجیح کے سلسلہ میں فقہ حنفی کی تائید حاصل کرتے ہیں تو علامہ رشید رضا نے حضرت شاہ صاحب کی تقریر کے دوران ہی میں تعجب آمیز لہجہ سے کہا کہ کیا سارا ذخیرۂ روایات حدیث صرف فقہ حنفی ہی کی حمایت کے لئے اُتار اگیا ہے؟

اس پر حضرت شاہ صاحب نے تقریر کے رُخ کو پھیرتے ہوئے اس متعجبانہ استفسار کے جواب کی طرف رُخ کر کے فرمایا کہ ہمیں تو ہر حدیث میں وہی نظر آتا ہے جو ابو حنیفہ نے سمجھا اور کہا ہے اور اس پر بطور دلیل حنفیہ شافعیہ کے مشہور مختلف فیہ مسائل کی مثالیں دیتے ہوئے تطبیق روایات اور ترجیح راجح کے اپنے اصول بیان فرمائے اور واضح کیا کہ ان اصول کے تحت ہمیں ذخیرۂ حدیث سے کس طرح فقہ حنفی نکلتا ہوا نظر آتا ہے؟

فقہ حنفی کی عظمتِ شان کو نمایاں کرتے ہوئے دکھلایا کہ ہم محض قیاسی طور پر نہیں بلکہ نصوص حدیث کے سارے ہی ذخیرہ میں عیاناً وہ بنیادیں آنکھوں سے دیکھتے ہیں جن پر فقہ حنفی کی تعمیر کھڑی ہوئی ہے۔

بہرحال درسِ حدیث میں آپ کے یہاں محدثانہ رنگ غالب تھا اور حدیث کو فقہ حنفی کے مؤید کی حیثیت سے نہیں بلکہ اُس کے منشا کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا اور ہاتھ در ہاتھ اُس کے دلائل و شواہد سے اس دعویٰ کو مضبوط بنایا جاتا تھا۔

متون حدیث کی معتمد کتابوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر الحدیث بالحدیث کے اصول پر کسی حدیث کے مفہوم کے بارہ میں جو دعویٰ کرتے اُسے دوسری احادیث سے مؤید اور مضبوط کرنے کے لئے درس ہی میں کتب پر کتب کھول کھولکر دکھائے جاتے تھے۔ اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہو جاتا تھا تو نتیجۃً وہی فقہ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث فقہ حنفی کو پیدا کر رہی ہے۔ یہ ہرگز مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ فقہ حنفی کی تائید میں خواہ مخواہ توڑ مروڑ کر حدیثوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ یعنی گویا اصل تو مذہب حنفی ہے محض مؤیدات کے طور پر روایاتِ حدیث سے اُسے مضبوط بنانے کے لئے یہ ساری جدوجہد کی جا رہی ہے۔ نہیں بلکہ یہ کہ حدیث اصل ہے لیکن جب بھی اُس کے مفہوم کو اُس کے فحویٰ اور سیاق و سباق نیز دوسری احادیث باب کی تائید و مدد سے مشخص کر دیا جائے تو اُس میں سے فقہ حنفی نکلتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس لئے طلبائے حدیث حضرت ممدوح کے درس سے یہ ذوق لے کر اُٹھتے تھے کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حقیقتاً حدیث پر عمل کر رہے ہیں۔ اور حدیث کا جو مفہوم ابو حنیفہ نے سمجھا ہے وہی درحقیقت شارع علیہ السلام کا منشا ہے جس کو روایت حدیث ادا کر رہی ہے۔ بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس روایت حدیث سے امام ابو حنیفہ اپنا کوئی مفہوم پیش نہیں کرتے۔ بلکہ صرف پیغمبر علیہ السلام کا مفہوم پیش کر رہے ہیں اور خود اس

حدیث میں محض ایک جویا اور ناقل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غرض حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ۔ تحدیث و اخبار کے سلسلہ میں فقہ حنفی کی تائید ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ بلکہ فقہ حنفی حدیث سے نکلتا ہوا نظر آتا تھا جس سے حدیث مؤید فقہ نہیں بلکہ منشاء فقہ ثابت ہوتی تھی

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آیا جو اس مقام کے مناسب حال ہے اور وہ یہ کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار ایک مناظرہ میں جو حضرت ممدوح اور ایک عالم اہل حدیث کے مابین ہوا اہل حدیث عالم نے پوچھا کیا آپ ابوحنیفہ کے مقلد ہیں؟ فرمایا نہیں۔ میں خود مجتہد ہوں اور اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں۔

اُس نے کہا کہ آپ تو ہر مسئلہ میں فقہ حنفی ہی کی تائید کر رہے ہیں پھر مجتہد کیسے؟ فرمایا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ میرا ہر اجتہاد کلیۃً ابوحنیفہ کے اجتہاد کے مطابق پڑتا ہے۔ اس طرز جواب سے سمجھانا یہی منظور تھا کہ ہم فقہ حنفی کو خواہ مخواہ بنانے کے لئے حدیث کو استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ حدیث میں سے فقہ حنفی کو نکلتا ہوا دیکھ کر اُسکا استخراج سمجھا دیتے ہیں اور طریق استخراج پر مطلع کر دیتے ہیں۔

بہر حال اکابرِ دیوبند کے مذاق کے مطابق حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ مقلد بھی تھے۔ مگر اس تقلید میں محقق بھی تھے۔ وہ مسائل میں پابندِ فقہ حنفی بھی تھے مگر اس پابندی کو مبصرانہ تحقیق سے اختیار کئے ہوئے تھے۔ جیسے مسئلۂ تقدیر میں اہل سنۃ کا مذہب ہے۔ کہ جبر و اختیار کو جمع کر کے یہ کہنا ہے کہ وہ مختار ضرور ہے۔ مگر مجبور فی الاختیار ہے۔ اسی طرح مسائلِ فقہیہ میں حضرت شاہ صاحب

کا رنگ یہ تھا کہ وہ مقلد ضرور ہیں مگر محقق فی التقلید نہیں۔ اور تمام اجتہادی مسائل ہیں جہاں تقلید کرتے ہیں وہاں مسائل کی تمام حدیثی اور قرآنی بنیادوں کی تحقیق بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔

ایک امریکن مصنف نے اپنی معروف کتاب "ماڈرن ان انڈیا" میں زیر عنوان "دیوبندیوں کا اسلام" اہلِ دیوبند کا یہی جامع اضداد طریقہ اپنے مختصر عنوان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ :-

> "حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ لوگ (اہلِ دیوبند) اپنے کو مقلد کہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہر مسئلہ کو پورے محققانہ انداز سے کہتے ہیں اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسی تنقیح و تحقیق کرتے ہیں کہ اس دعوائے تقلید کے ساتھ وہ بیساختہ مجتہد بھی نظر آنے لگتے ہیں۔" (انتہٰی بمعناہ)

حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ یہ حضرات مجتہد فی التقلید اور محقق فی الاتباع ہیں کورانہ تقلید یا جامد اتباع کے جال میں پھنسے ہوئے نہیں اور لم یخروا علیھا صما و عمیانا کے سچے مصداق ہیں۔

بہر حال یہ عنوان حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے درس میں اس لئے کافی بکھرا ہوا نظر آتا تھا کہ اُن کا غالب رنگ محدثانہ تھا اور ہر ہر مسئلہ میں حدیثی مسئلہ کی تائید حدیث ہی سے کرتے جاتے تھے۔ لیکن نتیجہ میں پہونچ کر وہ مسئلہ حنفی فقہ کا مسئلہ بن جاتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلہ کا منشا فلاں حدیث ہے جسے امام ابو حنیفہ نے باتباع حدیث حدیث سے نکال کر پیش کر دیا ہے دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کی بحرِ ذخّار

ہونے کی وجہ سے درسِ حدیث صرف علوم حدیث ہی تک محدود نہ رہتا تھا اُس میں استطراداً لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی تھی۔ اگر معانی وبلاغۃ کی بحث آجاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم ومعانی کا یہ مسئلہ اسی حدیث کے لئے واضع نے وضع کیا تھا معقولات کی بحثیں آجاتیں اور معقولیوں کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث گویا معقولات کے مسئلہ ہی کی تردید کے لئے قلب نبوی پر وارد ہوئی تھی۔

غرض اس نقلی اور روایتی فن (حدیث) میں نقل وعقل دونوں کی بحثیں آتیں اور ہر فن کے متعلقہ مقصد پر ایسی سیر حاصل اور محققانہ بحث ہوتی کہ علاوہ بحث حدیث کے وہ فنی مسئلہ ہی فی نفسہ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہوکر سامنے آجاتا تھا۔

سال بھر تک یکسانی کے ساتھ مسائل پر یہ محققانہ بحثیں جاری رہتیں۔ یہ ضرور تھا کہ ششماہی امتحان کے بعد عصر سے مغرب تک کا وقت طلبہ کا مزید لے لیتے تھے جس سے رجب کے آواخر تک یعنی امتحان سالانہ شروع ہونے سے پہلے پہلے ترمذی وبخاری یکساں شانِ تحقیق کے ساتھ ختم ہوجاتی تھیں۔

میں نے ان مختلف الانواع تحقیقات کو دیکھ کر ایک املائی کاپی تیار کی۔ جس کے چوڑے اوراق میں چھ سات کالم بنائے اور ہر کالم کے اوپر والے سرے پر فنون کے عنوان ڈال دیئے یعنی مباحث حدیث۔ مباحث تفسیر۔ مباحث عربیت (نحو وصرف) مباحث فلسفہ ومنطق۔ مباحث ادبیات (جن میں اشعار عرب اور فصاحت وبلاغۃ کی بحثیں آتی تھیں) مباحث تاریخ وغیرہ۔ پھر فنونِ عصریہ کے لئے

ایک کالم رکھا۔ کیونکہ موجودہ دور کے فنون جیسے سائنس، فلسفہ جدید اور ہیئت جدید وغیرہ کے مباحث بھی بذیل بحث حدیث درس میں آ جاتے تھے، ان میں کالم وار ان مباحث کو املا کیا جاتا تھا۔ ان فنی مباحث کے کالموں کے بعد کاپی کے کنارہ کا کالم حضرت ممدوح کی رائے اور محاکمہ کا تھا جس کے سرنامہ پر عنوان تھا قال الاستاذ اس میں وہ فیصلے درج کر لیا کرتا تھا جو مسائل کی تدقیق و تنقیح کے بعد بطور آخری نتیجہ کی حضرت یہ کہہ کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ "میں کہتا ہوں"۔

افسوس کہ یہ بیاض جو تقریباً چار سو پانچ سو صفحہ پر مشتمل تھی، ایک کرم فرما طالب علم نے مستعار مانگی اور میں نے اپنی طالبعلمانہ ناتجربہ کاری سے چند روز کے لئے اُن کے حوالہ کر دی۔ انھوں نے وہی کیا جو کتاب کو عاریتاً مانگنے والے طلبہ کرتے ہیں۔ یعنی چند دن کے بعد میرے مطالبہ پر فرمایا کہ میں تو دے چکا ہوں آپ کو یاد نہیں رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مغالطوں سے عاجز ہو کر میں نے اس ذخیرہ سے صبر کر لیا۔ جس کو کافی عرق ریزی اور محنت سے تیار کیا تھا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ چوری کا یہ علم خود اُن کے کام بھی آیا یا اُن کے پاس سے بھی یوں ہی نکل گیا۔ جیسے انھوں نے میرے ہاتھ سے نکالا تھا۔ یہ سانحہ یاد آنے پر میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ۔ اللہ اُنھیں جزاء دے۔

بہرحال حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا درسِ حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا۔ بلکہ فقہ۔ تاریخ۔ ادب۔ کلام۔ فلسفہ۔ منطق۔ ہیئت۔ ریاضی۔ اور سائنس وغیرہ تمام علومِ جدیدہ و قدیمہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور اس لئے اس جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم و فن کا مذاق لے کر اُٹھتا تھا۔ اور اس میں یہ

استعداد پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ بضمن کلام خدا اور رسول ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کر جائے۔ یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر الاستاذ الامام الکشمیری نے اختیار فرمایا۔ چنانچہ کبھی کبھی تحدیث بالنعمۃ کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ "بھائی اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا ہے"۔ بالخصوص فقہ حنفی کے مآخذ و مناشی کے سلسلہ میں حدیثی ذخیرہ کافی ہی نہیں، کافی سے زائد جمع فرما دیا۔

پھر بھی قیامِ ڈابھیل کے زمانہ میں آخری سال جس کے بعد پھر درس دینے کی نوبت نہیں آئی اور وصال ہو گیا۔ درس حدیث میں فقہی و حدیثی تحقیقات کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا۔ اور ترجیح مذہبِ حنفی اور تطبیق روایات میں عمر بھر کے علم کا نچوڑ پیش فرمایا جس کو املا کرنے والوں نے املا کیا۔

"تائید مذہب حنفی" کے اس غیر معمولی اہتمام کی توجیہ کرتے ہوئے گاہ گاہ فرماتے کہ عمر بھر ابو حنیفہ کی نمک حرامی کی ہے۔ اب مرتے وقت جی نہیں چاہتا کہ اس پر قائم رہوں۔ چنانچہ کھُل کر پھر ترجیح مذہب کے سلسلہ میں اچھوتے اور نادر روزگار علوم و معارف اور نکات و لطائف ارشاد فرمائے، جس سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ منجانب اللہ آپ پر مذہبِ حنفی کی بنیادیں منکشف ہو گئی تھیں اور اُن میں شرح صدر کی کیفیات پیدا ہو چکی تھیں جس کے اظہار پر گویا آپ مأمور یا مجبور تھے۔ ان علوم و معارف کے ذخیرہ کو حضرت ممدوح کے ۲ رشید شاگردوں، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی نے الواح اوراق میں جمع کر کے اہل علم پر ایک ناقابل مکافاۃ احسان فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ ان دونوں محقق فاضلوں کو

جزاءِ خیر عطا فرمائے۔ اور حضرت شاہ صاحب کی روحانیت سے اُن کی نسبت
کو اور زیادہ قوی فرمائے۔ آمین۔

حضرت ممدوح کا یہ جملہ کہ عمر بھر ابوحنیفہ کی نمک حرامی کی شاید اسطرف
مشیر ہے کہ حضرت ممدوح جہاں روایاتِ حدیث میں تطبیق و توفیق روایات کا
اصول اختیار فرمائے ہوئے تھے وہیں روایات فقہیہ میں بھی آپ کا اصول تقریباً
تطبیق و توفیق ہی کا تھا۔ یعنی مذاہب فقہا کے اختلاف کی صورت میں حنفیہ کا
وہ قول اختیار فرماتے جس سے خروج عن الخلاف ہوجائے اور دونوں فقہ باہم
جڑ جائیں، اگرچہ یہ قول مفتیٰ بہ بھی نہ ہو اور مسلک معروف کے مطابق بھی نہ ہو، نظر
صرف اس پر تھی کہ دو فقہی مذہبوں میں اختلاف جتنا کم سے کم رہجائے وہی بہتر ہے
ظاہر ہے کہ اس میں بعض مواقع پر خود امام کا قول بھی چھوٹ جاتا اور صاحبین کا
قول زیر اختیار آجاتا تھا۔ یعنی فقہ حنفی کے دائرے سے تو کبھی باہر نہیں جاتے تھے۔
مگر ابوحنیفہ کے بلاواسطہ قول سے کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے۔ خواہ وہ بواسطۂ
صاحبین ابوحنیفہ ہی کا قول ہو۔ شاید اس کو حضرت ممدوح نے ابوحنیفہ کی نمک حرامی
کرنے سے تعبیر فرمایا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں اس توسع سے رجوع
کرکے کھلے طور پر مذہب کے معروف و مفتیٰ بہ حصے بلکہ اقوال ابی حنیفہ کے اختیار
و ترجیح کی طرف طبیعت آچکی تھی اور یہ بلاشبہ اس کی دلیل ہے کہ ابوحنیفہ کی
خصوصیات کے بارہ میں حق تعالیٰ نے اُنھیں شرح صدر عطا فرما دیا تھا۔ اور وہ
بالآخر اُسی ٹھیٹھ لکیر ہی پر جم کر چلنے لگے تھے۔ جس پر اُن کے شیوخ سرگرم رفتار
رہ چکے تھے۔

میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا مقولہ سنا ہے فرماتے تھے کہ جس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ منفرد ہوتے ہیں اور ائمہ ثلثہ میں سے کوئی اُن کی موافقت نہیں کرتا اُس میں میں ضرور بالضرور پوری قوۃ سے ابوحنیفہ کا اتباع کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں ضرور کوئی ایسا دقیقہ ہے جس تک امام ہی کی نظر پہونچ سکی ہے اور پھر حق تعالیٰ اُس دقیقہ کو منکشف بھی فرما دیتا ہے۔ یہ مقولہ امام ابوحنیفہ کے اس مسلک کے ذیل میں فرمایا کہ قضا قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ اس مسئلہ میں میں بالضرور ابوحنیفہ ہی کی پیروی کروں گا۔ کیونکہ اس میں صرف امام ہی متفرد ہیں اور یہ تفرد اس کی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی دقیق بنیاد اُن پر منکشف ہوئی ہے جہاں تک دوسروں کی نگاہیں نہیں پہونچ سکی ہیں۔

اسی قسم کا مضمون حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے بارے میں میں نے حاجی امیر شاہ خان صاحب مرحوم سے سُنا کہ حضرت والا نے مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی سے گفتگو فرماتے ہوئے کہا تھا کہ میں ابوحنیفہ کا مقلد ہوں۔ صاحب ہدایہ اور درمختار کا مقلد نہیں ہوں۔ اس لئے میرے مقابلہ میں بطور معارضہ جو قول بھی آپ پیش کریں وہ ابوحنیفہ کا ہونا چاہئے۔ دوسروں کے اقوال کا میں جوابدہ نہ ہوں گا۔ اس سے بھی یہی نکتہ نکلتا ہے کہ فقہ حنفی میں اصل بنیادی قول ان حضرات کے نزدیک خود امام کا ہوتا تھا اور وہی درحقیقت فقہ حنفی کی اساس ہونے کا حق بھی رکھتا تھا۔

پس ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ پر آخری عمر میں یہی نکتہ منکشف ہوا ہو جو اُن کے شیوخ پر منکشف ہوا تھا۔ اور اُس کے خلاف توسع کو وہ ابوحنیفہ سے نمک حرامی کرنے کی تعبیر سے اس مقصد کو ظاہر فرماتے ہوں۔

اسی کے ساتھ درسِ حدیث کے سلسلہ میں مذاہبِ اربعہ کے اختلافات بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی مناظرانہ صورتِ حال بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ان مناظرانہ مباحث اور فرعیاتی اختلافات سے کتاب وسنّت کے ہزارہا مکنون علوم واشگاف ہوتے تھے جو اس اختلاف کے بغیر حاصل ہونے ممکن نہ تھے۔ اور پھر ان فرعیات کا تراجم اور تراجم کے بعد قولِ فیصل حضرت ممدوح کے قلب ولسان سے ظاہر ہوتا تو ظرف کی خصوصیات لگ جانے سے عجیب وغریب اور نئے نئے علوم پیدا ہوئے پھر ان تراجمات میں محاکمہ اور ترجیح کے سلسلہ سے جو تنقیحات بیان ہوئیں وہ خود مستقل علوم ومعارف کا ذخیرہ ہوتی تھیں۔

غرض ایجابی اور سلبی دونوں قسم کے علوم کی نیرنگیاں حلقۂ درس کو ایک رنگین گلدستہ بنائے ہوئے تھیں جس میں رنگ رنگ کے علمی پھول چُنے ہوئے ہوتے تھے تفنن علوم کی رنگینیوں کے ساتھ آپ کے درس میں ایک خاص شوکت بھی ہوتی تھی۔ کلام میں تمکن اور قوۃ الفاظ میں شوکت وحشمت اور کلام کے وقت حضرت ممدوح کی ہیئت کذائی کچھ ایسے انداز کی ہو جاتی تھی جیسے کوئی بادشاہ اپنا حاکمانہ فرمان سُنا رہا ہے۔ بالخصوص ائمۂ مجتہدین کے متبعین علماء کے کلام پر بحث وتنقید چھڑ جاتی تو اُس وقت معارضانہ اور ناقدانہ کلام کی شوکت اور بھی زیادہ اُبھری ہوئی دکھلائی دیتی تھی۔ نگاہیں تیز ہو جاتیں، آواز قدرے بلند ہو جاتی اور گردن اُٹھا کر بولتے تو ایک عجیب پُر شوکت اور رُعب افزا کلام معلوم ہوتا تھا۔

بعض مواقع پر مثلاً حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے تفردات کا ذکر آتا تو پہلے اُن کے علم وفضل اور تفقہ وتبحر کو سراہتے اُن کی عظمت وشان بیان فرماتے۔

اور پھر اُن کے کلام پر بحث و نظر سے تنقید فرماتے جس میں عجیب متضاد کیفیات جمع ہوتی تھیں، ایک طرف ادب و عظمت اور دوسری طرف ردّ و قدح یعنی بے ادبی اور جسارت کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ سے بھی بچتے۔ اور راجح اور صواب میں کتمان صواب سے بھی دور رہتے۔ کبھی کبھی علمی جوش میں آکر برنگ مزاح بھی ردّ و قدح فرماتے تھے۔ جو بجائے خود ہی ایک مستقل علمی لطیفہ ہوتا تھا۔

ایک بار غالباً استواء علی العرش کے مسئلہ پر کلام فرماتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ اور اُن کے مسلک اور دلائل کا تذکرہ آیا تو پہلے اُسے شرح و بسط سے بیان فرمایا۔ پھر اُن کے علم کی عظمت و شان کو کافی وقیع اور عقیدت بھرے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ حافظ ابن تیمیہ جبالِ علوم میں سے ہیں۔ اُنکی رفعتِ شان اور جلالتِ قدر کا یہ عالم ہے کہ اگر میں اُن کی عظمت کو سر اُٹھا کر دیکھنے لگوں تو ٹوپی پیچھے کی طرف گر جائے گی اور پھر بھی نہ دیکھ سکوں گا۔ لیکن با ایں ہمہ مسئلہ استواء علی العرش میں اگر وہ یہاں آنے کا ارادہ کریں گے تو درس گاہ میں نہیں گھُسنے دوں گا۔ یا کبھی ان اکابر متقدمین کے کسی موہم یا شرح طلب کلام کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے کہ ہر شخص اپنی ہی جلالت شان کے مطابق کلام کرتا ہے۔ اُسے کیا خبر ہوتی ہے کہ بعد میں ہم جیسے گھس کھدے بھی آنے والے ہیں جو اِس کلام کی عظمت میں غلطان و پیچان ہو کر رہ جائیں گے؟

بہرحال درس کا انداز ایک عجیب نیرنگی کا رنگ لئے ہوئے تھا جو بالکل انوکھی تھی جس میں علوم و فنون بھی ہوتے تھے تائید و تنقید بھی ہوتی تھی۔ علوم و معارف کے ساتھ علمی مزاح اور لطائف و ظرائف بھی ہوتے تھے جس سے ہر استعداد

کا طالب علم لطف اندوز ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی خود طلبہ کے ساتھ بھی علمی رنگ کا مزاح فرما لیتے تھے۔

عصر مغرب کے درمیان ایک دن بخاری کا درس زور شور سے ہو رہا تھا۔ احقر بھی اُس سال بخاری میں تھا اور شریک درس بھی تھا کہ اچانک کتاب بند کر دی اور فرمانے لگے کہ جب بھائی شمس الدین ہی رخصت ہو گئے تو اب درس کا کیا لطف رہا جاؤ تم بھی گھر کا رستہ لو۔

ہم سب حیران ہوئے کہ کون بھائی شمس الدین اور وہ آئے کب تھے۔ اور رخصت کب ہو گئے؟ ہماری حیرانی کو دیکھ کر سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو غروب ہو رہا تھا۔ فرمایا کہ جاہلین دیکھتے نہیں وہ بھائی شمس الدین جا رہے ہیں۔ اب کیا اندھیرے میں سبق پڑھو گے؟ کیا وہ لطف کا سبق ہو گا؟

ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالب علم نے سوال کیا مگر مہمل انداز سے۔ فرمایا کہ جاہل تجھے معلوم نہیں کہ میں اسناد متصل کرنا بھی جانتا ہوں۔ جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہو گی؟ میں اس اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا وہ اپنے پاس والے کو ملے گا وہ اپنے پاس والے کو رسید کرے گا۔ یہاں تک کہ تھپڑ کا یہ فعلی سلسلہ سند تجھ تک پہونچ جائے گا۔

یہ تہدید بھی تھی اور حکیمانہ رنگ سے فنی اصطلاحات میں ایک مزاح بھی تھا۔ جس سے طلبہ کی تنشیط (نشاط میں لانا) مقصود تھا۔

ایک دفعہ مسائل فقہیہ کے ذیل میں نابالغ کی امامت کا ذکر آ گیا کہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ فرمانے لگے کہ مسئلہ تو یہی ہے۔ مگر بعض نابالغوں کے پیچھے ہو بھی جاتی ہے

(اُس زمانہ میں حضرت ممدوح ہی مسجد دارالعلوم میں امامت کرتے تھے) فرمانے لگے کہ تم نے کبھی پیر نابالغ بھی دیکھا ہے؟ جو ساٹھ برس کا بھی ہو اور نابالغ بھی؟ جاہلین وہ ساٹھ برس کا نابالغ میں ہوں (اس وقت تک حضرت ممدوح کی شادی نہیں ہوئی تھی) اشارہ اسی طرف تھا۔

ایک دفعہ ملا علاؤ الدین میرٹھی جو اُس زمانہ میں قلفی کا برف بیچا کرتے تھے اور آج کل دودھ مٹھائی کی دوکان کرتے ہیں۔ نہایت دیندار اور وضعدار آدمی ہیں قلفی برف کا مٹکا لیکر دارالاہتمام میں پہونچ گئے جہاں حضرت والد ماجد کے پاس اُسوقت حضرت شاہ صاحب اور چند اور اکابر مدرسین تشریف فرما تھے۔ حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ نے ملاجی کو روک کر برف کی قلفیاں کھولنے کے لئے فرمایا۔ یہ سب حضرات قلفیاں تناول فرماتے رہے۔ کھانے کے دوران میں حضرت شاہ صاحب نے مُلاجی سے پوچھا کہ آپ اس برف کی تجارت میں ماہانہ کتنا پیدا کر لیتے ہیں؟ کہا کہ ساٹھ روپیہ ماہوار۔ اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب کی تنخواہ بھی ساٹھ ہی روپیہ ماہوار تھی۔ مسکرا کر فرمانے لگے کہ تو پھر تمہیں دارالعلوم کی صدر مدرسی کی ضرورت نہیں۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب کا حلقۂ درس اور ساتھ ہی دوسری مجالس علم و کمال کے ساتھ ظرافت سے بھی معمور ہوتی تھیں جو اُن کی زندہ دلی اور فقہ نفس کی دلیل تھی۔ اور اس ذیل میں کتنے ہی علوم و معارف بیساختہ نکلے ہوئے ارباب مجلس کے ہاتھ پلے پڑ جاتے تھے۔

مگر اس کے باوجود مجلس شرعی آداب سے بھرپور ہوتی تھی جس میں غیر متعلق یا فضول اور لایعنی باتوں کا کوئی وجود نہ ہوتا تھا۔

اگر کسی شخص نے کسی کی برائی یا فضول بات شروع کی تو معًا فرماتے کہ بھائی ہمیں اس کی فرصت نہیں ہے۔ کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو پوچھو ورنہ جاؤ۔ ہمارا وقت ایسی باتوں کے لئے فارغ نہیں۔ وقت کی بہت زیادہ قدر اور حفاظت فرماتے تھے۔

اوقات کا بڑا حصہ مطالعۂ کتب میں گذرتا تھا۔ ذوقِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ طبعی اور شرعی ضروریات کے علاوہ کوئی وقت کتب بینی یا افادہ سے خالی نہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ فتح الباری کا (جو تیرہ [۱۳] جلدوں کی کتاب ہے) تیرھویں مرتبہ مطالعہ کر رہا ہوں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لئے کبھی مطالعہ نہیں دیکھتا۔ مطالعہ کا مستقل سلسلہ ہے اور درس کا مستقل اس لئے ہر سال درس میں نئی نئی تحقیقات آتی رہتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس درس کے لئے مطالعہ کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جب وقت کے تمام گوشے مطالعہ سے پُر تھے۔ گویا مطالعہ لا محدود تھا تو محدود مطالعہ کی ضرورت بھی کیا تھی؟ کتبِ درسیہ اور بالخصوص کتبِ حدیث کے فنی مباحث طبیعت ثانیہ بن چکے تھے۔ اور ہمہ وقت کے مطالعہ سے اُن میں روز بروز بسط وانبساط کی کیفیات پیدا ہوتی چلی جا رہی تھیں اور مباحثِ درس گھٹنے یا قائم رہنے کے بجائے خود ہی یومًا فیومًا بڑھتے رہتے تھے تو انھیں جزوی مطالعہ سے بڑھانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ بلکہ شاید یہ مقررہ جزوی مطالعہ علوم کے بڑھتے ہوئے بسط میں کچھ نہ کچھ حارج اور حد بندی ہی کا سبب بن جاتا۔

پھر یہ عام مطالعہ محض کتبِ درسیہ یا شروح وحواشی اور منہیاتِ درس تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ تمام فنون کی ہر میسر آمدہ کتاب تک پھیلا ہوا تھا جن میں کسی علم و فن

کی تخصیص نہ تھی۔ ذہن کسی ایک فن کے ساتھ مقید نہ تھا بلکہ مطلقاً علم کے بارہ میں ہل من مزید کا ذوق رکھتا تھا۔ اور حدیث منہومان لایشبعان کا صحیح مصداق تھا۔ مصر تشریف لے گئے تو اوقات کا بڑا حصہ کتب خانہ خدیویہ کی کتب کے مطالعہ میں صرف ہوتا۔ حجاز حاضر ہوئے تو حرمین کے کتب خانے کنگھال ڈالے اور فرائض و تطوعات کے بعد گویا آپ کی عبادت یہ تبحر اور کتب بینی تھی۔ مرضِ وفات میں اطباء نے مطالعہ کی ممانعت کردی لیکن جب بھی موقع ملا جب ہی کتب بینی شروع کردی اطباء نے کہا کہ حضرت اس سے مرض بڑھ جائے گا۔ فرمانے لگے کہ بھائی یہ کتب بینی خود ہی میرا مستقل مرض ہے اور لاعلاج ہے۔

مطالعہ کے سلسلہ میں فنون عصریہ فلسفۂ جدید، ہیئتِ جدید حتیٰ کہ فنِ رمل اور جفر کی کتابوں کو بھی مطالعہ سے نہ چھوڑا۔

جب بھوپال شادی کے سلسلہ میں تشریف لے گئے تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک جماعت نے عصری فنون کی کچھ بحثیں چھیڑ دیں۔ آپ نے انہی فنون کی اصطلاحات میں بحوالۂ کتب جوابات دیئے اور فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ ہم لوگ ان فنون سے نابلد ہیں۔ ہم ان عصری فنون کی کتابوں کا مطالعہ بھی کافی کئے ہوئے ہیں۔ اور ان فنون کی بنیادوں کو بھی جانتے ہیں۔ یہی صورت مسائل حاضرہ کے مطالعہ کی بھی تھی۔

سفر پنجاب کے سلسلہ میں جب لاہور پہونچے تو یہ زمانہ سود کی تحریک کا تھا مسلمانوں کی ایک جماعت اقتصادی وجوہ پر سودی بینکوں کا قیام مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھ رہی تھی۔ مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری رسالہ "سود مند" نکال رہے تھے اور جواز سود کا پرچار شد و مد سے کیا جا رہا تھا۔ لاہور پہونچنے پر حضرت کے قیامگاہ پر

لوگ ملنے کے لئے آنے لگے مجمع ہوگیا۔ مولانا ظفر علی خاں بھی آگئے اور جواز سود کے بارہ میں اقتصادی دلائل سے بھری ہوئی ایک تقریر کی جس میں ضرورتِ سود پر کلام کیا گیا تھا۔

مقصد یہ تھا کہ حضرت ممدوح بھی اُس کی تائید میں کچھ فرمادیں۔ حضرت شاہصاحبؒ نے ساری بسیط تقریر سنکر جواب میں فرمایا کہ بھائی جسے جہنم میں جانا ہو وہ خود جائے ہماری گردن کو پُل نہ بنائے کہ اُس سے لٹک کر پہونچے۔ اور اُس کے بعد سودی کاروبار کے مضرات اور اس تحریک کے غلط ہونے پر سیر حاصل علمی بحث فرمائی جس سے لوگوں کے خیالات کی کافی حد تک اصلاح ہوئی۔

علامہ اقبال مرحوم کے خیالات کی بہت حد تک اصلاح حضرت ممدوح کی ارشادات سے ہوئی۔ اُن کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات و شبہات سے پُر آتے تھے۔ اور حضرت اُن کے شافی جوابات لکھتے جس سے اُن کے قلب کی راہ بنتی چلی گئی۔

غرض کثرۃ مطالعہ صرف درسی علوم کی کتب تک محدود نہ تھا۔ عصری علوم و فنون کا مطالعہ بھی جاری رہتا تھا۔ جس سے نو تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ بھی مرعوب اور مستفید تھا۔

میں نے ۱۳۴۱ھ میں اپنے ایک عربی قصیدے "نونیۃ الآحاد" کے طبع کرانے کا ارادہ کیا۔ اس قصیدہ میں اُمت کے مشاہیر علم و فن کی مختصر مختصر سوانح نظم و نثر میں جمع کیگئی ہے۔ جسے اُس زمانہ میں طبع کرایا گیا تھا۔ اور اب چھوٹی خوبصورت تقطیع پر برخوردار مولوی حافظ قاری محمد سالم سلمہ نے اپنے ادارہ تاج المعارف کی طرف سے دوبارہ طبع کرایا ہے۔ اس قصیدہ میں ابوالحسن کذّاب کا نام بھی مشاہیر کے سلسلہ میں آیا ہے کہ یہ صفت

کذب اور دروغ گوئی میں مشہور اور یکتائے روزگار تھے مجھے ان کی تاریخ نہ ملی جو اس قصیدہ میں درج کرتا۔ اس صورت میں ہم لوگوں کی آخری دوڑ یہ ہوتی تھی کہ حضرت شاہ صاحب تک پہونچ جاتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں بلا محنت و مشقت علم کا نایاب اور وسیع ذخیرہ لیکر گھر آجاتے تھے جو برسہابرس کے ذاتی مطالعہ سے بھی حاصل ہونا دشوار تھا۔

میں اپنے اسی معمول بہ دستور کے مطابق حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں اُن کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ مرض وفات اپنی آخری حد پر پہونچ چکا تھا اور دو تین ہفتہ بعد ہی وصال ہونے والا تھا۔ کمزور بے حد ہو چکے تھے لیٹنے بیٹھنے میں بے حد تکلف ہوتا تھا۔ اطلاع کرنے پر مجھے حسب معمول گھر میں بلالیا۔ اور عادت تھی کہ جب بھی میں پہونچتا تو کسی نہ کسی چیز سے تواضع فرماتے۔ فوراً چائے بنانے کا حکم دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت ممدوح کا دارالعلوم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور میں اُس زمانہ میں عہدۂ اہتمام دارالعلوم پر تھا۔ لیکن حضرت ممدوح کے اس رسمی تعلق کے انقطاع بلکہ اس سے بھی پہلے فتنہ ۴۲ھ کے زمانہ میں میرا تعلق اُن سے وہی رہا جو پہلے سے تھا۔ حتی کہ آمد و رفت بھی منقطع نہیں ہوئی۔ اسے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی محسوس فرماتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ پھر یہ تعلق کوئی رسمی یا دنیوی نہ تھا جو قطع ہو جاتا۔ بلکہ روحانی تھا اور قدیم تھا جو ناممکن الانقطاع تھا۔ گو درمیانی مدۃ میں قضاء و قدر سے وہ دستور اذ مغلوب سا ہو گیا تھا اور تکوینی طور پر اَنْ نَزَغَ الشَّیطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ فتنہ کا منظر کا ظہور ضرور ہوا تاہم یہ سب سطحی بات تھی قلبی طور پر محبت و عقیدت کا علاقہ بدستور قائم تھا اور اُس میں جتنا کچھ رخنہ پڑ گیا تھا

مرورِ ایام سے اُس میں بھی اضمحلال آچکا تھا اس لئے از اوّل تا آخر میرے لئے حضرت ممدوح کے قلبِ مبارک میں کافی گنجائش تھی جس کا ظہور میری گاہ بگاہ حاضری پر ہوتا رہتا تھا۔ اس موقع پر بھی حسبِ معمول اُس بزرگانہ شفقت سے پیش آئے۔ چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد متوجہ ہوئے۔ فرمایا مولوی صاحب کیسے تشریف لائے۔

میں نے عرض کیا حضرت ابوالحسن کذاب کا ترجمہ نہیں ملتا اُس کے بارہ میں نشان معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا ادب و تاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کر لیجئے۔ تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام لے دیئے۔ اور اُن کے مظان و مواقع کی نشاندھی فرما دی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اس شخص کی پوری تاریخ معلوم کرنی نہیں۔ صرف اُن کی صفتہ کذب و دروغ گوئی کے حالات معلوم کرنے ہیں مگر اُن کا کوئی عنوان کسی کتاب میں نہیں ملتا کہ اُس کے نیچے ان خاص واقعات کا مطالعہ کر لوں۔

فرمایا مولوی صاحب آپ نے بھی کمال کیا۔ صفتہ کذب کونسی صفتہ مدح ہے کہ لوگ اُس پر عنوانات قائم کر کے اُس کے واقعات دکھلائیں۔ ایسی مذموم صفات وافعال کا تذکرہ تو ضمناً اور استطراداً آجاتا ہے۔ عنوان ہمیشہ کمالات پر قائم کئے جاتے ہیں نہ کہ نقائص وعیوب پر۔ ان کتب میں فلاں فلاں مقام دیکھ لیجئے۔ ضمناً اُس کی صفتہ کذب کا بھی تذکرہ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء بھی یاد نہ رہیں گے چہ جائیکہ اُن کے یہ مظان اور مواقع محفوظ رہیں۔ نیز انتظامی مہمات کے بکھیڑوں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی مثالوں کے لئے اتنا طویل دعریض مطالعہ کر دوں۔

بس آپ ہی اس شخص کے کذبات اور دروغ گوئی سے متعلقہ واقعات کی دو چار مثالیں بیان فرمادیں۔ میں اُنہی کو آپ کے حوالہ سے جزوِ کتاب بنادوں گا۔ اسپر مسکرا کر ابوالحسن کذاب کی تاریخ اُس کے سنہ ولادۃ سے سن وار بیان فرمانی شروع کردی جس میں اُس کے جھوٹ کے عجیب وغریب واقعات بیان فرماتے رہے۔ آخر میں سن وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا۔ پھر اُس جھوٹ کی تفصیل بیان فرمائی۔

حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان ایسے طرز سے ہورہا تھا کہ گویا حضرت ممدوح نے آج کی شب میں مستقلاً اسی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو اس بسط سے سن وار واقعات بیان فرمارہے ہیں۔

میں نے تعجب آمیز لہجہ میں عرض کیا کہ حضرت شاید کسی قریبی ہی زمانہ میں اسکی تاریخ دیکھنے کی نوبت آئی ہوگی؟ سادگی سے فرمایا جی نہیں۔ آج سے تقریباً چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا ہوا تھا۔ خدیوی کتب خانہ میں مطالعہ کے لئے پہونچا تو اتفاقاً اسی ابوالحسن کذاب کا ترجمہ سامنے آگیا اور اُس کا مطالعہ دیر تک جاری رہا۔ بس اُسی وقت جو باتیں کتاب میں دیکھیں حافظہ میں محفوظ ہوگئیں اور آج آپ کے سوال پر مستحضر ہوگئیں جن کا میں نے اس وقت تذکرہ کیا۔

اللہ اکبر۔ یہ واقعات حدیث وتفسیر اور فقہ واصول کے اُن مباحث سے تعلق نہ رکھتے تھے جو اُن کے متداول فنون اور روزمرّہ کے مشاغل میں سے تھے۔ بلکہ ایک غیر متعلق بات اور وہ بھی چالیس سالہ مدۃ کی ذہن میں آئی ہوئی اور اوپر سے وہ بھی کسی اہتمام سے نہیں محض اتفاقی طور پر اور سرسری انداز سے ذہن میں آئی ہوئی

چیز تھی۔ اُس کا اتنا استحضار عام معتاد حافظہ سے بالاتر کراماتی حافظہ سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ جس علم و فن میں بھی گفتگو فرماتے۔ تبحر و استحضار کی یہی نوعیت ہوتی تھی۔ کہ گویا اس مسئلہ کو ابھی دیکھکر اور ذہن میں سمیٹ کر آ رہے ہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ صدر جمعیۃ علماء دہلی کا حضرت ممدوح کو "چلتا پھرتا کتب خانہ" کہنا حقیقتاً اظہارِ حقیقت پر مبنی ہے اور حضرت ممدوح اس لقب کے جائز طور پر ہی نہیں۔ بلکہ واجبی طور پر مستحق ہیں۔

وفورِ مطالعہ اور اُس کے ساتھ قوتِ حافظہ ایسا ہی ہے جیسے سرمایہ دار سرمایہ کی ساتھ سخی دل بھی ہو۔ بخیل سرمایہ دار ہو تو بے فیض اور بے نتیجہ ہے۔ جیسے بعض کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے۔ لیکن قوتِ حافظہ نہ ہونے کے سبب اُن کا وقتی شوقِ مطالعہ تو پورا ہو جاتا ہے مگر خود اُن کو یا دوسروں کو اس مطالعہ کی کاوشوں سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جس درجہ مطالعہ وسیع تھا اُسی درجہ حافظہ بھی قوی تھا۔ گویا ذہن و حافظہ ہر وقت تیار رہتے تھے کہ آنکھیں یا کان کچھ لائیں تو وہ فوراً اُسے جمع کر لیں۔ بلا شبہ حضرت ممدوح کے اس غیر معمولی حافظہ سے حُفّاظِ سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ اُنھیں غیر متداول بلکہ غیر معروف کتب کی عبارتیں بھی اس درجہ مستحضر رہتی تھیں کہ وقت پڑنے پر بے تکلف پیش کر دیا کرتے تھے۔ اور علماء حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے تھے۔

تحریکِ خلافت کے دَور میں جب امارتِ شرعیہ کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خاں صاحب گورکھپوری نے اس مسئلہ میں اپنے بعض نقاطِ نظر کی تائید

میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو اُن کے نقطۂ نظر کی تو مؤید تھی مگر مسلکِ جمہور کے خلاف تھی۔ یہ عبارت وہ لے کر خود دیوبند تشریف لائے اور مجمعِ علماء میں اُسے پیش کیا۔ تمام اکابرِ دارالعلوم حضرت شاہ صاحب کے کمرہ میں جمع تھے۔ حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو رَد ہی کر سکتے تھے کہ وہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی۔ اور نہ اُسے قبول ہی کر سکتے تھے کہ مسلکِ جمہور کے صراحتہً خلاف تھی۔ یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اُسے کسی تاویل و توجیہ سے بھی مسلکِ جمہور کے مطابق نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحب استنجا کے لئے تشریف لیگئے ہوئے تھے۔ وضو کرکے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق و توفیق بھی نہیں بن پڑتی۔ حضرت ممدوح حسب عادت حسبنا اللہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا کہ اس عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا ہے اور دو سطروں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ درمیانی ایک سطر چھوڑ دی گئی ہے۔ اُسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی دیکھا گیا تو واقعی اصل عبارت میں سے پوری ایک سطر درمیان میں سے حذف ہوئی تھی۔ جوں ہی اس ساقط کردہ سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا عبارت کا مطلب مسلکِ جمہور کے موافق ہو گیا اور سب کا تحیّر رفع ہو گیا۔

بہرحال حافظہ و انتقالِ ذہنی کے لحاظ سے حضرت ممدوح آیۃ من آیات اللہ تھے۔ جس کی نظیر ان قریبی زمانوں میں نہیں ملتی۔

حضرتِ ممدوح کی اس تبحر پسندی اور ذوقِ زیادۂ علم کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ میں

بھی وہی ذوقِ تبحر پیدا ہونے لگا۔ ہر طالب علم کوشش کرتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتب کا مطالعہ کرے۔ زیادہ سے زیادہ تحقیق کے ساتھ مسئلہ کی تہ تک پہونچے۔ اُس دَور میں ہر چھوٹے بڑے کا یہ ذہن بن گیا تھا۔ اور اُس کے آثار زمانۂ طالب علمی ہی میں نمایاں ہونے لگتے تھے۔

چنانچہ اُس زمانہ کے متعدد طلبائے دورۂ حدیث نے اچھے اچھے قابلِ قدر رسالے اور مضامین سے اپنے علمی تبحر کا ثبوت دیا۔ میں نے ادب و تاریخ کے سلسلہ میں رسالہ "مشاہیر اُمت" لکھا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب حال ساکن پاکستان نے ختم النبوۃ فی القرآن اور ختم النبوۃ فی الحدیث کا رسالہ دو جلدوں میں مرتب کیا۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے التصریح بما تواتر فی نزول المسیح لکھا۔ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی نے بھی کئی رسالے لکھے۔ اور تقریباً دو تین سال کے عرصہ میں احاطۂ دار العلوم سے اٹھارہ انیس رسالے شائع ہوئے۔

یہ درحقیقت وہی ذوق تھا جو حضرت ممدوح کے درسِ حدیث سے طلبہ لے کر اٹھتے تھے اور علمی طور پر اپنے اندر زمانۂ طالب علمی ہی میں ایک ایسی قوۃ محسوس کرنے لگتے تھے کہ گویا وہ تمام علوم و فنون پر حاوی ہیں اور علم اُن کے اندر سے خود بخود اُبھر رہا ہے۔ وہ کتب بینی محض عنوان بیان تلاش کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔

حضرت ممدوح کے یہاں علم کے اس غیر معمولی شغف و انہماک اور ہمہ تن کے شغل کے باوجود عمل بالسنتہ اور اتباع سلف کے اہتمام میں ذرہ برابر کمی اور کوتاہی نہ ہوتی تھی۔

ہم بہت سی سنتیں اُن کے عمل دیکھ کر معلوم کر لیا کرتے تھے۔ کھانا کھانے کے

بعد تولیہ یا رومال سے ہاتھ پونچھنے کے بجائے ہمیشہ حسب معمول نبوی پاؤں کی تلووں سے ہاتھ پونچھ لیتے تھے۔ اُکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ کھانے میں ہمیشہ تین انگلیاں استعمال کرتے تھے۔ اور دونوں ہاتھ مشغول رکھتے تھے۔ بائیں ہاتھ میں روٹی اور داہنے ہاتھ سے اُسے توڑ توڑ کر استعمال کرتے تھے۔ لقمے ہمیشہ چھوٹے چھوٹے استعمال کرتے تھے۔ یہی صورت لباس کی تھی پاجامہ نیم ساق سے کبھی نیچا نہ ہوتا تھا۔ عمامہ کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ سردیوں میں اکثر وبیشتر سبز یا سیاہ رنگ کا عمامہ استعمال فرماتے تھے۔ زہد وتقویٰ حضرت ممدوح کے روشن اور کھلے ہوئے چہرہ پر برستا تھا ایک غیر مسلم شخص نے کسی موقعہ پر حضرت ممدوح کا سُرخ وسفید رنگ کشادہ پیشانی اور ہنس مُکھ چہرہ نیز چہرہ کی مجموعی وجاہت وعظمت دیکھ کر کہا تھا کہ "اسلام کی حق ہونے کی ایک مستقل دلیل یہ چہرہ بھی ہے۔" جمعہ کے لئے جاتے تو فاسعوا الیٰ ذکر اللہ کا منظر سب کو نظر آتا سعی اور دوڑ کی شان تیز رفتاری اور لمبے لمبے قدم ڈالنے کی چال سے نمایاں ہوتی تھی۔ حسبنا اللہ تکیۂ کلام تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے اکثر وبیشتر حسبنا اللہ فرماتے اور ایسے ہی موقعہ بموقعہ اللہ اجلّ فرماتے رہتے تھے۔ درس میں بعض اوقات غایت خشیت سے آنکھوں میں نمی آجاتی۔ جسے ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انشاد قصائد اور وعظ میں خوف وخشیت کے اشعار اکثر تر آنکھوں کے ساتھ پڑھتے جس سے چہرہ مظہرِ خشیتِ الٰہی نظر آتا تھا اور سامعین کی آنکھیں تر ہوجاتی تھیں۔ ٹھیک طریقۂ نبوی کے مطابق کن انکھیوں سے دیکھتے اور جدھر متوجہ ہوتے پورے پورے متوجہ ہوتے تھے

ادبِ علم کا یہ عالم تھا کہ خود ہی فرمایا کہ میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا۔ بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہوکر مطالعہ کرتا ہوں۔

چنانچہ سفر و حضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کر رہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں۔ بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مؤدب انداز سے بیٹھتے۔ گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کر رہے ہیں۔

یہ بھی فرمایا کہ "میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا"۔ سبحان اللہ کہنے کو تو یہ بات بہت چھوٹی سی نظر آتی ہے۔ لیکن اُس پر استقامت اور دوام ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہی کر سکتا ہے جسے حق تعالیٰ نے ایسے کاموں کے لئے موفق اور میسّر کر دیا ہے۔ اور وہ گویا بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ اُس سے دینی آداب کے عملی نمونے پیش کرائے جائیں۔ کُلٌّ میسّرٌ لما خُلق لہٗ۔ سہ

ہر کسی را بہر کارے ساختند   میل اور ادر دلش انداختند

ادبِ شیوخ و اکابر کا یہ عالم تھا کہ اُن کے سامنے کبھی آنکھ اُٹھا کر یا آنکھ ملا کر گفتگو نہ فرماتے۔

فتنہ ۱۳۴۲ھ میں جب معاملہ حدود سے بڑھنے لگا۔ اور حضرت ممدوح نے مدرسہ میں آنا اور درس دینا چھوڑ دیا جس سے طلبہ میں انتشار پھیل گیا اور اسٹرائک کی صورت پیدا ہوئی تو حضرت والد ماجدؒ نے بلا واسطہ اس مسئلہ کو سلجھانے کی سعی فرمائی۔ اور ایک دن اچانک صبح کے وقت حضرت ممدوح کے مکان پر تنِ تنہا پہونچ گئے اور اطلاع ہونے پر اکدم گھبرا کر حضرت ممدوح باہر تشریف لائے اور اُسی سابقہ نیازمندی کے ساتھ بہت ہی مؤدبانہ انداز سے پردہ کرا کر گھر میں لے گئے۔ گردن جھکا کر عرض کیا کہ حضرت اس وقت اچانک کیسے تکلیف فرمائی؟

حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ حضرت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میرا بھی آپ پر کوئی حق ہے؟ فرمایا ہے۔ اور یہ ہے کہ اگر آپ میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہنیں تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ والد ماجد نے فرمایا کہ بارک اللہ۔ بس تو میری گذارش یہ ہے کہ آپ ان قصوں کو چھوڑ دیں اور مدرسہ چلیں اور میرے ساتھ چلیں۔ فرمایا بہت اچھا حضرت نے چند معاملات پیش فرمائے کہ حضرت انھیں یوں کر دیا جائے۔

والد ماجد نے فرمایا کہ آپ کا منصب مطالبہ کرنے کا نہیں مطالبے پورا کرنے کا ہے۔ آپ اپنے قلم سے جو مناسب سمجھیں چل کر خود کر دیں۔ اس پر ساتھ ہو لئے اور مدرسے میں پہونچ گئے۔ سب کو حیرت اور بے انتہا مسرت ہوئی کہ سارا فتنہ ختم ہو گیا۔ والد ماجد نے فرمایا کہ یہ سب مطالبے آپ خود جاری کر دیں اور درس شروع کرا دیں۔ فرمایا کہ حضرت اتنی اجازت دیں کہ ظہر کے بعد حاضر ہو کر درس شروع کروں۔ فرمایا مضائقہ نہیں۔ حضرت ممدوح تشریف لے گئے۔ مگر پھر ظہر کے بعد تشریف نہیں لائے۔ اور معلوم ہوا کہ لوگوں نے مجبور کر کے روک دیا۔

مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ زمانۂ اختلاف میں ادب و توقیر اور تسلیم و رضا کا بذاتِ خود یہ عالم تھا جو اس واقعہ میں آپ نے دیکھا۔

تقریری افادہ کے ساتھ تحریری افادہ یعنی تصنیف کا بھی آپ میں کافی ذوق تھا۔ حدیث میں متعدد نافع اور نادرۂ روزگار رسالے تالیف فرمائے اور علمی تراکیب چھوڑے جیسے نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین۔ فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب۔ کشف الستر عن مسئلۃ الوتر۔ اکفار الملحدین۔ خاتم النبیین (فارسی)، مرضِ وفات میں رو کر فرمایا کہ ہم نے عمر ضائع کی اور کوئی کام آخرت کے لئے نہ کیا یہ رسالہ "خاتم النبیین" اس لعین قادیانی

کے رد میں لکھا ہے توقع ہے کہ شاید یہ رسالہ میری نجات کا ذریعہ ہو جائے۔

دار العلوم کے سنین قیام میں سے تقریباً اواخر سنین میں کلامی مسائل کی طرف توجہ ہوئی۔ ابتدائی ایام میں کلامی مسائل میں زیادہ ذوق سے کام نہیں فرماتے تھے۔ نقل و روایت کا غلبہ تھا۔ آخر عمر میں یہ ذوق اُبھرا تو خارج اوقات میں دوپہر کے ابتدائی حصہ میں کتاب شروع کرائی احقر بھی اُس میں شریک تھا۔ اُس میں بالخصوص حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی کتب کے حوالہ سے کلامی مسائل میں اُن کے علوم کو بیان فرماتے۔ اور اُن کی شرح فرماتے اور آخر کار ان علوم کے عنوانات منضبط کرنے کے لئے عربی کا ایک بلیغ قصیدہ خود ہی موزوں فرمایا جو "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اُس کے ایک ایک شعر میں بہت سے مسائل کھپا دیئے ہیں۔ ساتھ ہی اُن کی تشریحات کیلئے مأخذوں کے حوالے دیتے گئے ہیں۔ جن میں تمام کتب معقول و فلسفہ کے حوالوں کے ساتھ علوم قاسمیہ کی کتب مثلاً تقریر دلپذیر۔ انتصار الاسلام۔ مباحثہ شاہجہانپور وغیرہ کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔ خط نہایت پاکیزہ تھا۔ حرف موتیوں کی طرح کاغذ پر جڑے ہوئے نظر آتے تھے اور بہت خوبصورت ہوتے تھے۔ باریک قلم سے لکھتے تھے اور مختصر نویسی کے ساتھ لکھنے کی عادۃ تھی۔ اکثر تحریریں اشارات ہوتے تھے جنکو صاحب ذوق ہی سمجھ سکتا تھا۔

فن ادب اور شاعری کا ذوق بہت بلند پایہ تھا۔ دار العلوم میں عام اجتماعات یا کسی بڑی شخصیت کے قدوم یا کسی اہم حادثہ کے وقوع پر قصائد قلمبند فرماتے اور اُنھیں مجمع میں سُناتے۔ پڑھنے کا طرز نہایت دلکش تھا۔ ترنّم کے ساتھ پڑھتے تھے جس سے سامعین پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ عربی اور فارسی کی بلاغۃ اعلیٰ مقام تک پہونچی ہوئی تھی۔ فرماتے کہ مقامات حریری جیسی عبارت ایک گھنٹہ میں چار ورق برجستہ لکھ سکتا ہوں

لیکن ہدایہ جیسی عبارت چار مہینوں میں بھی چار سطر نہیں لکھ سکتا۔ اُردو سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ لیکن کلام بہرحال بلیغ ہوتا تھا مگر عربیت آمیز۔

اس اُردو اجنبیت کی وجہ سے ہم لوگوں میں اردو کی ایک گونہ تحقیر قائم ہوگئی تھی اردو کی کتابوں کو دیکھنا عیب سا معلوم ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ خود اپنے اسلاف صالحین کی علوم و معارف سے بھری ہوئی اُردو تصنیفیں دیکھنے میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ خواہ اسے محسوس کر کے یا از خود داعیۂ قلب سے ایک دن تفسیر بیان القرآن اُردو از حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے بارہ میں فرمایا کہ اُردو میں اتنی چست تفسیر آج تک نظر سے نہیں گذری۔ اس تفسیر نے بہت سی پرانی تفاسیر سے مستغنی کر دیا ہے۔

اس کے بعد سے ہم لوگ اُردو کی کتابیں دیکھنا گویا جائز سمجھنے لگے تھے۔ اور یہ کہ اُردو زبان بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے علم کا تعلق ہو سکتا ہے۔

اثنائے سال تعلیمی میں گاہ بگاہ سفر بھی فرماتے تھے۔ اور سال بھر میں سفروں کی تعداد خاصی ہو جاتی تھی۔ اُس میں بعض سفر لمبے لمبے بھی ہوتے تھے جیسے پنجاب و سرحد وغیرہ کے اسفار سے ردّ قادیانی کے سلسلہ میں پنجاب کے مستقل دَورے بھی فرمائے۔ خاص قادیان کا سفر بھی ہوا جس میں ایک بڑی جماعۃ ساتھ تھی اور ہم لوگ بھی ہمرکاب تھے۔ اور سفروں میں بھی احقر ساتھ رہا ہے۔

تقریر علمی ہوتی تھی جس سے علماء استفادہ کر سکتے تھے۔ لیکن عوام بعد عقیدت سنکر برکت حاصل کرتے تھے۔

کھوٹہ ضلع راولپنڈی کے سفر میں احقر اور مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی حال شیخ الحدیث جامعۂ اشرفیہ لاہور۔ اور دوسرے بعض اور مستفیدین بھی ساتھ تھے۔

حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمہ اللہ بھی ہمراہ تھے۔ راولپنڈی پہونچے بڑی بڑے اجتماعات ہوئے اور بڑی بڑی عالمانہ تقریریں ہوئیں مجلسی خوش مذاقی اور ظرافت کے سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم وظیفہ پڑھ رہے تھے جو ناشتہ آگیا۔ حضرت ممدوح نے زور سے فرمایا کہ شیخ وظیفہ کا مقصد آچکا ہے دسترخوان پر آجائیے۔

کھوٹہ کے اسی سفر میں حضرت ممدوح نے مجھے "فقیر صاحب" کا خطاب عطا فرمایا صورتِ واقعہ یہ ہوئی کہ بارش بہت زیادہ ہوگئی، جلسہ گاہ شہر سے میل بھر کے فاصلہ پر تھی۔ راستہ میں بھی بارش آگئی اور میں سر سے پیر تک پانی میں مع کپڑوں کے نچڑ گیا جلسہ گاہ کے قریب ایک مسجد میں پہونچکر بھیگے ہوئے کپڑے اُتارے۔ ایک صاحب نے اپنی چادر لنگی کے طور پر دی اور ایک صاحب نے اوڑھنے کے لئے دوسری چادر دیدی میں لنگی باندھ کر اور چادر اوڑھ کر ننگے سر ننگے پاؤں حضرت شاہ صاحب کی ساتھ جلسہ گاہ میں پہونچا۔ حکم فرمایا کہ اس وقت جلسہ میں تقریر تجھی کو کرنا ہوگی۔ چنانچہ مجھے اسٹیج پر کھڑا کر کے خود ہی میرے تعارف کی تقریر کی اور فرمایا کہ "یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے حلہ میں ننگے سر ننگے پاؤں کھڑے ہیں فلاں ہیں، فلاں کے بیٹے اور فلاں کے پوتے ہیں۔ علمی سواد خاصا رکھتے ہیں۔ مجمع میں بولنے کا ڈھنگ انھیں آگیا ہے۔ یہ جیسے باہر سے فقیر نظر آتے ہیں ویسے ہی اندر سے بھی فقیر صاحب ہی ہیں آپ ان کی تقریر سے فائدہ اُٹھائیں گے"۔ ملتان میں بھی شیخ زکریا بہاء الدین ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے احاطہ میں جلسہ ہوا، میں ساتھ تھا تو مجھے بھی تقریر کرنے کا حکم دیا، اور جب میں تقریر ختم کر چکا تو اُس تقریر کی تائید میں بار بار میرا ذکر فرما فرما کر خود بھی تقریر فرمائی۔ اور کافی حوصلہ

بڑھایا۔ اصاغر کی حوصلہ افزائی کی خاص عادۃ تھی۔ جس سے چھوٹے اپنے حوصلہ سے زیادہ کام کر جاتے تھے اور اُن میں ترقی پذیری کی امنگ پیدا ہو جاتی تھی۔

درس و تدریس کے ساتھ ارشاد و تلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ بیعت بھی فرما لیتے تھے اپنے اکابر سے سنا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی طرف سے مجاز بیعت بھی تھے۔ دیوبند کے بھی بعض لوگ بیعت تھے۔ آہ دین دیوبندی جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے دیکھنے والوں میں تھا۔ حضرت ممدوح ہی سے بیعت تھا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد میں نے اور جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی پاکستان مقیم کراچی نے بھی ساتھ ہی ساتھ حضرت ممدوح کیطرف رجوع کیا۔ ہمیں طریق چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین فرمائے اور ہم اُس میں کھلی تاثیر و تصرف محسوس کرتے تھے۔

علم و اخلاق کے ان اونچے مقامات کے ساتھ سیاسیات سے بھی آپ کو لگاؤ تھا اور ملکی معاملات میں شرعی اُصول پر جچی تُلی رائے ظاہر فرماتے تھے۔

جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس پشاور کی صدارت فرمائی۔ خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ جس میں وقت کے تمام مسائل پر بحث فرمائی۔ انگریزوں سے کافی تنفر تھا۔ ایک دفعہ مرض وفات میں ۴۷ء کے انقلاب سے سولہ سترہ سال پہلے عزیزی مولوی حامد الانصاری غازی کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ بھائی ہمیں اب یقین ہو گیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا کیونکہ اُس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عائد کر دیئے ہیں۔ ہوا پر ٹیکس، فضاء پر ٹیکس، پانی پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس، جن چیزوں کو قدرت نے آزاد رکھا تھا اُنپر پابندی عائد کرنا قدرت کا مقابلہ ہے جسکے

بعد زیادہ دیر تک بقاء نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ اب انگریز کے جانیکے دن قریب آگئے ہیں۔ حضرت ممدوح کی ان گوناگوں علمی عملی اور اخلاقی خصوصیات کے سبب خود اُنکے اکابر اُنکی عظمت کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اُستاد ہونیکے باوجود توقیر کے کلمات اُنکے بارہ میں استعمال فرماتے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے کہ جب مولوی انور شاہ میرے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو میرا قلب اُنکی علمی عظمت کا دباؤ محسوس کرتا ہے۔ میری والد ماجد باوجود اُستاد ہونیکے اُنکی انتہائی توقیر فرماتے تھے اور غائبانہ بھی اُنکے لئے کلماتِ تعظیم استعمال فرماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس کی عظمت اُس کے بڑوں کے دلمیں بھی ہو اُس کی عظمت اُسکے چھوٹوں کے دلوں میں کتنی ہوگی؟ —

ایک مقتدر ہستی ایک یگانۂ روزگار ہستی کے فضائل و مناقب ان سطور میں کیا آسکتے ہیں۔ بڑی بڑی تصنیفیں بھی ایسے لوگوں کی سوانح کیلئے کافی نہیں ہوسکتیں۔ اسلئے یہ مضمون تو کیا اُنکی سمائی کرسکتا ہے۔ لیکن اس کی نگارش بطور سوانح کے ہوئی ہی نہیں یہ سطریں صرف بطور تذکرہ کا ملین اپنے دل کی تسلی یا اپنے استاذ زادہ عزیز مولوی سید ازہر شاہ قیصر مدیر ماہنامہ "دارالعلوم" کے ایمار کی تعمیل کیلئے لکھی گئی ہیں۔ ورنہ کجا سوانح خاتم المحدثین اور کجا یہ اجہل الجاہلین؟ بس جہد المقل دموعہ کے طور پر یہ بضاعت مزجاۃ (جو آج بتاریخ ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۷۳ھ کو بعد نماز صبح بیٹھ کر لکھنی شروع کی اور مسلسل لکھتے لکھتے ٹھیک گیارہ بجے دن کے ختم کر دی) بطور ایک ہدیۂ ناچیز عزیز محترم ممدوح کی خدمت میں پیش ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف — والحمد للہ اولاً و آخراً۔

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب قدس سرہ

از حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب
نائب ناظم تعلیمات دار العلوم دیوبند

اعانت مدرسین کی حیثیت میں

حضرات مدرسین کی امداد دو طرح ہو سکتی ہے ایک تو یہ کہ اُن کی مالی خدمت کی جاوے اُن کے اخراجات میں امداد کی جاوے۔ اس صورت میں تو مدرسین کا لفظ کچھ زیادہ ضروری اور مفید نہ ہوا۔ بلکہ امدادِ غربا یا اعانتِ مفالیس بھی کام دے سکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرائضِ تدریس میں اُن کا ہاتھ بٹایا جاوے۔ دماغی محنت سے اُن کو ہلکا کیا جاوے۔ اور یہی معنے اُن دیار میں مروج تھے جہاں اردو کی

ے مولانا اعزاز علی صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ اس موضوع پر بسیط تحریر قلمبند فرمائینگے اور اسکی توقع بھی تھی اسلئے کہ مولانا موصوف کو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے متعلق کافی معلومات ہیں اور حضرت شاہ صاحب کی علمی تحقیقات کا ایک بڑا ذخیرہ انکی یادداشت میں ہے۔ جسے وہ گاہ گاہ اپنے درس اور مجالس میں نقل فرماتے رہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ جسوقت مولانا سے یہ مضمون لکھنے کی فرمائش کیگئی اسوقت مشاغل کا ایسا ہجوم ہوا کہ مولانا دل کھولکر یہ مضمون نہ لکھ سکے۔ مگر ہمیں امید ہے کہ آئندہ کسی موقعہ پر ہم مولانا سے مفصل مضمون حاصل کر سکیں گے ۱۲

عکمرانی تھی۔ مددگار مہتمم، مددگار ناظم، مددگار مدرس وغیرہ وغیرہ ان کا مطلب یہی تھا کہ ان کے فرائض ملازمت میں کوئی شخص ساجھی ہو اور امور متعلقہ میں تخفیف کا باعث ہو

دارالعلوم دیوبند میں معین المدرسین ایک عہدہ جو بہت زیادہ مفید اور مقبول تھا۔ اچھے اچھے ذی استعداد اور سرگرم کار علماء اس میں اپنے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ قدوۃ المہتممین، مدارس اسلامیہ حضرت مولنا حبیب الرحمن صاحب قدس سرہٗ، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کو ذاتی طور پر جانچتے اور پرکھتے تھے۔ اس بارے میں مسموعات اور سفارشوں کا اُن کے یہاں اعتبار زیادہ نہ تھا اور جب کسی طالب علم کی اہلیت اُن کے معیار پر صحیح اُترتی تھی تو وہ اُس پر بلا توسط اپنا منشا ظاہر کرتے تھے کہ تم اگر یہاں رہ کر علمی ترقی کرنا چاہو تو یہ ممکن ہے کہ تم یہاں دو چار سال مختلف قسم کے علوم اور فنون کی کتابیں پڑھا لو۔ تمہارے علم کی پختگی بھی ہوگی۔ یہاں سیکڑوں طلبہ تم سے پڑھیں گے، تمہاری شہرت بھی ہو جاویگی اور پھر کسی بڑے مدرسہ میں فرائض تدریس انجام دے سکو گے۔ مشورہ نہایت صحیح تھا اس لئے عموماً سلیم الطبع طلبہ اس پر راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ بلکہ شکر گذار ہوتے تھے حضرت ممدوح مدرسہ کی سابق مالی امداد کے علاوہ دس پانچ روپے ماہانہ اُنکی تنخواہ مقرر کر دیتے تھے۔ ان کو آرام سے نہ رکھا جاتا تھا بلکہ فی الواقع ہر قسم کے چھوٹی بڑے اسباق مختلف فنون کی کتابیں پڑھانے کے لئے حوالہ کی جاتی تھیں۔ اور یہ لوگ انکو باحسن وجوہ پڑھانے پر مجبور ہوتے تھے۔ کیونکہ نہ صرف پڑھنے والے طلبہ سے خفت اور سبکی زیر خیال ہوتی تھی۔ بلکہ اپنے معاصرین کی شماتت کا بھی اندیشہ ہوتا تھا۔ اور اس لئے بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ اس فرض کو انجام دیتے تھے۔ اور

بسا اوقات اپنے اساتذہ سے مراجعت کرتے اور دشوار مقامات کو حل کرتے تھے۔ اس صورت میں ان کا نفع تو ظاہر ہے کہ سالہا سال کی طلب علم میں نہ اُس قدر محنت کی ہوگی جو اَب کرنی پڑی اور نہ اس قدر علوم حاصلہ و مکتسبہ میں زیادتی ہوگئی ہوگی جو اَب ہوئی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ایسے طلبہ جب کسی مدرسہ میں فرائض و تدریس کی انجام دہی کے لئے من جانب دار العلوم بھیجے جاتے تو وہ ایک لائق اور تجربہ کار مدرس ثابت ہوتے تھے۔ اور مدارس میں ان کی شہرت ہوتی تھی۔ اس وقت بھی ایسے حضرات مدارسِ اسلامیہ کی صدارت اور خدمت، اہتمام وغیرہ انجام دے رہے ہیں اور دار العلوم دیوبند میں معین المدرسی کے مرہون منت ہیں۔ میں اس خوف سے کسی کا نام ظاہر نہیں کرتا ہوں کہ مبادا وہ اس کو اپنی توہین خیال کریں۔ دوسری جانب دار العلوم دیوبند کا یہ نفع تھا کہ تھوڑی تھوڑی تنخواہ میں اُس کو بیک وقت متعدد اصحاب درس حاصل ہوتے تھے اور بوڑھے بوڑھے پُرانے مدرسوں جیسے کام کرتے تھے۔

معین المدرس کے ایک معنی اس کے سوا بھی ہو سکتے تھے جو شاید خیال میں نہ ہوں اُن کو سمجھنے کے لئے حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ کی زبان سے واقعہ سنئے۔ فرماتے تھے کہ گجرات میں ایک مرتبہ معین المدرسین دار العلوم دیوبند کا ذکر آیا تو ایک صاحب نے فرمایا کہ میاں صاحب! یہ لوگ جب اس درجہ کے تھے کہ جہاں حضرات مدرسین و اساتذہ سے کام نہ چلے وہاں یہ کام کریں اور کتاب کے جن جن مقامات کو مدرسین حل نہ کرسکیں اُن کے حل کرنے میں یہ لوگ اُن کی امداد کریں تو یہ حضرات مدرسین سے زیادہ عالم ہوتے ہوں گے معین المدرسین کے یہ معنے کتنے ہی عجیب کیوں نہ ہوں، مگر ان الفاظ میں ان معنی کی گنجائش ہے اور اسی معنے میں میں حضرت علامہ سید محمد انور شاہ

قدس سرہٗ کو معین المدرسین سمجھتا ہوں۔ اور یہ ایک حیثیت ہے کہ شاید دوسرے حضرات کے خیال میں نہ ہو۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی زیارت اوّل مرتبہ میں نے اُسوقت کی جب کہ میں میرٹھ کے مدرسہ قومی میں حضرت مولانا عبدالمومن صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے پڑھتا تھا۔ تاریخ اور سنہ تو یاد نہیں، یہ یاد ہے کہ جمعہ کا دن ہے دورۂ حدیث کی کتاب کا درس تھا کہ کسی نے آکر اثنائے سبق میں کہا کہ مولوی انور شاہ دہلی سے آگئے ہیں اور خندق کی مسجد میں جو کہ غیر مقلدین کا حصن حصین ہے بیٹھے ہوئے قرأۃ فاتحہ خلف الامام پر غیر مقلدین کے مجمع میں تقریر فرما رہے ہیں۔ یہ زمانہ تقلید و عدم تقلید کے مباحث پر جوش کا زمانہ تھا۔ صرف اشتہار بازی پمفلٹ بازی نہ ہوتی۔ بلکہ دست درازی بھی ہوتی تھی اور نوبت جہالت کی انتہا تک بھی پہونچ جاتی تھی حضرت الاستاذ گھبرا گئے اور کہا کہ کیسی بڑی غلطی کی۔ ہم لوگ مقامی ہیں اُن کو اولاً ہم سے مشورہ کرنا تھا، جو کچھ ہم لوگوں کا مشورہ ہوتا اس پر عمل کرنا چاہئے تھا۔ اُن کو کیا خبر کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی دوسری بات ہو تو ہم سب کی ذلت ہو سبق پورا ہونے سے پہلے ختم ہو چکا تھا اور حضرت الاستاذ اس پر برہم تھے کہ خبر آئی کہ حضرت شاہ صاحب چار گھنٹہ تک تقریر فرما کر خاموش ہو گئے اور مولوی حمید اللہ صاحب غیر مقلدین کے راس رئیس جمعہ کی نماز کے بعد جواب دیں گے۔ حضرۃ الاستاذ نے الحمد للہ کہہ کر فرمایا کہ خدا کا شکر ہے اس وقت تو اطمینان ہوا۔ اُس وقت میری عمر زیادہ نہ تھی شاید بیس برس کی عمر بھی نہ ہو۔ میں نے جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ اور اکیلا خندق کی مسجد میں پہونچ گیا زیادہ مجمع نہ تھا دو چار آدمی بیٹھے تھے

مولانا حمید اللہ صاحب بھی تشریف فرما تھے کہ یکایک کسی نے حضرت شاہ صاحب کی آمد کی خبر کی۔ میں مسجد سے باہر نکلا تو حضرت شاہ صاحب "اذا مشئے یتکسفا کانما ینحط من صبب" کی شان سے آتے ہوئے نظر آئے آپ سب کے آگے تھے اور پیچھے کثیر مجمع تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ آپ نے تبسمانہ انداز میں مصافحہ کر کے سلام کا جواب دیا۔ میں بھی ساتھ ساتھ ہو لیا۔

اس مناظرہ کا حال بیان کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ مگر جب اس کا ذکر آہی گیا تو اس کو ناتمام چھوڑنا بھی مناسب نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحب مسجد میں تشریف فرما ہوئے۔ اور مولوی حمید اللہ صاحب مسجد کے حجرے میں رہے جو کہ اُن کا کتب خانہ بھی تھا۔ بار بار بلانے پر تشریف لائے تو حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ لانبی لانبی تقریروں میں فائدہ کم ہو گا۔ اب میں اپنے مطالبہ کو مختصر کر کے کہتا ہوں کہ ایک ایک جملہ پر بحث ہو جاوے آپ سوال کریں میں جواب دوں، اور میں سوال کروں آپ جواب دیں اس سے ان حاضرین کو صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ مولوی حمید اللہ صاحب خود چاہتے تھے کہ کچھ تاخیر ہو۔ فرمایا کہ اچھا میں کتابیں لے آؤں۔ حضرت شاہ صاحب نے منظور فرما لیا۔ حجرے میں گئے خدا جانے کہ کتابیں ملتی نہ تھیں یا فی الحقیقت ڈھونڈھی ہی نہ گئی تھیں کہ یکایک ہیڈ کانسٹبل مع دو کانسٹبلوں کے آ گیا اور اُس نے کہا کہ کوتوال صاحب (اس زمانہ میں دیوبند کے ایک صاحب شیخ احمد نامی اس عہدے پر فائز تھے) نے حکم دیا ہے کہ چونکہ نقضِ امن کا اندیشہ ہے، اس لئے مناظرہ مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے۔ اس کے بعد اُس نے کچھ نام بھی اپنی ڈائری میں شرکائے جلسہ کے لکھے۔ سہ

تھی خبر گرم کہ مجنوں کے اُڑینگے پُرزے ۔ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا
اس کے بعد بھی متعدد مرتبہ میں نے جلسوں وغیرہ میں آپ کی زیارت کی۔
وہ وقت آیا کہ میں بچوں کی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں بلایا گیا۔ اعانتِ مدرسین کا نقشہ اُس روز سے میرے سامنے ہے۔ بریلی، نگینہ، گلاؤٹھی وغیرہ اطراف کے حضرات مدرسین آتے تھے اور کتب درسیہ غیر درسیہ کے مشکل مشکل مواقع حضرت ممدوح سے حل کرتے تھے اور شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ حضرت ممدوح نے کتاب دیکھ کر تقریر کی ہو۔ جو کچھ فرماتے کتاب دیکھے بغیر اور برجستہ فرماتے تھے۔ میں دارالعلوم دیوبند کے مدرسین میں حل مشکلات کا زیادہ محتاج تھا اور اسی لئے مجھ کو حاضری کی نوبت بہت زیادہ آتی تھی۔ آپ کبھی مطالعۂ کتب میں مصروف ہوتے تھے، کبھی آرام فرما ہوتے تھے۔ جس وقت میں پہنچا تھا متوجہ ہو کر بات سُنی اور جواب دیا۔ میں واپس ہو گیا اور آپ اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ چونکہ دن اور رات کے اکثر اوقات میں میرے پاس اسباق تھے۔ اور اسباق کا ناغہ میرے نزدیک بہت بڑا جُرم تھا۔ اس لئے ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ بعد نماز صبح مجھ کو سبق پڑھانا ہے اور مطالعہ کتاب میں کوئی اشکال پیش آیا تو میں نصف شب کے بعد حضرت ممدوح کے حجرے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سخت سردی کا زمانہ تھا تھوڑی دیر کے بعد اندر سے روشنی ہوئی تو معلوم ہوا آپ جاگ رہے ہیں۔ میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ گھبرا کر فوراً کواڑ کھول دیئے اور حیرت سے پوچھا کہ کیا ہے؟ میں نے کتاب سامنے رکھی اور اشکال کا جواب لیا اور واپس ہو گیا۔ اس ساری تگ و دو میں میں نے کبھی چہرے پر کبیدگی کا اثر نہ دیکھا۔ میرا اپنا حال یہ ہے کہ کسی وقت کتاب کا مطالعہ

کرتا ہوں یا کسی اور کتابی کام میں مصروف ہوتا ہوں کوئی دوسرے صاحب آ جاتے ہیں اور ضروری یا غیر ضروری بات شروع کر دیتے ہیں تو چونکہ ذہن میں سارا جمع کردہ مواد ضائع ہو جاتا ہے سخت افسوس ہوتا ہے۔ مگر حضرت ممدوح پر اس کا اثر کبھی نہ دیکھا۔ حضرت مولانا محمد سہول صاحبؒ خود بھی فنِ ہیئۃ کے اچھے ماہر تھے۔ ایک قلمی رسالہ اس فن کا اُن کو ملا۔ حضرت شاہ صاحبؒ سے اُس کو سبقاً سبقاً اُن کے کمرے پر جا کر پڑھا، ساتھ ساتھ میں بھی چلا جاتا تھا۔ حضرت مولانا محمد سہول صاحب نے تھوڑی سی عبارت پڑھ کر کتاب بند کر دی اور حضرت ممدوح نے اُس کے متعلق تقریر شروع کر دی۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ تک تقریر کی سبق ختم ہو گیا۔ حضرت مولانا محمد سہول صاحب اور اُن کے معاصرین بلکہ دار العلوم دیوبند کے مدرسین بھی مدحاً حضرت ممدوح کو کتب خانہ کہا کرتے تھے اور فی الحقیقت یہ لقب غیر موزوں نہ تھا۔ وہ کتابوں کے حوالے زبانی اس طور پر دیتے تھے کہ گویا اُن کے سامنے کتاب کھُلی ہوئی ہے۔

فقہ کی بعض کتابوں پر میں حاشیہ لکھ رہا تھا۔ اُس میں متعدد جگہ "کاکی" کے نام سے عبارت نقل کرنے کی نوبت آئی حاشیہ مکمل ہو چکا، تو فہرست میں یہ ظاہر کرنے کا ارادہ کیا کہ کن کن کتابوں سے عبارتیں لی گئی ہیں اور چند اصحاب کے نام لکھ دیئے مگر یہ معلوم نہ کر سکا کہ "کاکی" کون ہیں اور ان کا نام کیا ہے۔ حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا تو فوراً نام بتا دیا۔ میں نے بغیر کسی مزید تحقیق کے وہی لکھ دیا۔ مختصر یہ ہے کہ حضرت ممدوح کی زندگی میں اشاعتِ علوم کا فیض صرف طلبہ ہی کیساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ آسمانِ علم کے بڑے بڑے درخشاں ستارے بھی اس سے مستفید ہوتے تھے۔ ؎

کیسی کیسی صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں | کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہو گئیں

قادیانی فتنہ

اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، از کراچی،

باز گو از نجد و از یارانِ نجد ۔۔۔ تا در و دیوار را آری بوجد

کز برائے صحبتِ حق سالہا ۔۔۔ باز گو رمزے ازاں خوش حالہا

امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی امتیازی فضیلت ہے کہ پوری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوتی اور امت میں تاقیامت ایک ایسی جماعت قائم رہنے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر دی ہے جو دینِ حق کی اصلی ہیئت پر قائم رہ کر اس کے اندر پیدا ہونے والے رخنوں کی اصلاح کرتی رہے گی۔ اس کو اللہ کی راہ میں نہ کسی کا خوف مانع ہوگا نہ طمع ۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

ان اللہ لیغرس لھذا الدین غرساً ۔۔۔ اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت کیلئے پودے لگاتا رہیگا

یہ ضروری نہیں کہ اس جماعت کے افراد سب کسی ایک ہی جگہ یا کسی ایک بستی یا ایک ملک میں ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ اس جماعت کے افراد کو ہر زمانہ اور ہر خطہ میں پیدا

فرماتے رہتے ہیں۔

ان کی خصوصی علامت یہ ہوتی ہے کہ دین کے فروغ اور اُس میں پیدا شدہ رخنوں کی اصلاح عام مسلمانوں کی خیر خواہی ان کو دین کے صحیح راستہ پر چلانے کا داعیہ ان کے قلوب میں ایسا رچا ہوا ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ان کے حوائج ضروریہ انسانیہ کا درجہ لے لیتا ہے۔ ان مقاصد میں کسی جانب سے خلل آتا ہے تو انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا گھر جل گیا۔ ہم لُٹ گئے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر　　　سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

خدمتِ خلق اور اصلاحِ خلق ان کے لئے طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے — اللہ تعالیٰ کا ہزاروں ہزار شکر ہے کہ اس نے جن بزرگوں کی صحبت کا شرف عطا فرمایا' ان میں کافی تعداد ایسے حضرات کی تھی جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آئے۔ جن کی زندگی کو دیکھنے والا بے تأمل یہ کہہ اٹھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دین کی اور مسلمانوں کی خدمت ہی کے لئے چن لیا ہے۔

انا اخلصناھم بخالصۃ ذکری الدار　　　ہم نے ان کو ایک خاص کام کے لئے مخصوص کر لیا ہے یعنی ذکر و فکر آخرت کے لئے۔

انہی مقدس بزرگوں میں سے میرے استاذِ محترم استاذ الاساتذہ بحر العلوم و الفنون ذہبی زمانہ، رازی وقت حضرت علامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کی ذات گرامی ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس ناکارہ کو آپ کی خدمت و صحبت میں رہنے اور بقدر ظرف استفادہ کرنے کے لئے تقریباً بیس سال کی طویل مدت عطا

فرمائی۔ آپ کے پورے فضائل وکمالات کو تو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو علم کا حظ وافر حاصل ہے۔ یہ ناکارہ اپنی کم ہمتی اور کم حوصلگی کی بناء پر اس درجہ سے محروم رہا۔ ؎

ماندایم مشامے کہ تواں نسبت شنید | ورنہ ہر دم وزد از گلشن وصلت نفحات

مگر اس پر بھی جو کچھ آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا اس کو ضبطِ بیان میں لانا آسان نہیں خصوصًا اس وقت کہ ہجومِ مشاغل وذواہل نے دل ودماغ کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں | بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

مگر صاحب زادۂ محترم ومخدوم بن المخدوم مولوی سید محمد ازہر شاہ صاحب قیصر سلمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ممدوح کے کچھ حالاتِ طیبہ اردو میں[۵] لکھنے کا سلسلہ شروع فرمایا تو احقر سے فرمائش کی کہ قادیانی فتنہ کے استیصال میں حضرت ممدوح کی مساعی جمیلہ سے متعلق میں اپنی معلومات کو ضبط کرکے پیش کروں۔ اول تو مسئلہ خود اہم تھا پھر صاحبزادۂ محترم کی تعمیل حکم بڑی سعادت تھی اس لئے کچھ وقت نکال کر اپنے ناتمام معلومات کا ایک حصہ آپ کی زندگی کے ایک مختصر گوشہ پر اپنی یادداشت کے مطابق پیش کرتا ہوں۔

فتنہ مرزائیت کی شدت اور اسکی بعض اسباب

تقریبًا سنہ ۱۳۴۲ھ کا واقعہ ہے کہ فتنۂ قادیانیت پورے ہندوستان کے اطراف وجوانب میں اور خصوصًا پنجاب میں ایک طوفانی صورت سے اٹھا۔ اس کا سبب خواہ یہ ہو کہ سنہ ۱۹۱۹ء کی جنگِ عظیم میں قادیانی مسیح کی امت نے مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں (انگریزوں) کو کافی مدد بہم پہنچائی جس کا اعتراف خود قادیانیوں

[۵] عربی میں اس سے پہلے آپ کا تذکرہ بنام نفحۃ العنبر شائع ہو چکا ہے ۱۲ محمد شفیع۔

نے اپنے اخبارات میں کیا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب بغداد سات سو سال کے بعد مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر انگریزوں کے تسلط میں داخل ہوا تو جہاں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری امت ان کے رنج وغم میں مبتلا تھی وہیں قادیانی مرزا کی امت قادیان میں چراغاں کر رہی تھی (الفضل قادیان)۔

اس جنگِ عظیم میں امداد دینے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں انگریزوں کو کامیاب بنانے کے صلہ میں انگریزوں کی حمایت (بقول مرزا صاحب) اپنے اس خود کاشتہ پودے کو زیادہ حاصل ہوگئی۔ اور اس کا یہ حوصلہ ہوگیا کہ وہ کھل کر مسلمانوں کے مقابلہ میں آجائے اور ممکن ہے کہ کچھ اور بھی اسباب ہوں۔

یہ زمانہ دارالعلوم دیوبند میں میرے درس وتدریس کا ابتدائی دور تھا۔ اور میں اس بسم اللہ کے گنبد میں اپنی کتاب اور سبق پڑھانے کے سوا کچھ نہ جانتا تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

لیکن ہمارے بزرگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے فروغ اور اسلام کی خدمت ہی کے لئے پیدا فرمایا تھا قادیانیت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان سے سخت تشویش و اضطراب محسوس فرمارہے تھے اور تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ اس کے مقابلے کی فکر کر رہے تھے۔ بالخصوص حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ پر اس فتنہ کا بہت اثر تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلے کے لئے ان کو چن لیا ہے۔ جیسا ہر زمانہ میں عادۃ اللہ یہی ہے کہ ہر فتنہ کے مقابلہ کے لئے اس وقت کے علماء دین سے کسی کو منتخب کر لیا گیا اور اس کے قلب میں اس کی اہمیت ڈالدی گئی۔ فتنہ قادیانیت کے استیصال میں حضرت ممدوح کی شبانہ روز جدوجہد اور فکر و عمل سے

ہر دیکھنے والے کو یقین ہو جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے لئے آپکو چن لیا ہے

مصر و عراق وغیرہ ممالکِ اسلامیہ میں فتنۂ قادیانیت کا انسداد

میں حسب عادت ایک روز استاذِ محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انکی دائمی عادت کے خلاف یہ دیکھا کہ ان کے سامنے کوئی کتاب زیر مطالعہ نہیں خالی بیٹھے ہوئے ہیں اور چہرے پر فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کیسا مزاج ہے؟ فرمایا کہ بھائی مزاج کو کیا پوچھتے ہو' قادیانیت کا ارتداد اور کفر کا سیلاب اُمنڈتا چلا آتا ہے۔ صرف ہندوستان میں نہیں عراق و بغداد میں ان کا فتنہ سخت ہوتا جاتا ہے اور ہمارے علماء و عوام کو اس طرف توجہ نہیں۔ ہم نے اس کے مقابلہ کے لئے جمعیتہ علماء ہند میں یہ تجویز پاس کرائی تھی کہ دس رسالے مختلف موضوعات متعلقہ قادیانیت پر عربی زبان میں لکھے جائیں اور ان کو طبع کرا کر ان بلادِ اسلامیہ میں بھیجا جائے مگر اب کوئی کام کرنے والا نہیں ملتا۔ اس کام کی اہمیت لوگوں کی خیال میں نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اپنی استعداد پر تو بھروسہ نہیں۔ لیکن حکم ہو تو کچھ لکھ کر پیش کروں۔ ملاحظہ کے بعد کچھ مفید معلوم ہو تو شائع کیا جائے ورنہ بے کار ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

ارشاد ہوا کہ مسئلہ ختم نبوت پر لکھو۔ احقر نے استاذِ محترم کی تعمیل ارشاد کو سرمایہ سعادت سمجھ کر چند روز میں تقریباً ایک سو صفحات کا ایک رسالہ عربی زبان میں لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت ممدوح رسالہ دیکھتے جاتے تھے اور بار بار دعائیہ کلمات زبان پر تھے۔ مجھے کوئی تصور نہ تھا کہ اس ناچیز خدمت کی اتنی قدر

افزائی کی جائے گی پھر خود ہی حضرت ممدوح نے اس رسالہ کا نام "ھدایۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیین" تجویز فرما کر اس کے آخر میں ایک صفحہ بطور تقریظ تحریر فرمایا۔ اور اپنے اہتمام سے اس کو طبع کرایا مصر، شام، عراق، مختلف مقامات پر اس کی نسخے روانہ کئے۔

خاص قادیان میں پہونچ کر اعلانِ حق اور ردِّ مرزائیت

اسی زمانہ میں حضرت ممدوح کے ایماء پر امرتسر و پٹیالہ و لدھیانہ کے چند علماء نے یہ تجویز کیا کہ اس فتنہ کے استیصال کے لئے خاص قادیان میں ایک تبلیغی جلسہ سالانہ منعقد کیا جائے تاکہ قضیۂ زمین برسرِ زمین طے ہو سکے۔ یہ عوام کو فریب میں ڈالنے والے مناظرے اور مباہلے کے چیلنج جو اکثر اس فرقہ کی طرف سے چھپتے رہتے ہیں ان کی حقیقت لوگوں پر واضح ہو جائے۔ چنانچہ چند سال مسلسل یہ جلسے قادیان میں ہوتے تھے اور حضرت ممدوح اکثر بذاتِ خود ایک جماعت علماءِ دیوبند کے ساتھ اس میں شرکت فرماتے تھے۔ احقر ناکارہ بھی اکثر ان میں حاضر رہا ہے۔

قادیانی گروہ نے اپنے آقاؤں (انگریزوں) کے ذریعہ ہر طرح اس کی کوشش کی کہ یہ جلسے قادیان میں نہ ہو سکیں لیکن کوئی قانونی وجہ نہ تھی جس سے جلسے روک دیئے جاویں کیونکہ ان جلسوں میں عالمانہ بیانات تہذیب و متانت کیساتھ ہوتے اور کسی نقضِ امن کے خطرہ کو موقع نہ دیتے تھے۔ جب قادیانی گروہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو خود تشدّد پر اُتر آیا۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ اور ان کے رفقاء کو قادیان جانے سے پہلے اکثر ایسے خطوط گمنام ملا کرتے تھے کہ اگر قادیان میں قدم

رکھا تو زندہ واپس نہ جاسکو گے۔ اور یہ صرف دھمکی ہی نہ تھی۔ بلکہ عملاً بھی اکثر اس قسم کی حرکتیں ہوتی تھیں کہ باہر سے جانے والے علماء و مسلمانوں پر حملے کئے جاتے تھے ایک مرتبہ آگ بھی لگائی گئی۔

لیکن حق کا چراغ کبھی پھونکوں سے بجھایا نہیں گیا اس وقت بھی ان کی اخلاق سوز حملے مسلمانوں کو ان جلسوں سے نہ روک سکے۔

تردید مرزائیت میں تصانیف کا سلسلہ

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم چند خدام جلسۂ قادیان میں حضرت ممدوح کے ساتھ حاضر تھے۔ صبح کی نماز کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اپنے مخصوص تلامذہ حاضرین کو خطاب کرکے فرمایا کہ زمانہ کو الحاد کے فتنوں نے گھیر لیا اور قادیانی دجّال کا فتنہ ان سب میں زیادہ شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اب ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی عمر و توانائی کا بڑا حصہ اور درس حدیث کا اہم موضوع حنفیت و شافعیت کو بنائے رکھا۔ ملحدین زمانہ کے وساوس کی طرف توجہ نہ دی۔ حالانکہ انکا فتنہ مسئلہ حنفیت و شافعیت سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ اب قادیانی فتنہ کی شدت نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا تو میں نے اس کے متعلقہ مسائل کا کچھ مواد جمع کیا ہے اگر اس کو میں خود تصنیف کی صورت سے مدون کروں تو میرا طرز ایک خالص علمی اصطلاحی رنگ کا ہے اور زمانہ قحط الرجال کا ہے اس قسم کی تحریر کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا فائدہ بھی بہت محدود رہ جاتا ہے۔ میں نے مسئلہ قرأۃ فاتحہ خلف الامام پر ایک جامع رسالہ "فصل الخطاب" بزبان عربی تحریر کیا۔ اہل علم اور طلباء میں عموماً مفت تقسیم کیا لیکن اکثر لوگوں کو یہی شکایت کرتے سنا کہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے اگر

آپ لوگ کچھ ہمت کریں تو یہ مواد میں آپ کو دیدوں۔ اس وقت حاضرین میں چار آدمی تھے۔ احقر ناکارہ اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم شعبہ تعلیم و تبلیغ دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا بدر عالم صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت و دارالعلوم ٹنڈو الہیار سندھ و حال مہاجر مدینہ طیبہ اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و شیخ الجامعہ بہاولپور و حال شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور ادام اللہ تعالیٰ فیوضہم۔ ہم چاروں نے عرض کیا کہ جو حکم ہو ہم امتثالِ امر کو سعادت کبریٰ سمجھتے ہیں۔

اسی وقت فرمایا کہ اس فتنہ کے استیصال کے لئے علمی طور پر تین کام کرنے ہیں۔ اول مسئلہ ختم نبوت پر ایک محققانہ مکمل تصنیف جس میں مرزائیوں کے شبہات واوہام کا ازالہ بھی ہو۔

دوسرے حیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ کی مکمل تحقیق قرآن و حدیث اور آثار سلف سے مع ازالہ شبہات ملحدین۔

تیسرے خود مرزا کی زندگی، اس کے گرے ہوئے اخلاق اور متعارض و متہافت اقوال اور انبیاء و اولیاء و علماء کی شان میں اس کی گستاخیاں اور گندی گالیاں، اس کا دعویٰ نبوت و وحی اور متضاد قسم کے دعوے۔ ان سب چیزوں کو نہایت احتیاط کیساتھ اس کی کتابوں سے مع حوالہ جمع کرنا جس سے مسلمانوں کو اس فرقہ کی حقیقت معلوم ہو۔ اور اصل یہ ہے کہ اس فتنہ کی مدافعت کے لئے یہی چیز اہم اور کافی ہے۔ مگر چونکہ مرزائیوں نے مسلمانوں کو فریب میں ڈالنے کے لئے خواہ مخواہ کچھ علمی مسائل میں عوام کو الجھا دیا ہے اسلئے ان سے بھی اغماض نہیں کیا جا سکتا۔ پھر فرمایا کہ مسئلہ ختم نبوت کے متعلق تو یہ صاحب

راحقر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا) ایک جامع رسالہ عربی زبان میں لکھ چکے ہیں اور اردو میں لکھ رہے ہیں اور آخر الذکر معاملہ کے متعلق مواد فراہم کرکے مدون کرنے کا سب سے بہتر کام حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کرسکیں گے کہ اس معاملہ میں ان کی معلومات بھی کافی ہیں اور مرزائی کتابوں کا پورا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہے وہ اس کام کو اپنے ذمہ لے کر جلد سے جلد پورا کریں۔

اب مسئلہ رفع و حیات عیسیٰ علیہ السلام رہجاتا ہے اس کے متعلق میرے پاس کافی مواد جمع ہے۔ آپ تینوں صاحب دیوبند پہونچکر مجھ سے لے لیں اور اپنے اپنے طرز پر لکھیں۔

یہ مجلس ختم ہوگئی مگر حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے قلبی تأثرات اپنا ایک گہرا نقش ہمارے دلوں پر چھوڑ گئے۔ دیوبند واپس آتے ہی ہم تینوں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسئلہ حیات عیسیٰ سے متعلقہ مواد حاصل کیا۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب دامت برکاتہم نے آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کی تفسیر سے متعلقہ مواد لے کر اس پر ایک مستقل رسالہ اردو میں بنام الجواب الفصیح لمنکر حیات المسیح تحریر فرمایا جو علمی رنگ میں لاجواب سمجھا گیا اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے پسند فرماکر اس پر تقریظ تحریر فرمائی۔ یہ رسالہ ۱۳۴۲ھ میں شعبۂ تبلیغ دار العلوم دیوبند سے شائع ہوا۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب دامت فیوضہم نے اپنے مخصوص انداز میں اسی مسئلہ پر اردو زبان میں ایک جامع اور محققانہ رسالہ بنام کلمۃ السر فی حیوۃ روح السر تصنیف فرماکر حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت ممدوح نے بے حد پسند فرماکر تقریظ تحریر فرمائی اور ۱۳۴۲ھ میں دار العلوم دیوبند سے شائع ہوکر

مقبول و مفید خلائق ہوا۔

احقر ناکارہ کے متعلق یہ خدمت کی گئی کہ جتنی مستند و معتبر روایات حدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات یا نزول فی آخر الزمان کے متعلق وارد ہوئی ہیں ان سب کو ایک رسالہ میں جمع کر دے۔ احقر نے تعمیل حکم کے لئے رسالہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح بزبان عربی لکھا اور حضرت ممدوح کی بے حد پسندیدگی کے بعد اسی سال شائع ہوا۔

اس کے بعد حسب ارشاد ممدوح مسئلہ ختم نبوت پر ایک مستقل کتاب اردو زبان میں تین حصوں میں لکھی:۔

پہلا حصہ ختم النبوۃ فی القرآن جس میں ایک سو آیات قرآنی سے اس مسئلہ کا مکمل ثبوت اور ملحدوں کے شبہات کا جواب لکھا گیا ہے۔

دوسرا ختم النبوۃ فی الحدیث جس میں دو سو دس احادیث معتبرہ سے اس مضمون کا ثبوت اور منکرین کا جواب پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا ختم النبوۃ فی الآثار جس میں سیکڑوں اقوال صحابہ و تابعین اور ائمہ دین اس کے ثبوت اور منکرین اور ان کی تاویلات باطلہ پر رد کے متعلق نہایت صاف و صریح نقل کئے گئے ہیں یہ تینوں رسالے پہلی مرتبہ ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۵ھ تک شائع ہوئے۔ اسی کے ساتھ مختصر رسالہ دعاوی مرزا اور مسیح موعود کی پہچان اردو زبان میں احقر نے لکھ کر پیش کئے۔ ان رسائل کا جو کچھ نفع مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت اور ملحدین منکرین پر اتمام حجت کے سلسلہ میں ہوا یا ہوگا اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے مجھے تو اپنی محنت کا نقد صلہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی مسرت و خوشنودی اور

بے شمار دعاؤں سے اسی وقت مل گیا اور جوں جوں ان رسائل کی اشاعت سے مسلمانوں کی ہدایت بلکہ بہت سے قادیانی خاندانوں کی توبہ و رجوع الی الاسلام کے متعلق حضرت کو معلوم ہوئے اسی طرح اظہار مسرت اور دعا کے انعامات ملتے رہے

مخدومنا حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو عمر اور طبقہ کے اعتبار سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ سے مقدم تھے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے محیر العقول علم کے بے حد معتقد اور آپ کے ساتھ معاملہ بزرگوں کا سا کرتے تھے جو خدمت اس سلسلہ کی ان کے سپرد فرمائی تھی اس کو آپ نے بڑی سعی بلیغ کے ساتھ انجام دینا شروع کیا اور مرزا قادیانی کی پوری زندگی، اس کے اخلاق و اعمال اور عقائد و خیالات، دعوائے نبوت و رسالت اور تکفیرِ عام اہل اسلام، گستاخی درشان انبیاء و اولیا کو مرزا کی اپنی کتابوں سے بحوالہ صفحہ سطر نہایت انصاف اور احتیاط کے ساتھ نقل کرکے بہت سے رسائل تصنیف فرمائے اور حضرت شاہ قدس اللہ سرہٗ کے سامنے پیش فرما کر ان کی مراد پوری فرمائی۔ ان رسائل میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:۔

قادیان میں قیامت خیز بھونچال۔ اشد العذاب علی مسیلمۃ البنجاب۔ فتح قادیان مرزائیوں کی تمام جماعتوں کو چیلنج۔ مرزائیت کا خاتمہ۔ مرزائیت کا جنازہ بے گور و کفن۔ ہندوستان کے تمام مرزائیوں کو چیلنج۔ مرزا اور مرزائیوں کو در بابِ نبوت سے چیلنج۔ یہ سب رسائل ۱۳۴۲ھ سے ۱۳۴۴ھ تک شائع ہوئے۔

فیروز پور پنجاب میں تاریخی مناظرہ

اسی زمانہ میں چھاونی فیروز پور پنجاب میں قادیانیوں کا ایک خاصا اچھا جمع

ہوگیا تھا۔ یہ لوگ وہاں کے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے اور اپنے دستور کے موافق عوام مسلمانوں کو مناظرہ مباحثہ کا یہ چیلنج کیا کرتے اور جب کسی عالم سے مقابلہ کی نوبت آتی تو راہِ گریز اختیار کرتے۔ اسی زمانہ میں ضلع سہارنپور کے رہنے والے کچھ مسلمان جو فیروز پور میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے ان لوگوں نے روز روز کی جھک جھک کو ختم کرنے کے لئے خود قادیانیوں کو دعوتِ مناظرہ دیدی۔

قادیانیوں نے سادہ لوح عوام سے معاملہ دیکھ کر بڑی دلیری اور چالاکی کے ساتھ دعوتِ مناظرہ قبول کر کے بجائے اس کے کہ مناظرہ کرنے والے علماء سے شرائطِ مناظرہ طے کرتے انھیں عوام سے ایسی شرائطِ مناظرہ پر دستخط لے لئے جن کی رو سے فتح بہر حال قادیانی گروہ کی ہو۔ اور اہلِ اسلام کو مقررہ شرائط کی پابندی کی وجہ سے ہر قدم پر مشکلات درپیش ہوں۔

ان عوام مسلمین نے مناظرہ اور شرائطِ مناظرہ طے کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند سے چند علماء کو دعوت دی جو قادیانیوں سے مناظرہ کریں۔

مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے اس کام کے لئے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ۔ حضرت مولانا بدر عالم صاحب حضرت مولانا محمد ادریس صاحب اور احقر تجویز ہوئے۔ ادھر قادیانیوں نے یہ دیکھ کر کہ ہم نے اپنی من مانی شرائط میں مسلم مناظرین کو جکڑ لیا ہے اپنی قوت محسوس کی اور قادیان کی پوری طاقت فیروز پور میں لا ڈالی۔ ان کے سب سے بڑے عالم اس وقت سرورشاہ کشمیری اور سب سے بڑے مناظر حافظ روشن علی اور عبدالرحمٰن مصری وغیرہ تھے یہ سب اس مناظرہ کے لئے

فیروز پور پہونچ گئے۔

ہم چار افراد حسب الحکم دیوبند سے فیروز پور پہونچے تو یہاں پہونچ کر چھپا ہوا پروگرام مناظرہ اور شرائط مناظرہ کا نظر سے گذرا۔ شرائط مناظرہ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ان میں ہر حیثیت سے قادیانی گروہ کے لئے آسانیاں اور اہل اسلام کے لئے ہر طرح کی بیجا پابندیاں عوام نے اپنی ناواقفیت کی بناء پر تسلیم کی ہوئی ہیں۔ اب ہمارے لئے دو ہی راستے تھے کہ یا ان مسلمہ فریقین شرائط مناظرہ کے ماتحت مناظرہ کریں جو ہر حیثیت سے ہمارے لئے مضر تھیں یا پھر مناظرہ سے انکار کردیں کہ ہم ان شرائط کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے جو بغیر ہماری شرکت کے طے کرلی گئی ہیں۔ لیکن دوسری شق پر مقامی مسلمانوں کی بڑی خفت اور سبکی تھی اور قادیانیوں کو اس پروپیگنڈے کا موقع ملتا کہ علماء نے مناظرہ سے فرار کیا اس لئے ہم سب نے مشورہ کرکے مناظرہ کرنے کا توفیصلہ کرلیا اور بذریعہ تار صورت حال کی اطلاع حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو دے دی۔

اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہوگیا۔ ابھی شروع ہی تھا عین مجلس مناظرہ میں نظر پڑی کہ حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما مع چند دیگر علماء کے تشریف لائے ہیں۔ ان کی آمد پر ہم نے کچھ دیر کے لئے مجلس مناظرہ ملتوی کی اور ان حضرات کو صورتِ حال بتلائی۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا کہ جائیے ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم نے جتنی شرطیں اپنی پسند کے موافق عوام سے طے کرالی ہیں اتنی ہی اور لگالو ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں۔ تم چوروں کی طرح عام ناواقف مسلمانوں کے دین وایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے

عادی ہو۔ کسی شرط اور کسی طریق پر ایک مرتبہ سامنے آکر اپنے دلائل بیان کرو اور ہمارا جواب سنو پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے موافق اسی کا اعلان کر دیا گیا۔ اور مناظرہ جاری ہوا۔ ان اکابر کو مناظرہ کے لئے پیش کرنا ہماری غیرت کے خلاف تھا۔ اس لئے پہلے دن مناظرہ مسئلہ ختم نبوت پر احقر نے کیا۔ دوسرے تیسرے دن حضرت مولانا بدر عالم اور مولانا محمد ادریس صاحب نے دوسرے مسائل پر مناظرہ کیا۔

یوں تو مناظرہ کے بعد ہر فریق اپنی اپنی کہا ہی کرتا ہے۔ لیکن اس مناظرہ میں چونکہ عموماً تعلیم یافتہ طبقہ شریک تھا اس لئے کسی فریق کو دھاندلی کا موقع نہ تھا۔ پھر اس مناظرہ کا کیا اثر ہوا۔ اس کا جواب فیروز پور کے ہر گلی کوچہ سے دریافت کیا جا سکتا تھا کہ قادیانی گروہ کو کس قدر رسوا ہو کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ خود اس گروہ کے تعلیم یافتہ و سنجیدہ طبقہ نے اس کا اقرار کیا کہ قادیانی گروہ اپنے کسی دعوے کو ثابت نہیں کر سکا اور اس کے خلاف دوسرے فریق نے جو بات کہی قوی دلیل کے ساتھ کہی۔

مناظرہ کے بعد شہر میں ایک جلسۂ عام ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما کی تقریریں قادیانی مسئلہ کے متعلق ہوئیں۔ یہ تقریریں فیروز پور کی تاریخ میں ایک یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ جو قادیانی دجل کے شکار ہو چکے تھے اس مناظرہ اور تقریروں کے بعد اسلام پر لوٹ آئے۔

حضرت شاہ صاحب کا دورۂ پنجاب

۱۳۴۳ھ میں جب کہ حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کی کوشش سے بذریعہ تصنیف وتحریر قادیانی دجل وفریب کا پردہ پوری طرح چاک کردیا گیا اور قادیانیت سے متعلق ہر مسئلہ پر مختلف طرز وانداز کے بیسیوں رسائل شائع ہو چکے تو آپ نے اس کی بھی ضرورت محسوس فرمائی کہ ناخواندہ عوام کا طبقہ جو زیادہ کتابیں نہیں پڑھتا اور قادیانی مبلغین چل پھر کر ان میں اپنا دجل پھیلاتے ہیں اور مناظرہ مباہلہ کے جھوٹے چیلنج ان کو دکھاتے پھرتے ہیں ان لوگوں کی حفاظت کے لئے پنجاب کے مختلف شہروں کا ایک تبلیغی دورہ کیا جائے۔

پنجاب وسرحد کے دورہ کا پروگرام بنا۔ علماء دیوبند کی ایک جماعت ہمرکاب ہوئی۔ اس جماعت میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اکابرین سے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ شریک تھے۔ اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا بدر عالم صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب اور مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی اور احقر ناکارہ شامل تھے۔ یہ علم کے پہاڑ اور تقوے کے پیکر پنجاب کے ہر بڑے شہر میں پہونچے اور مرزائیت کے متعلق اعلان حق کیا منکرین کو رفع شبہات کی دعوت دی۔ لدھیانہ، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، گجرات راولپنڈی، ایبٹ آباد، مانسہرہ ہزارہ کھوٹہ وغیرہ میں ان حضرات کی بصیرت افروز عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ مرزائی دجال جو آئے دن مناظرہ ومباہلہ کے چیلنج عوام کو دکھانے کے لئے لئے پھرا کرتے تھے ان میں سے ایک سامنے نہ آیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جہان

میں نہیں ہیں۔

اس پورے سفر میں عام مسلمانوں نے جاء الحق وزہق الباطل کا منظر گویا آنکھوں سے دیکھ لیا۔

بہاولپور کا معرکۃ الآراء تاریخی مقدمہ | **حضرت شاہ صاحب اور دیگر اکابر علماء کے بیانات، مرزائیوں کی مرتد ہونے کا فیصلہ:۔** ۱۹۲۶ء میں احمد پور شرقیہ ریاست بہاولپور کی ایک مسلمان عورت کا دعویٰ اپنے شوہر کے مرزائی ہو جانے کی وجہ سے نکاح فسخ ہونے کے متعلق بہاولپور کی عدالت میں دائر ہوا۔ اور سات سال تک یہ مقدمہ بہاولپور کی ادنے اعلیٰ عدالتوں میں دائر رہتے ہوئے آخر میں دربار معلی بہاولپور میں پہنچا ۱۹۳۲ء میں دربار معلے نے پھر عدالت میں یہ لکھ کر واپس کیا کہ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق وتنقیح کرنا ضروری ہے۔ دونوں فریق کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے علماء کی شہادتیں پیش کریں اور دونوں طرف کے مکمل بیانات سننے کے بعد اس مسئلہ کا کوئی آخری فیصلہ کیا جائے۔

اب مدعیٰ علیہ مرزائی نے اپنی حمایت کے لئے قادیان کی طرف رجوع کیا۔ قادیان کا بیت المال اور اس کے رجال کار مقدمہ کی پیروی کے لئے وقف ہو گئے۔ اِدھر مدعیہ بیچاری ایک غریب گھرانے کی لڑکی نہایت کس مپرسی میں وقت گذار رہی تھی۔ اس کی قدرت سے قطعاً خارج تھا کہ ملک کے مشاہیر علماء کو جمع کر کے اپنی شہادت میں پیش کر سکے یا اس مقدمہ کی پیروی کر سکے۔ مگر الحمد للہ بہاولپور کے غیور مسلمانوں کی انجمن مؤید الاسلام نے زیر سرپرستی حضرت مولانا محمد حسین صاحب شیخ الجامعہ بہاولپور

اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مقدمہ کی پیروی کا انتظام کیا۔ اور ملک کے مشاہیر علماء کو خطوط لکھ کر اس مقدمہ کی پیروی اور شہادت کے لئے طلب کیا۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں صدر مدرسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور کچھ عرصہ سے علالت کے سبب رخصت پر دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے۔ طولِ علالت سے نقاہت بے حد ہو چکی تھی۔

لیکن جس وقت یہ معاملہ آپ کے سامنے آیا تو مسئلہ کی نزاکت اور اہمیت کے قوی احساس نے آپ کو اس کے لئے مجبور کر دیا کہ اپنی صحت اور دوسری ضرورتوں کا خیال کئے بغیر وہ بہاول پور کا سفر کریں۔

آپ نے نہ صرف اپنے آپ کو شہادت کے لئے پیش فرمایا۔ بلکہ ملک کے دوسرے علماء کو بھی ترغیب دے کر شہادت کے لئے جمع فرمایا۔

یہ واقعہ تقریباً ۱۳۵۰ھ کا ہے جب کہ احقر ناکارہ بحیثیت مفتی دار العلوم دیوبند فتوے نویسی کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

انجمن مؤید الاسلام بہاولپور کی دعوت کے علاوہ استاذِ محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا ایماء بھی میری حاضری کے متعلق معلوم ہوا۔ احقر نے حاضری کا قصد کر لیا۔

لیکن حضرت الاستاذ شاہ صاحب قدس سرہٗ کو جو خداداد شغف دینی ضرورتوں کے ساتھ تھا اور آپ کو بے چین کئے رکھتا تھا اس کی وجہ سے آپ نے تاریخ مقدمہ سے کافی روز پہلے بہاول پور پہنچکر اس کام کو پوری توجہ کے ساتھ انجام دینے کا فیصلہ فرما کر سب بیانات کے اختتام تک تقریباً بیس پچیس روز بہاولپور میں قیام فرمایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا پُرشوکت عالمانہ بیان جو کمرۂ عدالت میں ہوا اسکی اصل کیفیت تو صرف انہی لوگوں کے دل سے پوچھئے جنہوں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ اسکو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اس وقت کمرۂ عدالت دارالعلوم دیوبند کا دارالحدیث نظر آتا تھا۔ عدالت اور حاضرین پر ایک سکتہ کا عالم تھا۔ علوم ربانی کے حقائق و معارف کا دریا تھا جو اُمڈا چلا جاتا تھا۔

تین روز مسلسل بیان ہوا۔ تقریبًا ساٹھ صفحات پر قلم بند ہوا۔ یہ بیان اور دوسرے حضرات کے بیانات جو ایک مستقل جلد میں طبع ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ردِّ مرزائیت کے لئے بلکہ اسلام و ایمان اور کفر و ارتداد کی پوری حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک نادر مجموعہ ہیں۔

اس مقدمہ میں کیا ہوا؟ اس کی پوری تفصیل تو اس مفصّل فیصلہ سے معلوم ہو سکتی ہے جو عدالت کی طرف سے ۷ر فروری ۱۹۳۵ء مطابق ۳ر ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ کو دیا گیا۔ اور جو اسی وقت بزبان اردو ایک سو باون (۱۵۲) صفحات پر شائع ہو چکا تھا۔ اس کی اشاعت کا اہتمام حضرت مولانا محمد صادق صاحب استاد جامعہ عباسیہ بہاولپور و حال ناظم امور مذہبیہ بہاولپور کے دست مبارک سے ہوا۔ اس مقدمہ کی پیروی علماء کے اجتماع ان کی ضروریات کا انتظام بھی مولانا موصوف ہی کے ہاتھوں انجام پایا تھا اور مولانا سے میرا پہلا تعلق اسی سلسلہ میں پیدا ہوا۔ آپ نے اس فیصلہ کے شروع ایک مختصر تمہید لکھی ہے۔ اس کے چند جملے نقل کر دینے سے کسی قدر حقیقت پر روشنی پڑ سکتی ہے وہ یہ ہیں:۔

"مدعیہ کی طرف سے شہادت کے لئے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ

صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، حضرت مولانا محمد نجم الدین صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور و مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند پیش ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری نے تمام ہندوستان کی توجہ کے لئے جذب مقناطیسی کا کام کیا۔ اسلامی ہند میں اس مقدمہ کو غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی۔ حضرات علمائے کرام نے اپنی اپنی شہادتوں میں علم و عرفان کے دریا بہا دیئے اور فرقۂ ضالہ مرزائیہ کا کفر و ارتداد روز روشن کی طرح ظاہر کر دیا اور فریق مخالف کی جرح کے نہایت مسکت جواب دیئے۔ خصوصاً حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان، کفر، نفاق، زندقہ، ارتداد، ختم نبوت، اجماع، تواتر، متواترت کے اقسام، وحی، کشف اور الہام کی تعریفات اور ایسے اصول و قواعد بیان فرمائے جن کے مطالعہ سے ہر ایک انسان علیٰ وجہ البصیرت بطلان مرزائیت کا یقین کامل حاصل کر سکتا ہے۔ پھر فریق ثانی کی شہادت شروع ہوئی، مقدمہ کی پیروکاری اور شہادت پر جرح کرنے اور قادیانی دجل و تزویر کو آشکارا کرنے کے لئے شہرۂ آفاق مناظر، حضرت مولانا ابوالوفا صاحب نعمانی شاہجہانپوری تشریف لائے۔ مولانا موصوف مختار مدعیہ ہو کر تقریباً ڈیڑھ سال مقدمہ کی پیروکاری فرماتے رہے۔ فریق ثانی کی شہادت پر ایسی باطل شکن جرح فرمائی جس نے مرزائیت کی بنیادوں کو کھوکھلا اور مرزائی دجل و فریب کے تمام پردوں کو پارہ پارہ کر کے فرقہ مرزائیہ ضالہ کا ارتداد آشکار عالم کر دیا۔ فریقین کی شہادت ختم ہونے کے بعد مولانا موصوف نے مقدمہ پر بحث پیش کی اور فریق ثانی کی تحریری بحث کا تحریری جواب الجواب نہایت مفصل اور جامع پیش کیا۔ کامل دو سال کی تحقیق و

تنقیح کے بعد عالی جناب ڈسٹرکٹ جج صاحب بہادر نے اس تاریخی مقدمہ کا بصیرت افروز فیصلہ ۷ رفروری ۱۹۳۵ء بحق مدعیہ سنایا۔ یہ فیصلہ اپنی جامعیت اور قوتِ استدلال کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر و بے عدیل ہے مسلمانانِ ہند کی بہرہ اندوزی کی خاطر اس فیصلہ کو ایک کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ مواد مقدمہ کی تیسری جلد ہے اس سے پہلے دو جلدیں اور ہوں گی۔

جلد اوّل میں حضرات علمائے کرام کی مکمل شہادتیں اور جلد ثانی میں حضرت مولانا ابوالوفا صاحب شاہ جہانپوری کی بحث اور جواب الجواب شائع کیا جائے گا۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ دونوں جلدیں کب شائع ہوں گی۔ اس کا جواب مسلمانانِ ہند کی ہمت افزائی پر موقوف ہے۔ یہ تیسری جلد جتنی جلدی فروخت ہو گی اسی انداز سے پہلی دو جلدوں کی اشاعت میں آسانی ہو گی۔ حضرات علمائے کرام کے بیانات اور بحث اور جواب الجواب تردید مرزائیت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ تینوں جلدیں شائع ہو گئیں تو تردیدِ مرزائیت میں کسی دوسری تصنیف کی قطعاً حاجت نہ رہے گی۔"

اس مقدمہ میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے حکم کی بناء پر پہلا بیان اس احقر کا ہوا۔ تین روز بیان اور ایک دو روز جرح ہو کر تقریباً ساٹھ صفحات پر بیان مرتب ہوا۔

پہلا پہلا بیان تھا۔ ابھی لوگوں نے اکابر کے بیان سنے نہ تھے۔ سب نے بیحد پسند کیا۔ مجھے یاد ہے کہ دورانِ بیان میں بھی اور مکان پر آنے کے بعد بھی حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ساتھ اپنی مسرت کا اظہار

فرماتے تھے۔ اور اس ناکارہ و آوارہ کے پاس دین و دنیا کا صرف یہی سرمایہ ہے کہ اللہ والوں کی رضا، رضائے حق کی علامت ہے۔ واللہ تعالیٰ امثال ان یلحقنی بالصالحین۔

فتنۂ مرزائیت پر حضرت شاہ صاحبؒ کی اپنی تصانیف

مرزائیت کے متعلق تمام ضروری مسائل پر کافی سے زائد رسائل وکتب حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے ارشاد وایماء کی بناء پر لکھے جا چکے تھے۔ لیکن ایک مسئلہ ہنوز تشنہ باقی تھا کہ مرزائیوں کے نماز روزہ اور تلاوتِ قرآن اور کلمۂ اسلام پڑھنے سے عام مسلمانوں اور خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کو سخت اشتباہ تھا کہ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے ان کو اسلام سے خارج کیسے کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں بعض اہلِ علم کو بھی یہ اشکال تھا کہ اہل قبلہ اور کلمہ گو کی تکفیر نیز جو شخص کسی تاویل کی بناء پر خلافِ شرع عقیدے کا قائل ہو اس کی تکفیر میں علمائے اہل حق نے بہت کلام کیا ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر حضرت الاستاذ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے خود قلم اٹھایا اور ایک رسالہ بنام اکفار الملحدین والمتاولین فی شئی من ضروریات الدین جس میں اس مسئلہ کو قرآن وحدیث اور تصریحات سلف کی روشنی میں آفتاب نصف النہار کی طرح واضح فرما دیا۔

بلکہ کفر وایمان کی مکمل حقیقت، اہل قبلہ اور کلمہ گو کی شرعی تعریف پر ایک نہایت جامع تصنیف فرما دی۔ جس میں اس بات کو بھی واضح کر دیا گیا کہ اگر کسی عقیدۂ کفریہ میں مطلقاً تاویل کو مانع کفر قرار دیا جائے تو دنیا میں کوئی کافر کافر نہیں رہ سکتا کیونکہ ہر کافر کچھ نہ کچھ تاویل اپنے عقیدۂ فاسدہ کی کرتا ہے۔ بلکہ فیصلہ یہ ہے کہ،

اسلام کے وہ احکام جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں (جن کو اصطلاح فقہ و کلام میں ضروریاتِ دین کہا جاتا ہے) جیسے ان کا انکار صریح کفر و ارتداد ہے اسی طرح تاویل کر کے جمہور امت کے خلاف ان کے نئے معنی بتانا بھی کفر و ارتداد ہے (یہ کتاب عربی زبان میں ہے)۔

ایک دوسری مستقل کتاب مسئلہ حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی اپنے قلم سے بزبان عربی تصنیف فرمائی جس کا نام "عقیدۃ الاسلام فی نزول عیسیٰ علیہ السلام" رکھا۔ یہ کتاب کہنے کو تو اسی ایک مسئلہ کی بہترین و جامع تحقیق ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر و تحریر کو جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک مسئلہ کے ضمن میں کتنے علوم و معارف کے ابواب آجاتے ہیں۔ یہ کتاب بھی اپنے موضوع کی عجیب و غریب تصنیف ہے۔

مقدمہ بہاولپور سے واپسی کے بعد مرض روز بروز شدت پکڑتا گیا۔ لیکن اسی حالت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے درس حدیث کو جاری رکھا۔ تا آنکہ قویٰ نے بالکل جواب دے دیا۔ اور آپ دیوبند تشریف لا کر گویا صاحبِ فراش ہو گئے۔ اور یہی مرض مرض الموت ثابت ہوا۔

لیکن قدرت نے جو دینی خدمت کا جذبۂ بے پایاں آپ کے قلبِ مبارک میں ودیعت فرمایا تھا وہ بسترِ مرگ پر بھی چین سے نہ لیٹنے دیتا تھا۔ افاداتِ علمیہ اور کتب بینی کا سلسلہ اس حالت میں بھی اسی طرح جاری تھا۔

تا آنکہ یہ ارادہ ہوا کہ ایک مرتبہ پھر کشمیر کا سفر کیا جائے۔ وہاں اپنے اعزہ و اقارب کی ملاقات کے علاوہ پیش نظر یہ تھا کہ کشمیر میں قادیانی فتنہ پھیلا ہوا ہے۔ اب تک وہاں پہونچ کر اس کے انسداد کے متعلق کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اس سفر کا قصد کرنے کے

ساتھ یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ کشمیر کے عوام اردو یا عربی کے رسائل تو پڑھ نہ سکیں گے فارسی زبان میں مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیت کے متعلق لکھکر طبع کر کے وہاں ساتھ لیجائیں اور مفت تقسیم کریں۔ اس ارادہ کے ساتھ ہی خود ایک رسالہ کی تصنیف شروع فرمادی۔ ابھی یہ تصنیف تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ مرض کے اشتداد نے بالکل ہی قویٰ کو معطل کر دیا۔ تو ایک طالبعلم کے ذریعہ اس ناکارۂ خلائق کے پاس پیغام بھیجا کہ میں نے کشمیر کی ضرورت سے فارسی زبان میں مسئلہ ختم نبوت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا تھا مگر اب میں اس کی تکمیل سے معذور ہوں تجھ سے ہوسکے تو اس کی تکمیل کر دے۔

احقر ناکارہ نے تعمیل ارشاد کو سعادت عظمیٰ سمجھ کر شروع کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ، حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی حالت بدلنا شروع ہوئی اور یہ علم و تقویٰ کا آفتاب عالمتاب غروب کے کنارے آلگا۔ یہانتک کہ ۲ ماہ صفر ۱۳۵۲ھ شب دوشنبہ اس پیکر علم و تقویٰ مجسّم دین و دیانت نے دین ہی کی فکر میں اپنی عمر کا آخری سانس پورا کر دیا۔ آپ کی گردوپیش سے گویا بزبان حال یہ سنا جاتا تھا :- ؎

اگرچہ خرمن عمرم غم تو داد بباد — بخاک پائے عزیزت کہ عہد نہ شکستم

اب وہ کشمیر کا قصد اور وہاں رسالہ فارسی کی اشاعت بھی ایک خواب و خیال ہوگیا۔ عرصہ کے بعد آپ کے مسودات میں سے وہ منتشر اوراق فارسی جمع کر کے مجلس علمی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت نے بنام خاتم النبیین شائع کیا۔ اور یہی اوراق آپ کا خاتمۃ التصانیف قرار پائے

فجزاہ عنا و عن جمیع المسلمین خیر الجزاء و وفقنا لاتباع سنتہ فی خدمۃ الدین المتین وھو الموفق والمعین۔

حضرت شاہ صاحبؒ

اور

دار العلوم دیوبند

از حضرت مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی

طالبعلم کی حیثیت سے داخلہ مشہور اساتذہ اور پہلا سالانہ امتحان

سنہ ۱۳۱۰ھ (سنہ ۱۸۹۳ء) میں یہ نیر تاباں علوم مشرقیہ کے اس عظیم الشان مرکز میں داخل ہوا۔ جو اسوقت شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری حضرت مولانا عبد العلی صاحب محدث مدرسہ عبد الرب دہلی، حضرت مولانا غلام رسول صاحب، حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحب جیسے اکابر علماء اور ماہرین اساتذہ کے فیوض و برکات کا کوثر و تسنیم بنا ہوا تھا۔ اور ماہ شعبان سنہ ۱۳۱۱ھ میں حسامی اور ہدایہ اولین کے سالانہ امتحان میں شریک ہو کر اس کا نام نامی (انور شاہ مظفر آبادی) زیب رودداد بنا۔ (ملاحظہ ہو، سالانہ روداد دار العلوم دیوبند بابت سنہ ۱۳۱۱ھ)۔

قیام وطعام کا انتظام

اس وقت تک دار العلوم میں مطبخ نہیں تھا، مستطیع طلبہ جو اپنے کھانے کا خرچ خود برداشت کرتے تھے، اور وہ طلبہ

جن کو دارالعلوم سے وظیفہ ملتا تھا۔ یہ سب ہی اپنے طور پر کسی نان پز کے یہاں کھانے کا انتظام کرتے تھے۔

طلبہ کی کثرت اور دارالاقامہ (ہوسٹل) میں کمروں کی کمی کی شکایت (جو بہت زیادہ وسعت کے باوجود آج بھی موجود ہے) نئی شکایت نہیں۔ اس کی عمر دارالعلوم کی عمر کے برابر ہی ہے۔ کیونکہ علم و عمل کے اس سرچشمہ پر ابتداء ہی سے تشنگان علوم کا ایسا ہجوم رہا کہ اس کی روز افزوں وسعت طلبہ کی کثرت کے مقابلہ میں اپنی عاجزی تسلیم کرتی رہی ہے۔ چنانچہ اس تنگ دامانی کی تکلیف ابتداء میں اس نووارد طالبعلم کو بھی برداشت کرنی پڑی۔ اور اس غریب الدیار نونہال کو سب سے پہلے بجنور کے ایک زمیندار کے فرزند نوخیز کے ساتھ جس کا نام مشیت اللہ تھا۔ دارالعلوم سے تقریباً چار فرلانگ فاصلہ پر ایک مسجد کے حجرے میں قیام کرنا پڑا۔ جو اسٹیشن کی جانب جانے والی سڑک کے کنارے اس مقام پر ہے جس کے قریب آج کل گؤشالہ اور اسکے سامنے دھرم شالہ ہے۔

یہ مشیت اللہ جس کی خاموش اور سادہ زندگی، تقوے و عبادت، خداترسی اور پاک بازی کے جواہر سے مرصع ہو کر یہاں تک بلند ہوئی کہ اکابر دارالعلوم نے اس کو مجلس شوریٰ دارالعلوم کا رکن منتخب کیا۔ اور اس دار فانی کی پُر آشوب ہنگامہ آرائیوں سے جب وہ گذشتہ سال پردہ پوش ہوا تو مجلس شوریٰ کے باضابطہ اجلاس نے اس کو حضرت مولانا مشیت اللہ صاحب کے پُرشوکت الفاظ سے یاد کرتے ہوئے تجویز تعزیت میں اُس کے اوصافِ حمیدہ، سلامت روی اور استقامت حال کا اعتراف کیا۔ اور آج ہمارے مخلصانہ جذبات کی تسکین اس کے بغیر نہیں ہوتی کہ:-

"دعاء رحمۃ اللہ واکرمہ مثواہ" کو اس کے تذکرہ کا لازمی جزو قرار دیں۔

یہ مولانا مشیت اللہ بجنوری حضرت شاہ صاحب کے صرف ساتھی ہی نہیں رہے، بلکہ پہلے ہی دن ارادتمند اور معتقد بھی بن گئے۔ پھر شاہ صاحب سے کچھ سبق بھی پڑھنے شروع کردیئے۔

مولانا مشیت اللہ صاحب نے دیکھا کہ یہ کشمیری ہم عمر نوجوان رات گئے تک مطالعہ میں مصروف رہا، اور نصف شب کے بعد جب نیند کا غلبہ ہوا تو وہیں گنڈلی مار کر پڑ گیا اور تھوڑی دیر آنکھ جھپک کر اٹھا اور وضو کرکے نوافل تہجد میں مشغول ہوگیا نوافل سے فراغت ہوئی تو پھر مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔

مولانا مشیت اللہ صاحب کی یہ ارادت و عقیدت ایسی پائدار تھی کہ آخر عمر تک حضرت شاہ صاحب کے مخلص جاں نثار بنے رہے۔ اور حضرت شاہ صاحب کی انسیت کا بھی یہ عالم تھا کہ تعطیلات کے زمانہ میں وطن عزیز کی طرح آپ مولانا مشیت اللہ صاحب کے یہاں قیام فرما کر راحت محسوس فرماتے تھے۔

اس مسجد کے علاوہ زمانۂ طالبعلمی میں آپ کا قیام محلہ پٹھان پورہ میں بھی رہا۔ اور ایک عرصہ تک آپ جامع مسجد کے حجروں میں بھی مقیم رہے۔

درسی کتابیں اور انکی ترتیب

دارالعلوم دیوبند کے عربی درجات میں دفعہ بندی کا قاعدہ کبھی بھی رائج نہیں ہوا۔ دارالعلوم کے نصاب میں ہر ایک فن کی خاص خاص کتابیں متعین ہیں جو طالب علم کو پڑھنی پڑتی ہیں۔ کچھ فنون اور کچھ کتابیں اعطاء سند کے لئے لازمی ہیں۔ باقی فنون اور کتابوں کے پڑھنے نہ پڑھنے کا طالب علم کو اختیار ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے خود اپنی رائے سے یا اپنے اساتذہ کے مشورہ سے جس ترتیب سے کتابیں پڑھیں وہ دورِ حاضر کے طلبہ کے لئے حیرت انگیز ہے۔

دارالعلوم کی سالانہ رئیدادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دارالعلوم میں داخلہ سے اگلے سال یعنی ۱۳۱۱-۱۲ھ میں بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھی۔

حدیث کی ان کتابوں کے ساتھ ہی آپ نے تفسیر میں جلالین شریف اور فقہ میں ہدایہ جلد ثانی پڑھی۔ اور اسی سال منطق میں قاضی مبارک پڑھا۔ (روئداد ۱۳۱۲ھ) بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھ چکنے کے بعد آمدہ سال ۱۳۱۳ھ میں آپ نے حدیث میں ابوداؤد شریف اور مسلم شریف پڑھی تفسیر میں بیضاوی شریف۔ ہیئت اور فلسفہ میں تصریح۔ شرح چغمنی اور صدرا پڑھا۔ امتحانات میں درجہ اول کی کامیابی حاصل کی۔ (روئداد ۱۳۱۳ھ)۔

۱۳۱۴ھ میں آپ نے مؤطا امام مالک۔ نسائی شریف اور ابن ماجہ شریف پڑھا۔ اور فنون میں شمس بازغہ اور نفیسی کا امتحان دیا۔

معاصر طلبہ

آپ کے سہ سالہ دورِ طالب علمی میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ طلبہ نے دارالعلوم میں داخل ہو کر تعلیم پائی۔ ان میں سے چند نام جانے پہچانے ملتے ہیں۔

محمد کفایت اللہ شاہ جہانپوری۔ عبیداللہ سندھی۔ محمد ضیاء الحق دیوبندی ضرغام الدین مظفر نگری۔ محمد صادق سندھی۔ صدیق احمد فیض آبادی۔ سید احمد فیض آبادی۔ حسین احمد فیض آبادی۔ محمد شفیع دیوبندی۔ وارث حسن فتح پوری۔

کس کو معلوم تھا کہ یہی نوخیز اپنے مستقبل میں علم و عمل کے آفتاب و ماہتاب ہوں گے اور پچاس سال زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت کے مشاہدوں اور تجربوں کے بعد دنیا

ان کو "حضرت مولانا" کے القاب و آداب کے ساتھ اس طرح یاد کرے گی :۔

حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند و سابق صدر جمعیۃ علماء ہند قدس اللہ سرہٗ العزیز۔ امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی۔ حضرت مولانا حافظ محمد ضیاء الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی رحمہ اللہ۔ حضرت مولانا ضرغام الدین صاحب صدر مدرس و بانی مدرسہ حنفیہ فیض آباد رحمہ اللہ حضرت مولانا محمد صادق صاحب بانی مدرسہ اسلامیہ عربیہ کھڈا کراچی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب صدر مدرس مدرسہ عبد الرب دہلی دام ظلہم العالی مہاجر مدینہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب مہاجر بانی مدرسہ الشرع مدینہ منورہ۔ شیخ الاسلام حضرت مولنا سید حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند و صدر جمعیۃ علماء ہند دامت برکاتہم۔

دار العلوم میں بحیثیت مدرس و صدر مدرس

یہی کشمیری نوجوان جو دار العلوم کے میخانۂ علم میں ۱۳۱۴ھ تک جام پر

ط۵ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب اور حضرت مولانا سید احمد صاحب شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ تذکرۃ الرشید جلد دوم و نقش حیات جلد اول وغیرہ ۱۲

ط۵ حضرت مدنی مدظلہ العالی کسی سبق میں حضرت شاہ صاحب کے ساتھ نہیں رہے۔ آپ نے دورۂ حدیث بھی ۱۳۱۵ھ میں پڑھا ہے۔ جب کہ حضرت شاہ صاحب ۱۳۱۴ھ میں تمام فنون سے فراغت حاصل کر چکے تھے ۱۲

جام نوشں جان کر رہا تھا۔ ۱۳ سال بعد[۵۱] ۱۳۲۷ھ میں ساقیِ علم بن کر اس مقدس خمخانہ میں داخل ہوا۔ اور بزمِ درس میں بے پناہ فیاضیوں کے مظاہر سے کرنے لگا۔

ذکاوت وذہانت فطری تھی۔ قوتِ حافظہ لفظ فراموشی کی حقیقت سے نا آشنا تھی۔ شب وروز مطالعہ طبیعتِ ثانیہ بن گیا تھا۔ انھیں اوصاف نے آپ کو مدرسہ امینیہ دہلی کا مشہور استاذ بنایا تھا۔ اور انھیں خصوصیات نے آپ کو دارالعلوم دیوبند

---

[۵۱] یہ تیرہ سال بجنور اور دہلی میں گذرے۔ مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری سے دوستانہ تعلق اخوت اور بھائی چارہ کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ فراغت کے بعد کشمیر کے بجائے آپ نے بجنور کا رُخ کیا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کیا پھر مولانا امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ دہلی، بجنور پہنچے اور مدرسہ امینیہ میں درس دینے کیلئے دہلی سے آئے۔ حضرت شاہ صاحب رح کے خادم اور رفیقِ خاص مولانا ادریس صاحب سکروڈوی کی روایت ہے کہ خود حضرت شاہ صاحب کو یقین نہیں تھا کہ مولانا امین الدین صاحب کی کوشش کامیاب ہوگی۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب مولانا امین الدین صاحب مجھے لینے کیلئے بجنور پہنچ گئے تو چونکہ زمانہ قیام دارالعلوم میں مولانا امین الدین صاحب بہت اخلاص اور محبت سے پیش آتے رہے تھے تو یہ خیال کرکے کہ مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر مولوی صاحب کی دلشکنی نہ ہو، میں مولوی صاحب کی ساتھ ہولیا اور دہلی پہنچکر سولہ سترہ روپے جو میرے پاس تھے وہ بھی میں نے مولانا کے حوالہ کر دیئے۔ یہی روپے مدرسہ کا سب سے پہلا مالی سرمایہ تھا۔ چنانچہ مولانا امین الدین صاحب نے اس رقم ہی سے کاغذ لاکر مدرسہ کیلئے رجسٹر بنائے اور طلبہ کو داخل کرنا شروع کر دیا۔ مولانا کا توکل خدا کے فضل سے کامیاب رہا۔ کسی انتظار کے بغیر طلبہ کا اچھا خاصہ اجتماع ہوگیا۔ مسلمانوں نے بھی توجہ کی اور مدرسہ کی مالی حالت قابلِ اطمینان ہوگئی۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے کھانے کا انتظام مدرسہ ہی کی طرف سے تھا۔ اور نقد تنخواہ تین روپے ماہانہ مقرر کی گئی تھی ۱۲

میں طبقہ علیا کے اساتذہ میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز کر دیا۔

صدر مدرسی یہانتک کہ جب شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز ۱۳۳۳ھ میں اپنے سیاسی اور انقلابی پروگرام کے مطابق دفعۃً مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں جاکر محبوس و اسیر ہو گئے تو ذمہ دارانِ دارالعلوم کو آپ کا جانشین منتخب کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کیوں کہ حضرت شاہ صاحب کی اعلیٰ شخصیت اس منصب کے لئے پہلے سے منتخب اور موزوں تھی۔ اور یہ ایسا قبا تھا جو بلا کسی قطع و برید کے حضرت شاہ صاحب کے قامتِ موزوں پر راست آکر رہا تھا۔

اس سات سالہ قیام میں ایک ناگوار واقعہ ضرور پیش آیا اور اس کا باعث وہ تصادم تھا جو اس دور کی سیاسی فضا میں پیدا ہو گیا تھا۔

یہی زمانہ تھا جب روس، برطانیہ، فرانس اور اُن کی ہمنوا حکومتوں کا بلاک (جو دول متحدہ کے خطاب سے موسوم تھا) یورپ کے مردِ بیمار یعنی ترکی حکومت کے ہر ایک عضو کو یورپ سے نکال پھینکنے کی آخری کوشش کر رہا تھا۔ اور دول متحدہ کے بھیڑیئے یورپ اور افریقہ کے ہر ایک محاذ سے دولتِ آلِ عثمان پر حملہ آور تھے چنانچہ جنگِ پلونا، جنگِ بلقان اور جنگِ طرابلس کے طوفان اسی زمانہ میں اُٹھے جن کی خرمن سوز بجلیوں نے ترکی کی طاقت کو نذرِ آتش کر دیا۔

دوسری جانب ہندوستان برطانوی سامراج کی بندشوں سے جنگِ آزادی کے میدان کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب جیسے ذکی الحس خوددار بہادر، جن کی فطرت دردمند تھی اور جن کے

رگ وپے ابتدائے شعور سے جذبۂ حریت سے سرشار تھے۔ جنگِ آزادی کیلئے تیرکمان اور توپ و تفنگ سنبھال رہے تھے۔

دارالعلوم دیوبند جو تقریباً پچاس سالہ عظیم الشان علمی خدمات کے باعث پورے ہندوستان کا علمی مرکز بن گیا تھا۔ ملک کی اس متصادم فضاء سے اس کا متأثر ہونا لازمی امر تھا۔

لیکن دارالعلوم دیوبند نے ابتداء سے اپنا تعارف ایک مذہبی علمی مرکز کی حیثیت سے کرایا تھا۔ اور اُس نے اپنا نصب العین یہی مقرر کیا تھا کہ مسلمانوں میں مذہبی علوم کو زندہ اور مذہبی روح کو باقی رکھے۔

اس بناء پر ذمّہ دارانِ اہتمام کی کوشش یہ تھی کہ اس دور میں بھی کہ سامراجیت کا بے پناہ حربہ ہر ایک مسئولیت سے آزاد ہے۔ اور وہ چشم زدن میں دارالعلوم کی بلند عمارتوں کو زمیں دوز کرسکتا ہے۔ دارالعلوم کا دامن سیاسی یا انقلابی جدوجہد کے ہر ایک شبہ سے پاک رہے۔

مگر مولانا عبیداللہ سندھی جیسا گرم مزاج نوجوان جس کی انقلاب پسند فطرت سب سے پہلے اس کے مذہبی جذبات میں انقلاب پیدا کرکے اپنے خاندانی مذہب کے بجائے اس کو حلقہ بگوش اسلام بنا چکی تھی۔ وہ اس مذہبی یونیورسٹی کو ایسی سطح پر دیکھنا چاہتا تھا کہ انقلاب پسند نوجوانوں کی پیشانیاں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ اور مسلمانوں کی سیاسی لیڈرشپ اس کے سایہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو۔

نیتیں دونوں کی بخیر تھیں۔ مگر طبعی رجحانات کے اختلاف نے دارالعلوم میں خاموش تصادم کی شکل پیدا کردی۔ جس کے نتیجہ میں مولانا عبیدہ سندھی قدس اللہ سرہٗ العزیز

کو دار العلوم سے علیحدہ ہونا پڑا۔

حضرت شاہ صاحب جن کی تمام راحت و تفریح مطالعہ کتب میں منحصر تھی۔ دائرۂ اہتمام کے ہمنوا رہے۔ لیکن بعد میں جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز گرفتار کر کے مالٹا پہونچا دیئے گئے تو حضرت شاہ صاحب کو غلطی کا احساس ہوا۔ یہ آپ کی بزرگانہ صداقت تھی کہ جیسے ہی غلطی کا احساس ہوا آپ نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کو معذرت نامہ لکھا اور پہلی باتوں کی صفائی چاہی۔ (ملاحظہ ہو نقشِ حیات جلد دوم ص ۱۴۴)

انتظامی معاملات

حضرت شاہ صاحب کا علمی ذوق اور شوق مطالعہ اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ آپ کی دلچسپیاں دار العلوم کے انتظامی معاملات سے وابستہ ہوں۔ صدر مدرس کی حیثیت سے آپ مجالسِ مشورہ میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ اور دار العلوم دیوبند سے باہر علمی مجالس اور مذہبی اجتماعات میں بھی کسی شدید اصرار پر تشریف لے جاتے تھے۔ مگر یہ تمام نقل و حرکت قسری اور جبری ہوتی تھی۔ احقر کو یاد ہے کہ پرچہ امتحانات کا مطالعہ بھی آپ کے لئے باعثِ کوفت ہوتا تھا۔ آپ اس کو "بے حظ مشغلہ" فرمایا کرتے تھے۔

دار العلوم سے علیحدگی

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محتاط بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور جو شخص زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لیتا ہے وہی ابتلا میں پڑ جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ العزیز کے ساتھ یہی سانحہ پیش آیا۔[۵]

---

[۵] حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق اس موقع پر "محتاط" کا لفظ اس معنی میں (بقیہ بر صفحہ ۲۷۹)

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب خلف حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب مہتمم تھے اور طبقۂ علماء کے بہترین مدبر و مفکر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی، نائب مہتمم اور دارالعلوم کے مدار المہام تھے۔ ان دونوں بزرگوں کا دورِ اہتمام دارالعلوم کا تابناک دور مانا جاتا ہے۔ اسی دور میں اس نے ایک مدرسہ کی حیثیت سے ترقی کرکے ہندوستان بلکہ ایشیاء کے مرکز العلوم اور علومِ مشرقیہ کی آزاد یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا۔ اور دارالعلوم نظامیہ اور جامعہ قرطبہ کا نمونہ چودھویں صدی کے مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے لگا۔ لیکن فروگذاشتوں اور عملی غلطیوں سے معصومیت فطرت انسان کا حصہ نہیں ہے (الا من عصمۃ اللہ)

اہتمام اور نظم ونسق کی ذمہ داری کی عمر جتنی دراز ہوتی ہے وہ محاسن اور مناقب کے ساتھ غلطیوں کی بھی ایک فہرست مرتب کردیتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

(صفحہ ۲۷۸ کا بقیہ) استعمال نہیں ہوا کہ حضرت مرحوم دینی اور اصلاحی امور میں بھی شرکت نہیں فرماتے تھے اور ان کے یہاں ذاتی مصالح دوسرے امور پر مقدم تھے۔ بلکہ مولانا محمد میاں صاحب بتانا چاہتے ہیں کہ امور دنیاوی سے حضرت شاہ صاحب کو کوئی رغبت نہیں تھی اور حضرت مرحوم کے علمی مشاغل اتنے کثیر تھے کہ انھیں دوسری چیزوں پر نہ توجہ ہوتی تھی اور نہ فرصت ملتی تھی وہ اپنے تمام اوقات علمی مشاغل ہی میں صرف فرماتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت مرحوم نے جب عملی میدان میں اپنی سعی وجدوجہد کی ضرورت کسی دینی یا اخلاقی تقاضے سے محسوس فرمائی تو اس کو بھی پورا کیا۔

قیصر

کہ اہتمام ونظامت کی درازیِ عمر وجہ شکایت بن جاتی ہے۔ اس پر نظر نہیں کی جاتی کہ کیا کیا۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا نہیں ہوا۔ اور اسی پر گرفت کی جاتی ہے۔ اور اس طرح ایک مخالف پارٹی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔

بہرحال اصلاحات کے مقام پر ایک تحریک دارالعلوم میں شروع ہوئی۔ اور اس نے اپنے دامنوں کے تار رفتہ رفتہ حضرت شاہ صاحب جیسے عظیم الشان بزرگ کے قبائے عظمت سے جوڑ دیئے۔

داستان بہت طویل ہے۔ اور اس کا آخری باب استعفاء ہے۔ جو تحریک کے رہنماؤں نے بطور احتجاج پیش کیا۔ اور اہتمام کے تدبیرِ قلم نے اُس پر منظوری صادر کر کے احتجاج کو ناکام بنادیا۔

اسباب ووجوہات کی تحقیق وتنقیح اور مخطی ومصیب کی تشخیص ہمارے موضوع سے خارج ہے موضوع کا آخری فقرہ یہ ہے کہ ۷ سال طبقۂ علیا کے مدرس اور تیرہ سال صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۴۶ھ میں آپ نے دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی اختیار کی اور دیوبند کے بجائے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو اپنے فیوض وبرکات کا مرکز بنایا۔

دارالعلوم کی علمی زندگی میں تغیّر واضافہ

حضرت شاہ صاحب کے علمی فیوض سے دارالعلوم دیوبند کی عِلمی زندگی میں کیا تغیّر اور اضافہ ہوا۔ یہ بہت ہی دلچسپ موضوع ہے۔ مگر اس کے لئے ایسے عالم کے قلم کی ضرورت ہے جو درس وتدریس کا پورا تجربہ رکھتا ہوا اور جس نے حضرت شاہ صاحب سے پہلے ہی دارالعلوم کی علمی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ

کیا ہو۔ احقر ان دونوں سعادتوں سے محروم ہے۔ لہٰذا اس موضوع کا حق تو ادا نہیں کر سکتا۔ تاہم اپنی فہم ناقص واستعدادِ ناتمام کے مطابق آپ کے درس کی چند خصوصیات قلم بند کرتا ہے انھیں کو تغیر و اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۱) تحقیق و تفتیش

حضرت شاہ صاحب کا درس اس پر قناعت نہیں کرتا تھا کہ عبارت کا مطلب سمجھا دیا جائے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مسئلہ سے متعلق تحقیق و تدقیق کا سیر حاصل خلاصہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں ہر دعوے کی دلیل کتاب کے حوالہ سے پیش کی جاتی تھی۔ یہ خصوصیت حضرت شاہ صاحب ہی کی تھی کہ آپ کے سامنے ایک بینچ پر کتابوں کا انبار رہتا تھا۔ اور مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ زبانی حوالہ پر قناعت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کتاب کھول کر اصل عبارت پیش فرما دیتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس کتاب کا حوالہ دیا جاتا وہ انبار میں موجود نہ ہوتی تو اس کو منگوا کر وہ عبارت پیش فرماتے۔

اور اگر وہ کتاب اُس وقت دستیاب نہیں ہو سکی تو اگلے روز وہ کتاب اپنے ساتھ لاتے اور عبارت پڑھ کر سُنا دیتے۔

یہ حضرت شاہ صاحب کے قوۃ حافظہ کا کمال تھا کہ جس عبارت کا حوالہ دیتے تھے اُس کے صفحات بھی گویا آپ کو محفوظ ہوتے تھے۔ چنانچہ فہرست مضامین سے آپ شاذ و نادر ہی مدد لیتے تھے۔ بلکہ عام طریقہ یہی تھا کہ سیکڑوں صفحات کی کتاب میں بھی عبارتِ محولہ کو اس طرح پیش کر دیتے تھے جیسے پوری کتاب آپ کو حفظ ہے۔ اور اُس کے مضامین کے صفحات آپ کے ذہن میں مستحضر ہیں اس کمال کا حیرت انگیز

مظاہرہ اُس وقت ہوتا تھا جب طلبہ کے سوالات پر کوئی تازہ بحث شروع ہو جاتی اور حوالہ کے لئے کوئی ایسی کتاب منگائی جاتی جس کا مطالعہ سالہا سال پہلے کیا ہو۔ یہ کتاب خواہ کتنی ہی ضخیم ہوتی۔ محولہ عبارت اس طرح پیش کر دی جاتی گویا اس کے صفحات اور سطور آئینۂ قلب پر نقش ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کے اس طریق کار نے تلامذہ میں تحقیق و تفتیش کا نیا ذوق پیدا کر دیا۔ یہ ذوق فقط حوالہ کتاب سے مطمئن نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی کاوش اس وقت ختم ہوتی ہے جب اصل عبارت اصل کتاب میں مطالعہ کر کے بحوالہ صفحات اس کو نوٹ کر لیا جائے۔

چنانچہ حضرت صاحب کے تلامذہ میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ مولانا محمد شفیع صاحب۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی جیسے اربابِ قلم کی تصانیف میں آپ یہ ذوق کارفرما پائیں گے۔ یہ حضرات اپنی تصانیف میں جس کتاب کا حوالہ دیتے ہیں اُس کے صفحات اور جلد کا حوالہ بھی قلمبند کر دیتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اصل عبارت اصل کتاب میں مطالعہ کر کے یہ حوالہ دیا گیا ہے خود احقر اپنے اس ذوق کے باعث کافی پریشانی برداشت کر چکا ہے۔ جس وقت جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں ترمذی شریف احقر سے متعلق ہوئی تو اگرچہ زمانۂ درس کے نوٹ میرے پاس تھے اور حضرت شاہ صاحب کی تقریروں کا مجموعہ "عرف الشذی" بھی زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ مگر احقر کو نہ اپنی لکھی ہوئی تقریریں پر اطمینان ہوتا۔ اور نہ عرف الشذی کے مبہم حوالوں سے دل مطمئن ہوتا تھا۔ بلکہ جو

کتابیں بھی دستیاب ہوسکتیں احقر نے ان کا مطالعہ کیا۔ اور اصل عبارت مطالعہ کرنے کے بعد حرف بحرف اپنے پاس قلمبند کرلی۔ چونکہ اصل عبارت نقل کرنے اور قابل یادداشت مسائل قلمبند کرنے کے لئے "عرف الشذی" کا حاشیہ کافی نہیں تھا تو ہر ورق کے ساتھ ایک سادہ ورق لگا کر عرف الشذی کی جلد بندھوانی پڑی۔ یہ اوراق بھی عموماً یادداشتوں سے بھر گئے ہیں اور اس طرح معلومات کا ایک ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ سینہ میں کچھ بھی نہیں صرف سفینہ ہی ہے۔

اسی زمانہ کی بات ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے نئے فضلاء کی کوتاہمتی کی مذمت کرتے ہوئے شکایت فرمائی کہ نئے مدرسین صرف "عرف الشذی" پر اعتماد کرلیتے ہیں اور ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ اس کے حوالوں میں بہت کچھ غلطیاں ہیں۔ جب کاتب الحروف نے عرض کیا کہ یہ خادم صرف حوالوں پر اعتماد نہیں کرتا، بلکہ حوالوں کی تصحیح کرتا ہے اور اصل عبارت بھی نوٹ کرلیتا ہے تو حضرت شاہ صاحب بہت خوش ہوتے اور پھر دوسرے حضرات کے سامنے احقر کے اس فعل کی نذیر پیش فرمائی۔

(۲) تاویل کی بجائے تطبیق و توجیہ

فن حدیث وسعتِ نظر چاہتا ہے روایت "بالمعنی" کرتے ہوئے ایک ہی مفہوم کو راوی حضرات نے موقع اور محل کے لحاظ سے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اختلاف الفاظ کے ساتھ بسا اوقات انداز میں بھی فرق پیدا ہوگیا ہے۔ مثلاً ایک بات جو ترغیب و تشویق کے طور پر لسانِ رسالت سے صادر ہوئی تھی۔ اس کو قطعی حکم کی صورت میں بیان کردیا گیا ہے۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ کوئی حدیث طویل تھی۔ راوی نے

کسی وقتی ضرورت کی بناء پر پوری حدیث نہیں بیان کی، بلکہ ضرورت کے مطابق اس کا ایک حصہ نقل کر دیا ہے۔ راوی نے اس جملہ کا وہی مفہوم لیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء مبارک تھا۔ لیکن بعد کے راویوں نے جب تنہا اس جملہ کو نقل کیا تو اصل مفہوم ذہن میں نہیں رہا۔

اس طرح بعد کے علماء میں ایک اختلاف کی بنیا دپڑ گئی۔ اب اس جملہ کا صحیح منشاء وہی معلوم کر سکتا ہے جس کی نظر ذخیرۂ احادیث پر ہو اور جس نے کتب حدیث کے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر کے یہ سمجھ لیا ہو کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ اور فقط اس ایک جملہ کے نقل کر دینے سے کیا فرق پیدا ہو گیا ہے۔

لیکن قاصر الہمت۔ اور کوتاہ دست۔ ایک ہی روایت کے الفاظ لیکر اپنی مرضی کے مطابق اُن میں معنی ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ بدعت اس امت میں بہت ہی زیادہ قابل ملامت بن جاتی ہے۔ جب کسی دوسری روایت میں اس کے خلاف الفاظ واقع ہوں۔

حضرت شاہ صاحب اِس قسم کے معنی پہنانے کے سخت مخالف تھے۔ اس کو مدرسین کا طریقہ فرمایا کرتے تھے۔ یعنی جو محض کارگزاری کے لئے درس دیتے ہیں درس میں اپنی ذاتی تحقیق پیش نہیں کرتے۔

اِس معنی پہنانے کو "تاویل" فرمایا کرتے تھے اور ارشاد ہوتا تھا کہ میں "تاویل" نہیں کرتا بلکہ توجیہ یا تُطبیق کرتا ہوں۔ یعنی روایت کے تمام الفاظ جو مختلف انداز میں ذخیرۂ احادیث میں وارد ہوئے ہیں اُن سب کو سامنے رکھ کر ایک معنی معیّن کیا کرتا ہوں۔ اور جس جملہ کا جو حقیقی محل ہے اس پر منطبق کیا کرتا ہوں۔

احترامِ فنِ حدیث و احترام ائمہ مجتہدین و علماءِ حدیث

حضرت شاہ صاحب کے اِس طرز نے تلامذہ میں دو باتیں خاص طور پر پیدا کیں :۔

(الف) وہ مثلاً ترمذی شریف پڑھانے وقت یہ جائز نہیں سمجھتے کہ ترمذی شریف کی روایت کے الفاظ پر اُن کی نظر منحصر رہے، اور اس موقع کے لحاظ سے حدیث کے معنی پہنا کر سبکدوش ہو جاتے، بلکہ اس روایت کے وہ الفاظ لامحالہ اُن کے پیشِ نظر رہیں گے جو کم از کم صحاح ستہ میں وارد ہوئے ہیں۔ اِس طرح شوقِ مطالعہ کے ساتھ فنِ حدیث کا خاص احترام اُن کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے ۔

(ب) جب وہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دریائے ناپیدا کنار کے ساحل پر کھڑے ہو کر اُس کی وسعتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو جس طرح امام ابو حنیفہؒ کی عظمت اُن کے دل میں گھر کرتی ہے۔ اِسی طرح اُن کے قلوب امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ۔ امام مالکؒ وغیرہ ائمہ مجتہدین اور ائمہ حدیث کے احترام سے بھی لبریز ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح اس بحرِ محیط، اور اس قلزمِ اعظم میں ساری عمر شناوری کر کے اس کی گہرائیوں سے فقہی مسائل کے موتی برآمد کئے ہیں اور کس طرح اس سمندر کی لہروں کو کتب احادیث کے آبگینوں میں سمویا ہے۔ (فجزاھم اللہ و شکر سعیھم)

اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے ائمہ کے مقلدین یا علماء حدیث سے نفرت نہیں کرتے، اُن کی تحقیر و توہین سے اُن کے ذہن پاک ہوتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فقہی مسائل کا یہ اختلاف ایک علمی بحث اور خوشگوار نظریاتی

اختلاف بن جاتا ہے جو" اختلاف امتی رحمتہ" کی تصدیق پیش کرتا ہے، جو متعصبانہ جنگ و جدال اور نفرت و حقارت کے بجائے وسعتِ مطالعہ اور تحقیق و تفتیش کی دعوت دیتا ہے۔

(۴) تحقیق فن شرح ملا جامی، ایک تصنیف کی حیثیت سے قابل قدر کتاب ہے، مگر درسیات میں اس کا شمول دماغوں میں ایک خطرناک مرض کے جراثیم پیدا کر دیتا ہے طلبہ کی توجہ فن سے ہٹ جاتی ہے، اور اُن کے دماغ اس قیل و قال اور عبارت سے متعلق بحث مباحثہ میں پھنس جاتے ہیں جن کا تعلق فن کے بجائے منطقی موشگافیوں سے ہے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منطقی موشگافیوں - میں تو مہارت ہو جاتی ہے۔ لیکن فن سے متعلق مسائل میں مہارت تو درکنار اُن پر پوری طرح عبور بھی نہیں ہوتا منطقی موشگافیوں کی گرم بازاری حضرات مدرسین کے دماغوں کو بھی متاثر کرتی ہے، اور وہ فن کے متعلق وسعتِ نظر پیدا کرنے کے بجائے پوری توجہ شروح۔ حواشی اور منہیات وغیرہ متعلقات عبارت میں صرف کر دیتے ہیں۔ اور انہیں چیزوں کے استحضار کو مدرسی کی مہارت مانا جاتا ہے۔ اس کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حضرات مدرسین کا علم درسیات کے حواشی، شروح اور منہیات تک محدود ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب اِس مرض سے بہت زیادہ بیزار تھے، الفاظ کی ژولیدگی میں مشغول ہونا آپ کے نزدیک تضیع اوقات تھا۔ آپ کی تمام توجہ فن کی تحقیق پر مبذول رہتی تھی، اسی کا مظاہرہ آپ کے درس میں ہوتا تھا۔

آپ کی تقریر شروح اور حواشی کے اقتباسات کا مجموعہ نہیں ہوتی تھی، بلکہ مسئلہ پر محققانہ تبصرہ ہوتا تھا

املاء اور درس

آج ہمارے مدرسوں میں درس کا طریقہ جاری ہے یعنی کتاب سامنے رکھ کر اس کی عبارت کی تفہیم میں وقت صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن سلف کا طرز یہ نہیں تھا۔ اُن کے یہاں طریقۂ املاء جاری تھا یعنی وہ مسئلہ کے متعلق اپنی تحقیق پیش فرمایا کرتے تھے طلبہ اُس کو نوٹ کرلیا کرتے تھے۔ عبارت کا سمجھنا اور اس سے مطلب اخذ کرنا طالب علم کا کام ہوتا تھا۔ اِس سے طلبہ میں قوتِ مطالعہ کے اضافہ کے ساتھ فنی واقفیت پیدا ہوتی تھی اور وہ اپنے زمانہ کے ابن ھمام و ابن حجر بن جاتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں کتابیں بیشک کھلی رہا کرتی تھیں۔ طلبہ عبارت بھی پڑھتے تھے۔ مگر حضرت شاہ صاحب کی تقریر کا تعلق عبارت سے زیادہ تحقیق و تنقیح مسئلہ سے ہوتا تھا۔ آپ الفاظ کی بندشوں بلند ہوکر مسئلہ کے متعلق اپنی ذاتی تحقیق پیش فرماتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے اس طرز کے لئے مناسب یہ تھا کہ "درس" کے بجائے "املاء" کا طریقہ اختیار کیا جاتا۔ تاکہ طلبہ کی توجہ بھی تقریر کے قلمبند کرنے کی طرف رہتی اور اس طرح معلومات کا ایک نادر ذخیرہ فراہم ہوجاتا، اور آئندہ کے لئے مدارس عربیہ میں سلف کا طریقہ "املاء" دوبارہ جاری ہوجاتا جس سے حضرات مدرسین میں وسعتِ نظر، اور طلبہ میں قوتِ مطالعہ پیدا ہوتی۔

حضرت شاہ صاحب کے استاذِ حدیث شیخ الہند حضرت مولانا

محمود الحسن صاحب، اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ)
وسعتِ نظر۔ مہارت فن حدیث۔ تفقہ اور حذاقت میں یکتا روزگار تھے حضرت
شاہ صاحب بھی ان کی جلالت وعظمت اور تبحرِ علمی کے قائل تھے۔ حضرت مولانا
گنگوہی کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔ "آپ سے زیادہ ائمہ اربعہ کے مذہب کا ماہر
میں نے نہیں دیکھا" حضرت شیخ الہندرح کی تحقیقات اپنی تقریروں میں پیش
فرمایا کرتے تھے۔ مگر ان بزرگوں کا طریقۂ درس بالکل مختلف تھا۔ ان بزرگوں کی
ابتدائی تقریر عبارت کتاب سے متعلق نہایت مختصر ہوتی تھی۔ اُن کی مفصل تقریر
اُس وقت ہوتی تھی جب طلبہ سوال کرتے اور طلبہ کے سوالات کا تقاضا ہوتا
کہ مطمئن کرنے کے لئے مفصل تقریر کیجائے۔ مگر حضرت شاہ صاحب طلبہ کو
اصرار کی زحمت نہیں دیتے، بلکہ آپ کی ابتدائی تقریر ہی مفصل ہوتی۔ اور
پہلے ہی مرحلہ میں آپ طلبہ کو موقع دیتے کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرلیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا طرزِ عمل طلبہ کے ساتھ

اِس عنوان پر روشنی ڈالنے کے لئے صرف ایک جملہ کافی ہے کہ آپ کی ساری زندگی طالب علمانہ تھی۔ اعلوم وفنون کا یہ جوہر تاباں۔ جس کو "ایت من ایات اللہ"۔ اور "اسلام کا ایک معجزہ" مانا جاتا تھا۔ مدرس، اور پھر شیخ الحدیث ہونے کے بعد بھی دار العلوم دیوبند کے احاطہ ہی میں اقامت گزیں رہا۔

وہی دار المطالعہ تھا۔ وہی آرام گاہ۔ اور وہی ملاقات کا کمرہ۔

مہتمم صاحبان اور اُن دوستوں اور بزرگوں کے اصرار پر (جن کا احترام

حضرت شاہ صاحب ضروری سمجھتے تھے)۔ تقریباً چالیس سال کی عُمر میں شادی کرلی تھی۔ شادی کے بعد ایک زنانخانہ بھی ہوگیا تھا۔ مگر روز و شب کے اوقات میں حضرت شاہ صاحب کا قیام زیادہ تر اسی حجرہ میں رہتا تھا۔

ایشیائی اور مشرقی تہذیب استاذ کو باپ اور شاگردوں کو اولاد کا درجہ دیتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب، اس کا عملی نمونہ تھے۔ آپ کی بے پناہ شفقت ہر وقت طلبۂ علوم کے استقبال کے لئے وقف تھی۔ آپ کا دروازہ طلبہ کے لئے ہر وقت کھُلا ہوا تھا۔ بدشوق طلبہ کو بھی آپ محبت و شفقت ہی سے گرویدہ کرنے کے عادی تھے۔

احقر وہ بدنصیب ہے جو حضرت کی نجی مجلس میں کبھی حاضر نہیں ہوا۔ حضرت کے حجرہ میں بھی شاید ایک مرتبہ ہی حاضری ہوئی ہے۔ حلقۂ درس میں بھی کوئی ممتاز حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس اجنبیت اور بعد کے باوجود جب بھی حضرت شاہ صاحب سے واسطہ پڑا۔ احقر نے محسوس کیا کہ حضرت کی بے پناہ شفقت اِس ناکارہ کے شامل حال ہے۔

۱۔ سب سے پہلے ایک درخواست کے سلسلہ میں حاضر خدمت ہوا۔ اُس وقت احقر درجہ وسطےٰ کی کتابیں پڑھتا تھا۔ حضرت کے حلقۂ درس میں شرکت کے لئے ابھی ایک دو سال باقی تھے۔ ذاتی تعارف کچھ نہ تھا۔ دارالعلوم کے سینکڑوں طلبہ میں سے ایک میں بھی تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند، "محاکم شرعیہ ریاست حیدرآباد" کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کی حیثیت سے حیدرآباد میں مقیم تھے۔ اور نظام حیدرآباد کی نظر میں دارالعلوم کی

خاص عظمت تھی۔ متعدد طلبہ ریاست کے وظائف سے فیضیاب ہو رہے تھے
احقر کو بھی چند دوستوں نے مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک درخواست نہایت خوشخط
ایک کاتب صاحب سے احقر نے بھی لکھوالی۔ اور حضرت شاہ صاحب کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ کہ اس پر سفارش تحریر فرما دیں۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے یہ تھی کہ اس قسم کی درخواستیں بے سود ہیں
وہاں کسی خاص تعلق کے بغیر صرف سفارشی الفاظ سے کام نہیں چلتا۔ (چنانچہ
نتیجۂ درخواست سے اس کی تصدیق ہو گئی کہ آجتک اس کی رسید بھی نہیں آئی)
مگر آپ کے لطفِ بیکراں نے اس کی اجازت نہیں دی کہ اپنی رائے کو بالا
رکھتے ہوں، سفارش لکھنے سے معذرت فرما دیں۔ جیسے ہی احقر نے
درخواست پیش کی، آپ نے بلا تامل مؤثر انداز میں پرزور سفارش تحریر فرما دی
سفارش کے تمام الفاظ یاد نہیں رہے البتہ ایک مصرع یاد ہے جو آخر
میں تحریر فرمایا تھا۔ ع "خسرواں چہ عجب از بنوازند گدارا"

۲۔ اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ احقر کی پھوپی کا
انتقال ہو گیا۔ احقر کا مکان اسٹیشن کی جانب دیوبند کے آخری کنارہ پر
دار العلوم دیوبند سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ حضرت شاہ صاحب کو معلوم
ہوا، تو آپ پا پیادہ تشریف لائے۔ اور جہاں تک یاد پڑتا ہے، نماز جنازہ آپ نے
ہی پڑھائی۔

۳۔ دورۂ حدیث میں احقر کے ساتھ ختم سال پر ۸۷ ستاسی طلبہ تھے۔ عبارت عام طور
پر مولانا احمد اشرف صاحب راندیری، مولانا اشفاق صاحب سنبھلی۔ مولانا

محمود الرحمٰن صاحب جالونی (مرحوم)، مولانا عبدالمتین صاحب ہزاروی، مولانا سیف اللہ برادر خورد حضرت شاہ صاحب (احقر کے مشفق دوست)، مولانا مسعود احمد صاحب مرادآبادی وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بخاری شریف کے سبق میں اس مسابقت میں شرکت کا شوق احقر کو بھی ہوا۔ سب سے پہلی صف میں جا کر بیٹھا۔ اور سب سے پہلے بسم اللہ پڑھ کر اپنا حق قائم کرلیا۔ مگر عبارت پڑھی تو چند فاحش غلطیاں ہوگئیں۔ حضرت شاہ صاحب کو نحوی یا صرفی غلطیوں سے بہت کوفت ہوتی تھی، اور سختی سے تنبیہ فرمایا کرتے تھے۔ مگر حضرت نے محسوس فرمایا کہ یہ غلطیاں گھبراہٹ میں ہوئی ہیں، تو نہایت شفقت اور نرمی سے اصلاح فرمائی چند سطریں پڑھی تھیں، کہ ایک بحث شروع ہوگئی، اور اسی بحث میں گھنٹہ ختم ہوگیا جان بچی لاکھوں پائے۔ پھر کبھی اس اقدام کی جرأت نہیں کی۔

۴۔ ششماہی امتحان تھا۔ اُس زمانہ میں سہ ماہی یا ششماہی امتحان تقریری ہُوا کرتے تھے۔ چند روز پہلے احقر کی شادی ہوئی تھی۔ امتحان دینے کے لئے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش ہوا۔ عبارت پڑھی۔ شاید عبارت میں کوئی غلطی بھی کی۔ پھر مضمون حدیث پر کوئی بحث نہیں کرسکا۔ خاموش بیٹھ گیا۔ حضرت شاہ صاحب نے ایک سوال کیا۔ احقر یہی سمجھتا ہے کہ اُس کا جواب اُلٹا سیدھا دیا۔ مگر تعجب ہوا کہ احقر کو نمبر پورے عطا فرمائے۔ احقر کا خیال ہے کہ حضرت نے نمبر دیتے وقت وقتی صورت حال کا خیال نہیں فرمایا۔ بلکہ نظرِ شفقت صلاحیت پر تھی اور اسی لحاظ سے نمبر عطا فرمائے۔ اِسی قسم کا ایک دلچسپ واقعہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کے یہاں بھی چند سال پہلے پیش آچکا تھا۔

حضرت مولٰنا کے یہاں مقامات حریری کا درس ہوتا تھا۔ احقر کو اور مولٰنا اشفاق حسین صاحب سنبھلی کو مقامات سے اتنا شغف تھا کہ حافظ مقامات مشہور ہو گئے تھے۔ سہ ماہی امتحان کی نوبت آئی۔ امتحان تقریری تھا۔ اور اتفاق سے احقر اور مولٰنا اشفاق صاحب دونوں کا امتحان ساتھ ہوا۔ اور کچھ ایسی صورت ہوئی کہ اُس وقت درس گاہ میں ہم دو کے علاوہ اور کوئی طالب علم نہیں تھا۔ حضرت مولٰنا نے ساتویں مقامہ کی عبارت پڑھوائی، اور نحوی سوال کر لیا جس کے جواب میں ہم دونوں قابل ترین طالب علم بغلیں جھانکنے لگے۔ حضرت مولٰنا نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا۔ "مولٰنا! ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ مقامات خوب یاد کرتے ہیں، بڑی محنت کرتے ہیں"۔

حضرت مولٰنا کے ان ملامتی ارشادات کے جواب میں ہم دونوں، دم بخود تھے۔ یقین تھا کہ ہم دونوں فیل کر دیئے جائیں گے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں کو پورے نمبر عطاء فرمائے۔ یہ بزرگانہ شفقت اِس لئے تھی کہ ہماری محنت کا یقین تھا۔

۵۔ کتب درسیہ سے فارغ ہوا، تو مُلازمت کے سلسلہ میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی خاص شفقت نے دستگیری فرمائی۔

آرہ، ضلع شاہ آباد، صوبہ بہار میں ایک بہت پُرانا مدرسہ ہے، مدرسہ حنفیہ، اس نے گورنمنٹ سے ایڈ حاصل کرنی شروع کی۔ اور مولوی فاضل وغیرہ کے درجات کھولے۔ تو اُن کو ایسے مدرس کی ضرورت ہوئی جو ادب، تاریخ اور ہیئت وغیرہ کی کتابیں پڑھا سکے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کسی تقریب سے بہار

تشریف لے گئے تو اراکینِ مدرسہ حنفیہ کے ایک وفد نے حضرت سے ملاقات کی اور مدرسہ حنفیہ کے لئے "ادیب" کی فرمائش کی۔ یہاں جس طرح استاذ محترم حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کی عنایت خصوصی نے سبقت فرما کر احقر کا نام پیش کیا ایسے ہی حضرت شاہ صاحب کی خاص شفقت تھی کہ باوجودیکہ نہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں کا حاضر باش تھا، اور نہ اور کوئی خاص تعلق تھا محض ازراہِ شفقت احقر کے نام کو منظور فرمایا۔

یہ ۱۳۴۴ھ، ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے۔ اُس وقت احقر کی عُمر تقریباً بیس سال تھی، داڑھی نہیں تھی۔ صرف سبزہ آغاز تھا۔ مدرسہ حنفیہ کے عمر رسیدہ مدرسین اور اراکین کے لئے عجیب سی بات تھی کہ ایک لڑکے کو اِس خدمت کے لئے بھیج دیا گیا۔ مگر ان بزرگوں کی دُعاؤں نے امداد فرمائی۔ اور چند اجتماع جو اسی ہفتہ میں ہوئے۔ اُن میں اُردو، اور عربی کی تقریروں نے اس خلجان کو رفع کر دیا۔ اور وہ بجائے تحقیر کے احقر کی عزّت کرنے لگے۔ پھر تقریباً تین سالہ قیام میں ایسی مقبولیت حاصل ہوگئی کہ اگر وہاں کچھ اور عرصہ قیام رہتا، تو شاید اس حلقہ کی معراج احقر کو حاصل ہو جاتی یعنی مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا پرنسپل بنا دیا جاتا۔ مگر ؎

عشق نے غالب نکمّا کر دیا ؛ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

انگریزی سرکار کی وظیفہ خواری کے ساتھ علم دین کی خدمت گوارا نہ ہوئی گلو خلاصی کی کوشش کرنے لگا۔ ۱۹۲۹ء میں وہاں سے علیحدٰہ ہو کر جب مدرسہ شاہی مراد آباد میں تقرر ہوا، تو اس موقع پر بھی ان دونوں بزرگوں کی شفقت کار فرما تھی۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے کوشش فرمائی اور حضرت

شاہ صاحبؒ نے نہایت شاندار الفاظ میں احقر کی سفارش فرمائی۔

اہتمام دارالعلوم سے وہ اختلاف جس کا اشارہ پہلے گذر چکا ہے احقر کے دیوبند سے چلے جانے کے بعد رونما ہوا۔ عملی طور پر میں نے کسی پارٹی کی حمایت میں کچھ نہیں کہا۔ البتہ میرے رجحانات اہتمام کی حمایت میں تھے۔ اور حضرت شاہ صاحب کو اس کا علم تھا۔ مگر آرہ یا مرادآباد سے دیوبند حاضر ہوکر جب بھی خدمت اقدس میں حاضری ہوئی، تو احقر نے حضرت کے مشفقانہ طرز میں کوئی فرق نہیں محسوس کیا۔

طریقۂ اصلاح

ایک بات اور یاد آگئی۔ دیوبند کے طلبہ اُس زمانہ میں سافہ باندھا کرتے تھے۔ یہ سافے، گاڑھے، گبرون یا ململ کے ہوتے تھے۔ بھاگل پوری سبز سافے خاص مقبولیت رکھتے تھے۔ احقر کے پاس ایک بنارسی سافہ تھا، جس کے پلوں پر تقریباً چھ چھ انگل سنہری کام تھا۔ ایک مرتبہ یہ سافہ باندھے ہوئے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب کی نظر زرکار پلوں پر پڑ گئی، اثنائے گفتگو میں آپ نے مسئلہ بھی بیان فرمادیا "کہ مرد کے لئے چار انگل سے زیادہ سنہری کام جائز نہیں ہے" بیان کا پیرایہ اتنا لطیف تھا کہ اس وقت احقر کو یہ احساس بھی نہیں ہوا، کہ تنبیہ اور اصلاح مقصود ہے۔ حضرت سے رخصت ہونے کے بعد غور کرتا رہا کہ اس مسئلہ کو گفتگو کے سیاق وسباق سے کیا تعلق ہے۔ بہت دیر بعد خود اپنے سافہ کا خیال آیا۔ اور پھر پلے کے کام کو ناپا تو چار انگل سے زائد تھا۔ اس کے بعد اس سافہ کے زنانہ کپڑے بنوا دیئے گئے۔

طلبہ کے ساتھ لطف و کرم کی یہ چند مثالیں ہیں، جن کا تجربہ خود احقر کو ہوا۔ ع "قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"

تلامذہ دار العلوم کے تقریباً ۱۸ سالہ قیام میں کم از کم دو ہزار طلبہ حضرت شاہ صاحب سے بلاواسطہ مستفیض ہوئے۔ اُن کی مکمل فہرست کے لئے ایک مستقل جلد درکار ہے۔ بہت سے حضرات وہ ہیں جو گمنامی کے گوشوں میں چھپ کر خاموش خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ تلامذہ، جن کی خدمات نے شہرت حاصل کرلی، انہیں کے نام یہاں بھی درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) مولانا فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد۔ (آپ نے دورۂ حدیث شریف حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب سے پڑھا ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحب سے بھی آپ نے اتنا استفادہ کیا ہے کہ آپ تلامذہ کے زمرہ میں سب سے پہلے نمبر پر شمار کئے جاتے ہیں۔

(۲) مولانا حفظ الرحمن صاحب۔ ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند۔

(۳) مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند۔

(۴) مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب بانی و ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین (دہلی)

(۵) مولانا حبیب الرحمن صاحب شیخ الحدیث (مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ)

(۶) مولانا محمد بن موسیٰ، سملکی۔ بانی مجلس علمی۔

(۷) مولانا بدر عالم صاحب مؤلف فیض الباری وغیرہ، نزیل مدینہ منورہ۔

(۸) مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی۔ سابق صدر دینیات، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد (دکن)۔

(۹) مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ صدر جامعہ اشرفیہ، لاہور
(۱۰) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، سابق مفتی دار العلوم دیوبند۔
(۱۱) مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی، مؤلف انوار المحمود۔
(۱۲) مولانا قاضی سجاد حسین صاحب، صدر مدرس مدرسہ فتحپوری، دھلی۔
(۱۳) مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، پرنسپل مدرسہ عالیہ، کلکتہ۔
(۱۴) مولانا محمد یوسف صاحب بنوری۔
(۱۵) مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈوی، مدرس مدرسہ حسین بخش، دھلی۔
(۱۶) مولانا محمد چراغ صاحب (گوجرانوالہ)
(۱۷) مولانا احسان اللہ خاں صاحب تاجور مرحوم۔
(۱۸) مولانا مصطفے حسن صاحب علوی (پروفیسر یونیورسٹی لکھنؤ۔
(۱۹) مولانا میرک شاہ صاحب کشمیری۔
(۲۰) مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی۔
(۲۱) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی۔
(۲۲) مولانا حمید الدین صاحب فیض آبادی، شیخ الحدیث مدرسہ کلکتہ۔
(۲۳) مولانا محمود احمد صاحب نانوتوی، مفتی مدھیہ بھارت (مہو کینٹ)
(۲۴) مولانا حامد الانصاری صاحب غازی، سابق مدیر مدینہ بجنور و جمہوریت بمبئی وغیرہ
(۲۵) مولانا منظور احمد صاحب نعمانی (مدیر الفرقان)
(۲۶) مولانا سلطان محمود صاحب سرحدی۔
(۲۷) مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی۔

(۲۸) مولانا محمد تقی صاحب دیوبندی۔

(۲۹) مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی۔

(۳۰) قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی۔

(۳۱) مولانا محمد صاحب انوری، لائل پوری۔

(۳۲) مولانا غلام غوث صاحب سرحدی۔

(۳۳) مولانا عبد الرحمٰن صاحب کامل پوری۔

(۳۴) مولانا شائق احمد صاحب عثمانی، ایڈیٹر عصر جدید، کراچی۔

(۳۵) مولانا قاری اصغر علی صاحب مدرس دار العلوم دیوبند۔

(۳۶) مولانا عبد الحق صاحب نافع سابق استاذ دار العلوم۔

(۳۷) مولانا عبد الوہاب صاحب مہتمم مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام

(۳۸) مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس " " "

(۳۹) مولانا فیض اللہ صاحب مفتی مدرسہ معین الاسلام " "

(۴۰) مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی مرحوم۔

(۴۱) مولانا محمد یوسف صاحب سابق میر واعظ کشمیر۔

(۴۲) احقر محمد میاں دیوبندی۔

(۴۳) مولانا سید اختر حسین صاحب مدرس دار العلوم دیوبند۔

(۴۴) مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی۔

(۴۵) مولانا فیوض الرحمٰن صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور۔

(۴۶) مولانا عبد الحنان صاحب ہزاروی۔

حضرت شاہ صاحبؒ سے دو ملاقاتیں

(پروفیسر) سیّد ابو ظفر ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ودّیا سبھا
(احمد آباد)

حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب محدث کشمیری دیوبند سے میری پہلی ملاقات جامع مسجد احمد آباد میں اُس وقت ہوئی، جب مولانا حسین احمد صاحب مدنی احمد آباد کے سابرمتی جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب بھی تھے۔ دونوں حضرات کو (یاد آتا ہے) قصبہ انند میں کسی تبلیغی ضرورت سے دعوت دی گئی تھی۔ اور وہاں سے فارغ ہو کر، احمد آباد تشریف لائے۔

جامع مسجد میں پہلے مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے کچھ تقریر کی۔ اور پھر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کا بیان ہوا۔ جس کو عوام نے بہت پسند کیا۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کچھ نہ بولے۔

خاکسار اُس وقت عربی، مصری لباس میں تھا، جو جاذبِ نظر تھا، اور جناب شاہ صاحب سے قریب تر، اس لئے حضرت شاہ صاحب نے مجھ ہی سے تخاطب کی ابتداء کی۔ میرا نام اور کام پوچھکر خاموش ہو گئے۔ پھر خاکسار نے کچھ باتیں دریافت کیں، جن کا جواب دے کر حضرت موصوف پھر خاموش ہو گئے اور

مجھے افسوس ہے کہ وہ باتیں اب مجھے یاد نہیں رہیں۔

اس زمانہ میں جمعیۃ العلماء کا ناظم بندہ تھا، اور خلافت آفس میں اِس کا بھی دفتر تھا، سہ پہر کو کالج سے آکر ایسی جگہ شام تک جمعیۃ کا کام انجام دیتا تھا۔

جامع مسجد میں حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کے دوسرے دن جب جمعیۃ کے دفتر پہنچا، تو حضرت شاہ صاحب کو دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھا دیکھا خاکسار بھی پاس ہی جا بیٹھا، سلام مسنون اور مصافحہ کے بعد میری خیریت دریافت کی، اور پوچھا کہ کالج میں آپ کیا پڑھاتے ہیں؟ عرض کیا کہ عربی، فارسی اور اُردو، پوچھا کہ فارسی کی کون کتاب؟ جواب دیا کہ دیوانِ حافظ، ایف، اے کو، اور شاہنامہ فردوسی، بی، اے، کو، ارشاد ہوا کہ شاہ نامہ کا کونسا حصّہ؟ عرض پرداز ہوا کہ سہراب اور رستم کا بیان۔ حضرت شاہ صاحب اس کے بعد خاموش ہو گئے۔ اور میں منتظر رہا کہ شاید کچھ اور ارشاد فرمائیں گے۔ لیکن جب دیر تک سکوت رہا۔ تو خاکسار نے خود ہی ابتداء کی، اور مختلف مسائل پر گفتگو کی، اور اُس وقت آنجناب کی علمی قابلیت کا صحیح اندازہ تھوڑا بہت ہوا۔ اور میرے دل میں اُسی دن سے آپ کی وقعت پیدا ہو گئی۔

میں جب رنگون میں تھا، تو نوجوانوں نے "مجمع الاحباب" نامی ایک انجمن قائم کی اور اس کے ماتحت ایک تبلیغی کمیٹی قائم کی۔ خاکسار اُس کا صدر تھا۔ اس کمیٹی نے رنگون سے متصل "جوگاؤں" بستی میں ایک عربی مدرسہ تبلیغیہ، کی بنیاد رکھی تاکہ مبلغین پیدا کئے جائیں۔ چھٹا درجہ پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے کچھ طلبہ دیوبند، مدرسہ امینیہ دہلی اور ندوہ بھیجے گئے، خاکسار ان دنوں رنگون سے واپس آکر احمد آباد کے کہاودیالے میں

فارسی، عربی کا پروفیسر تھا۔ سال میں دو دفعہ طویل چھٹیوں میں وطن جایا کرتا۔ دھلی راستہ میں ہونے کے باعث میرے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ دہلی اور دیوبند، میں قیام کرکے رنگونی طلبہ کی علمی حالت کی رپورٹ بھیجا کروں۔

اسی سلسلہ میں ایک دفعہ دیوبند جانا ہوا۔ مولوی جعفر رنگونی کے یہاں قیام کیا طلبہ کے اخلاقی اور علمی معلومات حاصل کئے، اور اُن کی ضرورتوں کو بھی رپورٹ میں شامل کرلیا۔ فرائض منصبی سے فارغ ہونے کے بعد بغرض تفریح باہر نکلا، نماز عصر، مسجد میں ادا کرکے باہر سائبان میں ایک طالب علم سے باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے میرے مونڈھے پر ہاتھ رکھا، اور السلام علیک کی شریلی آواز کان میں گونجی، آواز آشنا معلوم ہوئی، پھر کر دیکھا تو ایک فرشتہ صورت وسیرت مسکراتا ہوا کھڑا تھا۔ میں ادب سے کھڑا ہوگیا، اور سلام کے بعد مزاج پرسی کی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا، کہ احمد آباد سے آپ کب آئے ؟ عرض کیا کہ آج ہی حاضر ہوا، ارشاد ہوا کہ آپ کہاں ٹھیرے ہیں ؟ میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ یہ سُنکر محوِ حیرت ہوگیا، میری اور حضرت کی مُلاقات احمد آباد میں ایک سرسری ملاقات تھی۔ کوئی گہری مُلاقات نہ تھی، جو اپنے دولت کدہ پر قیام کی دعوت دیتے، اور پھر حافظہ کا یہ عالم کہ برسوں کے بعد یہ ملاقات ہوئی تھی، اور مجھے بھولے نہیں اور دیکھتے ہی شناخت کرلیا، بیشک! حافظ حدیث کا حافظہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ چند منٹ کے بعد مجھے سُکون ہوا، تو سر سے قدم تک میں نے ایک نظر دیکھا، سفید ریش، بڑی بڑی آنکھیں، نکلتا قد، کیا کہوں آپ سے ؟ بس دل میں کھُپ گئے، اور تاریخوں میں صحابہ کے جو حالات پڑھے تھے اُس کا ایک نمونہ سامنے کھڑا نظر آیا، پھر کمال اخلاق سے کھڑے کھڑے تھوڑی دیر تک باتیں

کرتے رہے، اُس دن سے میرے دل میں آپ کی عظمت کا جو سکہ بیٹھا، اس کا اثر آج تک ہے۔ اسی اخلاق حمیدہ نے میرے لئے آئندہ ملاقات کا دروازہ کھول دیا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مجھ سے مضمون لکھنے کی جو فرمائش کی ہے اُس سے میں فائدہ اُٹھاؤں۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق اپنے تاثرات کو تفصیل سے بیان کروں۔ مگر یہ مختصر تحریر میں تکلیف دہ علالت کی حالت میں لکھ رہا ہوں، میرے لئے بصورت موجودہ ممکن نہیں کہ طویل مضمون لکھ سکوں بسر دست ان ملاقاتوں کے ذکر پر اپنا سلسلۂ گفتگو ختم کرتا ہوں +

حضرت الاستاذ محدّث کشمیریؒ

(از جناب مولانا محمّد صاحب انوری از لائل پور)

الحمد للّٰہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔

حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی شاہجہان پوری کا ایک رسالہ "روض الریاحین" ہے جو عربی فصاحت وبلاغت کا قابل قدر آئینہ اور علم وعلماء کا تذکرۂ مبارک اور مدرسہ امینیہ دہلی کی مختصر تاریخ ہے۔ یہ رسالہ حضرت مولانا امین الدین صاحب مرحوم کے ارشاد پر لکھا گیا۔ حضرت شیخ الہند قدس اللہ اسرارہم کی منقبت وفضائل میں بھی ایک طویل عربی قصیدہ اس سے ملحق ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ امینیہ کے علماء کے مناقب بیان فرماتے ہوئے لکھاہے کہ ؎

ونختم ذا الکلام بذکر حبر فقید المثل علام فرید

اب ہم ایک بڑے عالم کے ذکر پر کلام ختم کرتے ہیں۔ وہ بے نظیر علامہ یکتائے زمانہ ہیں۔

مریغ العلم مقتنص الفنون لہ کل المزایا کالمصید

وہ علم کو ڈھونڈھ نکالنے والے فنون کو شکار کرنیوالے ہیں۔ تمام فضیلتیں ان کے فتراک کا شکار ہیں۔

نبیہ فائق الاقران یدعی بانورشاہ موموق الحسود

بزرگ مرتبہ ہمسروں پر فائق جنکو انورشاہ کہہ کر پکارا جاتا ہے حاسدوں کے محبوب ہیں۔

فہذا الحبر غارس ذاالنخیل واول موقظ القوم الرقود

کیوں کہ یہ علامہ اس درخت کے لگانے والے ہیں۔ اور سوتی قوم کو اوّل اوّل جگانے والے۔

اِسی رسالہ کے صہ ۸ پر حاشیہ کی شکل میں اپنے قلم سے حضرت مفتی صاحب نے حضرت شاہ صاحب رح کے حالات لکھے ہیں :-

"علامہ فہامہ جناب مولنا مولوی سید محمد انور شاہ صاحب ساکن کشمیر رح بے نظیر شخص ہیں، ذہن و ذکاء، ورع و تقویٰ میں فرد کامل، مدرسہ ہذا میں ابتداءً مدرس اول تھے، بلکہ جیسا کہ آئندہ اشعار میں ذکر کیا گیا ہے اس شجر علم کے لگانے والے آپ ہیں، کیوں کہ مولنا محمد امین الدین صاحب جب دہلی تشریف لائے اور مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا تو اُس وقت ان کے پاس نہ سامان تھا نہ روپیہ آپ نے محض متوکلاً علی اللہ سُنہری مسجد میں پڑھانا شروع کیا، مولنا مولوی محمد انور شاہ صاحب آپ کے شریک تھے، دونوں صاحبوں نے طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھائیں، فاقے کئے، مگر استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آہستہ آہستہ اہلِ دہلی کو خبر ہوئی اور لوگ متوجہ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مدرسہ اس حالت کو پہونچا جو آپ کی نظر کے سامنے ہے۔ غرض کہ ابتدائی زمانہ کی کس مپرسی کی حالت میں مولنا مولوی محمد انور شاہ صاحب اس مدرسہ کے اعلیٰ و اوّل محسن ہیں۔ اُن کا شکریہ ادا کرنا اور ہمیشہ ان کو یاد رکھنا اہل مدرسہ پر فرض ہے، مولنا نے ایک عرصہ تک مدرسہ ہذا میں درس دیا، اور طلبہ کو مستفید فرمایا۔ پھر والدین سلمہا اللہ تعالیٰ کے تقاضے اور اصرار سے وطن تشریف لے گئے، ۱۳۲۵ھ میں حج کو تشریف لے گئے۔ واپسی پر دہلی میں دو ماہ قیام فرمایا، اور اب بھی وطن میں تشریف رکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ مولنا کو تادیر سلامت رکھے، اور اُن کے بے نظیر علمی کمال سے لوگوں کو فائدہ پہونچائے"۔ آمین!

حضرت رائپوری مدظلہ، نے فرمایا کہ جن ایام میں حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی

خدمت میں مدرسہ امینیہ میں پڑھتا تھا حضرت شاہ صاحبؒ ڈیڑھ پیسہ کی روٹی منگا کر کھایا کرتے تھے، سارا دن درس متعدّد علوم وفنون کا دیتے، دوپہر کو شدت گرما جون اور جولائی کے مہینے میں کتب بینی فرماتے جبکہ ہر شخص دوپہر کی نیند کے مزے لیتا ہوتا تھا۔ موسم سرما میں دیکھا گیا ہے کہ بعد نماز عشاء صبح صادق تک مطالعہ فرما رہے ہیں اور اوپر کی رضائی کہیں سے کہیں پڑی ہوئی ہے، مغرب سے عشاء تک ذکر و مراقبہ میں مشغول رہتے۔

آہ! اب حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی بھی نور اللہ مرقدہم ہو چکے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

بگذر از یاد گل و گلبن کہ ہیچم یاد نیست
در زمین و آسماں جز نام حق آباد نیست

بر روانِ رہ رواں ہم رحمتی بفرستہ باش
حسن بے بنیاد باشد عشق بی بنیاد نیست

شرح حال خود نمودن شکوۂ تقدیر نیست
نالہ بر سنت نمودن نوحہ و فریاد نیست

(مرثیہ حضرت شیخ الہندؒ)

میر تقی میر کہتے ہیں ؎

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یک بارگی

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

سحر گوشِ گل میں کہا میں نے جا کر
کھلے بند مرغِ چمن سے ملا کر

لگا کہنے فرصت ہے یاں اک تبسم
سو وہ بھی گریباں میں منہ کو چھپا کر

(میر)

ہر آنچہ زاد بناچار بایدش نوشید　　زجام دہر مئے کُلّ من علیہا فان

حضرت خواجہ عزیزالحسن مجذوبؒ فرماتے ہیں ؎

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی

کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

حالِ دُنیا را بہ پُرسیدم من از فرزانۂ　　گفت یا خواب است یا باد است یا افسانۂ

باز پرسیدم بحالِ آنکہ در وے دل ببست　　گفت یا غول است یا دیوے ست یا دیوانۂ

موت العالِم موت العالَم حضرت مفتی صاحب کا وصال فرد واحد کا مرنا نہیں ہے بلکہ ایک قوم کی موت ہے ؎

وما کان قیس ھلکہ ھلکُ واحدٍ

ولکنّہ بنیانُ قومٍ تہدّما

عالم میں بہت سے ایسے نفوس قدسیہ ہوتے ہیں جن کی زندگی مرکز ثقل کا حکم رکھتی ہے، اُن کا عالم بقا کو کوچ ستون کا مرکز ثقل سے ہل جانا ہے۔ تدریس حدیث وافتا وارشاد وتلقین ہی یتیم نہیں ہوئے، بلکہ سیاست کا بہت بڑا امام، معاشرت کا عظیم الشان حکیم، رخصت ہوا۔ حضرت مولٰنا عبدالقادر صاحب رائپوری مدظلہ العالی نے فرمایا، ابھی ابھی لائل پور میں کسی نے سوال کیا کہ صاحبِ حکمت کون لوگ ہوتے ہیں؟ فرمایا:۔ مثلاً "حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب"۔ اس کے ایک ہفتہ بعد وصال کی خبر شائع ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون[۱] ؎

کفایت اِلٰہ استاذ افاضل　　کہ چشم جہان مثل او دیدہ است

---

[۱] یہ حضرت شیخ الہندرحہ کا شعر ہے مولٰنا غلام رسول مرحوم کے مرثیہ میں ہم نے نام بدل دیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب سے ہمارے شاہ صاحب قدس سرہٗ کو بہت تعلق اور شغف تھا
بھاولپور کے مقدمہ پہ جب حضرت تشریف لے گئے، احقر بھی ہمراہ تھا۔ لاہور پہنچکر
فرمایا، مولٰنا کفایت اللہ صاحب ملتان جیل میں ہیں اُن سے ملکر آگے جانے کا خیال
ہے۔ چنانچہ ملتان کا ٹکٹ لیا گیا۔ اسٹیشن پر خدام کا مجمع استقبال کے لئے موجود تھا
شہر میں تشریف لیجاتے ہی تقاضا فرمایا کہ ہمیں سنٹرل جیل، مولٰنا سے ملاقات کرنا ہے
مجلس احرار کے کارکنوں نے اجازت حاصل کرنے کا انتظام کیا، احقر کو بھی ساتھ لیا۔
جیل تشریف لے گئے۔ حضرت مفتی صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ
ملاقات کے لئے تشریف لائے ہیں، گویا عید ہوگئی، اپنی کوٹھری سے ملاقات کے
کمرے میں تشریف لائے، معانقہ مصافحہ ہوا، دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ بار بار
حضرت سے خیریت دریافت کرتے تھے، بڑی ہی مسرت کا اظہار فرمایا، احقر سے بار
بار پیار فرماتے۔ پھر مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، مولٰنا قاری عبدالرحمٰن مرحوم
مولٰنا احمد سعید صاحب دہلوی، مولٰنا عبدالحلیم صاحب صدیقی، مولٰنا داؤد غزنوی۔
مظہر علی اظہر، چودھری افضل حق صاحبان یہ سب حضرات بھی چوں کہ اسی جیل میں نظربند
تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی زیارت کے لئے جمع ہوگئے عجیب مجلس تھی۔ مولٰنا
داؤد صاحب غزنوی نے حضرت مفتی صاحب مرحوم کی وساطت سے حضرت شاہ صاحبؒ
سے عرض کیا کہ وہ مفردات القرآن علامہ راغب اصبہانی کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہتے
ہیں، حضرت بہت خوش ہوئے اور مولٰنا کے دریافت کرنے پر بہت سی کتب کے
نام نوٹ کروادیئے جن سے امداد لی جاسکے۔ زمانہ جیل میں علمی و دینی خدمات تحریری
کے متعلق سب حضرات سے فرداً فرداً بھی گفتگو فرماتے رہے، ڈیڑھ گھنٹہ ملاقات رہی

آخر میں فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ تعالے کو حکومت نے جب جیل بھیجا تو آپ سے دریافت کیا کہ شاگردوں میں کون صاحب زیادہ محبوب ہیں؟ آپ نے حافظ ابن قیم رح کا نام لیا، ان کو بھی ساتھ ہی نظر بند کر دیا گیا۔ پوچھا گیا، کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہیے۔ آپ نے کاغذ، قلم، دوات طلب کی، یہ سامان دیدیا گیا، آپ نے لکھ لکھ کر سب کاغذات پُر کر دیئے، اس کے بعد جیل کی دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا۔ یہ حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب مرحوم اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی طرف اشارہ تھا کہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ ان کے محبوب شاگرد کو بھی نظر بند کیا گیا۔ حضرت مفتی صاحب جمعیۃ علماء ہند کی مجلس منتظمہ کا کوئی اجلاس کامیاب نہیں سمجھتے تھے جس میں حضرت شاہ صاحب رح کی شمولیت نہ ہو، اکثر مشاورت کے لئے خود دیوبند تشریف لاتے یا حضرت کو تار دے کر دہلی بُلاتے۔ رسالہ فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب جب مطبع قاسمی والوں نے جلد طبع کر کے نہ دیا تو کاپیاں احقر اور مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈوی کے ہاتھ حضرت مفتی صاحب کے پاس دہلی بھیجیں تاکہ اپنی نگرانی میں طبع کرا دیں۔

حضرت مفتی صاحب اکثر علمی تحقیقات حضرت شاہ صاحب رح کی خدمت میں پیش فرماتے رہتے تھے۔

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ العزیز فرمایا کرتے تھے حضرت مولانا انور شاہ صاحب حقانیت اسلام کی زندہ حجۃ ہیں، ان کا اسلام میں وجود دینِ اسلام کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ فرماتے تھے، مولانا انور شاہ صاحب کے ایک ایک فقرے پر ایک ایک رسالہ تصنیف کیا جا سکتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب رح سے

میں نے اِس قدر استفادہ کیا ہے کہ میرے قلب میں اُن کا احترام اسی طرح ہے جیسا کہ اپنے اساتذہ کا، گو میں نے اُن کی باقاعدہ شاگردی نہیں کی۔

شوال ۱۳۳۵ھ میں جب احقر دورۂ حدیث میں شامل ہونے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں حاضر ہوا تو سامان دارالعلوم کے حجرہ میں رکھتے ہی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ کی زیارت کے لئے حضرت کے آستانہ پر حاضر ہوا، دیکھا کہ علماء و صلحاء کا عظیم اجتماع ہے گرمی کا وقت ہے، ایک بزرگ چھت کے پنکھے کا رسّہ کھینچ رہے ہیں اور نرم نرم مترنم آواز میں فرماتے ہیں، بھائی بیٹھ جاؤ حضرت کے اِردگرد بھیڑ نہ کرو، ہَوا لگنے دو۔ وہ بزرگ حضرت شاہ صاحب قدس سرّہ تھے۔ بعد عصر حضرت شیخ الہندؒ کی سہ دری کے سامنے چارپائی بچھائی جاتی، چاروں طرف کرسیاں رکھی جاتیں، چارپائیاں بچھ جاتیں علماء و صلحاء و طلبہ دارالعلوم بقصد زیارت جمع ہو جاتے۔ حضرت شاہ صاحب بھی دبے پاؤں آکر دور بیٹھ جاتے، حضرت کی جب نظر پڑتی تو اپنے پاس والی کرسی پر بٹھاتے حضرت شیخ الہندؒ جب مسائل بیان فرمانے لگتے۔ سبحان اللہ علوم و معارف کا بحرِ زخّار موجیں مارنے لگتا۔ کبھی کسی مسئلہ پر فرماتے، بھئی اس کے متعلق مولوی انور شاہ صاحب سے پوچھنا چاہیئے، کیوں شاہ صاحب یہ مسئلہ یوں ہی ہے؟ عرض کرتے، ہاں حضرت فلاں محقق نے یوں ہی لکھا ہے۔ مالٹا سے جب حضرت واپس تشریف لائے تو نصاریٰ سے ترکِ موالات کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔ قرار پایا کہ حضرت شاہ صاحب سے یہ مسئلہ تحریر کرایا جائے۔ حضرت نے فتویٰ لکھا اور حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہو کر نہایت ادب سے بیٹھ کر سُنایا۔ احقر نے دیکھا کہ صرف دس سطور تھیں لیکن ایسا جامع مانع کہ حضرت شیخ الہندؒ نہایت محظوظ ہوئے۔ احقر کے والد ماجد مرحوم چوں کہ

اُس روز زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے تھے، اِس لئے احقر بھی وہاں حاضر تھا۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی۔ بس یہ حضرات حاضر تھے۔

جس روز احقر دیوبند حاضر ہوا تو حضرت شیخ الہند رح کی دعوت مع خدام زائرین، حضرت شاہ صاحب رح کے ہاں تھی، بعد نماز مغرب تین صد سے زائد مہمان حضرت کی معیّت میں نودرہ کی چھت پر تشریف فرما ہوئے۔ عجیب انوار و برکات کا نزول ہو رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحب وجد کے عالم میں تھے، کھانے سے فراغت کے بعد حضرت دیر تک تشریف فرما رہے۔

ایک دفعہ احقر حضرت شیخ الہند رح کی خدمت میں حاضر تھا، دن کے دس۱۰ بجے ہوں گے، بارش ہو رہی تھی، فرمانے لگے، بھائی مولوی محمد حسن صاحب! شاہ صاحب کے ہاں چلنا ہے آج انہوں نے ہمیں مہمانوں سمیت مدعو کیا ہے حکیم صاحب فرمانے لگے، حضرت بارش تو ہو رہی ہے، کھانا یہیں منگا لیا جائے گا۔ فرمایا، نہیں بھائی میرے ایک مخلص نے دعوت کی ہے، وہیں جاؤں گا۔ چنانچہ بارش ہی میں چل دئے راستے میں سامنے سے شاہ صاحب تشریف لا رہے تھے، عرض بھی کی کہ کھانا، درِ دولت پر پہنچا دیا جائے۔ فرمایا، کچھ تکلیف نہیں، آپ کے گھر پر کھانا کھائیں گے۔

احقر ایک دفعہ ہوشیارپور میں مولانا گرامی سے ملنے گیا (۱۹۲۵ء میں احقر ۶ ماہ ہوشیارپور میں ایک عربی مدرسہ میں مدرس رہا تھا) گرامی صاحب کہنے لگے کہ آپ نے حدیث مولانا محمود الحسن صاحب سے پڑھی یا مولانا انور شاہ صاحب سے؟ میں نے عرض کیا، حدیث تو شاہ صاحب مدظلہٗ ہی سے پڑھی ہے، ہاں بیعت

حضرت شیخ الہندؒ کے دستِ مبارک پر کی ہوئی ہے۔ خوش ہوئے، دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر فرمانے لگے، میں نے شاہ صاحب کی شان میں بہت سے اشعار کہے ہیں، ایک شعر یہ ہے ؎

چہ فصاحت چہ بلاغت چہ معانی چہ بیاں
جلوہ فرمائے در آغوشِ زبانِ (انو ر)

اسی شعر کو جھوم جھوم کر بار بار پڑھتے گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا مرثیہ بھی سنایا ؎

خضر از خویش شد و مرگ تمنّامی کرد	ماتم عاشق دل زندہ تماشا دارد
نالہ بر خورد بگوشم کہ مسیحامی کرد	از کجا تا بکجا ماتم شیخ الہند است

حضرت مولٰنا سیدنا شاہ عبدالقادر رائپوری دام ظلہم العالی فرماتے تھے کہ کچھ دنوں میں نے بھی حضرت شاہ صاحب سے پڑھا ہے ابھی میں سنہری مسجد میں، مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل نہ ہوا تھا دوسری درسگاہوں میں پڑھتا تھا، پتہ چلا کہ حضرت مولٰنا کریم بخش صاحب مرحوم لدھیانوی (جو مدرسہ عربیہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں تیس سال مدرس اول رہے، ہر فن میں کمال تھا خصوصاً علم ہیئت اور ریاضی کے تو امام تھے) گلاؤٹھی سے حضرت شاہ صاحب کے پاس آئے ہوئے ہیں، میں ملاقات کے لئے مسجد سنہری میں گیا، دیکھا ایک حجرے میں دروازہ بند کر کے اندھیرے میں حضرت شاہ صاحب ذکر دو ضربی جہر کے ساتھ کر رہے ہیں اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ، دیر تک اسم ذات کا ذکر کرتے رہے۔ اُس وقت عمر شریف اکیس بائیس سال کی ہوگی فرمایا، جب حضرت شاہ صاحب رح بازار نکلتے، تو سر پر رومال ڈال کر آنکھوں کے سامنے پردہ کر کے نکلتے مبادا کسی عورت پر نظر پڑ جائے۔ فرمایا، میں نے

ملاحسن، میبذی حضرت سے پڑھی ہیں۔ جب تقریر کرتے تو کہیں سے کہیں، نکل جاتے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری عمر فلسفہ اور منطق ہی کی تحقیق میں صرف کردی ہے۔ حضرت شاہ صاحب بھاول پور کے سفر میں احقر سے فرماتے تھے مولنٰنا عبدالقادر جو حضرت رائپوری کے خلیفہ ہیں، ترمذی شریف مجھ سے پڑھا کرتے تھے۔

حضرت مولنٰنا عبدالقادر دام ظلہٗ فرماتے ہیں کہ واقعی حضرت شاہ صاحب آیۃ من آیات اللہ تھے۔ فرمایا، میں تو غیر مقلد ہو گیا تھا حضرت شاہ صاحب کی برکت سے حنفی مذہب پر استقامت نصیب ہوئی۔ فرمایا، ایک مشہور اہلحدیث عالم سے حضرت شاہ صاحبؒ کا مناظرہ ہوا، غالباً گلاؤٹھی ہی کا واقعہ ہے حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولنٰنا خلیل احمد سہارنپوری اور دیگر بزرگانِ دین جمع تھے۔ حضرت نے اُن سے دریافت فرمایا، کہ آپ کو محدّث ہونے کا دعویٰ ہے صحیح بخاری کی وہ طویل حدیث جس میں ہرقل اور ابوسفیان کا مکالمہ مذکور ہے جتنے طرق سے امام نے نقل کی ہے سُنادو، وہ بیچارے سُنا نہ سکے، کہنے لگے، کہ آپ ہی سُنادو، تو شاہ صاحبؒ نے ساری حدیث سُنادی، بلکہ دُور تک پہنچ گئے حتیٰ کہ نصف پارہ تک پہنچ گئے۔ وہ صاحب فرماتے ہیں کہ بس کافی ہے۔

حضرت مولنٰنا احمد خاں صاحبؒ کندیاں ضلع میانوالی کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ حضرت مولنٰنا احمد خاں صاحبؒ قصبہ سلیم پور ضلع لدھیانہ تشریف لائے، احقر کو پتہ چلا، زیارت کے لئے حاضر ہوا، مولنٰنا عبداللہ سلمہٗ کے مکان پر قیام تھا، مولنٰنا عبداللہ صاحب اور مولنٰنا عبدالغنی صاحب مفتی مالیر کوٹلہ مرحوم نے تعارف کرایا، اور مولنٰنا عبداللہ صاحب نے یہ بھی کہا کہ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کا خادم

سے ہے اور حضرت بھی اس پر خاص نظرِ عنایت رکھتے تھے، اور میں نے بھی اُن سے کچھ پڑھا ہے میرے استاذ ہیں، حضرت مولاناؒ نے بہت ہی شفقت فرمائی، آدھی رات تک گفت گو فرماتے رہے، حضرت شاہ صاحب کا بھی ذکر شروع رہا۔ دوسرے روز پھر بعد نماز فجر احقر سے حضرت ہی کا تذکرہ فرماتے رہے۔ فرمایا کہ جب مولانا حسین علی صاحب نے حضرت شاہ صاحب کو میانوالی جلسہ پر مدعو کیا، حضرت تشریف لائے نہایت بصیرت افروز تقریر فرمائی، میں بھی حاضر ہوا، مجمع کثیر تھا ہزارہا مخلوقِ خدا جمع تھی۔ سینکڑوں علماء زیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے، میں نے کندیاں کا عرض کیا۔ درخواست قبول فرماکر میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا۔ میں نے اپنے کتب خانہ کی سیر کرائی، نہایت مسرور ہوئے۔ میں نے سب لوگوں کو کمرہ سے باہر بٹھا دیا، اور حضرت کئی گھنٹے مختلف کتب کا مطالعہ فرماتے رہے اور "نوادر الاصول" حکیم ترمذی کی نکالکر فرمایا کہ یہ کتاب مستعار دیوبند لیجانے کے لئے عنایت کریں، دو ماہ تک واپس ارسال کردی جائے گی۔ کندیاں میں علماء نے حضرت سے علمی استفادے کئے۔ لیکن میں حضرت کی میزبانی میں مصروفیت کے باعث استفادہ سے محروم رہا، اس کا افسوس رہا فرمایا، کہ ایک صاحب نے حاضرین میں سے عرض کیا مولانا نے مسئلہ خضاب پر ایک تحقیقی تحریر لکھی ہے، حضرت نے مجھے فرمایا کہ سُنا ہے کہ آپ نے کوئی تحقیق، خضاب پر فرمائی ہے، میں نے لاکر پیش کی، غور سے ملاحظہ فرماتے رہے لیکن زبانِ مُبارک سے کچھ نہ فرمایا۔

فرمایا، کہ حضرت شاہ صاحب کاملین میں سے تھے، آپ کے وصال سے علماء یتیم ہوگئے، طلبہ کو تو حدیث پڑھنے کے لئے اساتذہ مل سکتے ہیں۔ لیکن علماء کی پیاس

کون بجھائے گا۔ غرض کئی گھنٹے حضرت مرحوم حضرت شاہ صاحب ہی کا ذکر خیر فرماتے رہے۔

حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ والی بھچران ضلع میانوالی خدام الدین لاہور کے جلسہ پر تشریف لائے، چونکہ حضرات علماء دیوبند کثر اللہ سوادہم بھی تشریف فرما تھے حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم مرحوم، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم وغیرہم سب ایک مکان میں قیام پذیر تھے۔ حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ ملاقات کے لئے تشریف لائے، دو گھنٹے تک ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت شاہ صاحبؒ سے ملاقات کر کے بہت متأثر ہوئے، اپنے شاگردوں کو حدیث کا درس دے کر کتب حدیث ختم کرانے کے بعد فرمایا کرتے، اگر فن حدیث میں بصیرت حاصل کرنے کی آرزو ہے تو حضرت شاہ صاحب کے پاس جاؤ دیوبند، پھر ڈابھیل طلبہ کو اہتمام سے بھیجتے۔ احقر پر بڑی شفقت فرمایا کرتے۔ اکثر فرمایا کرتے کہ مولانا انور شاہ صاحب بڑے محدث ہیں۔

حضرت مولانا خود بھی بلند پایہ بزرگ علامہ محدث اور مفسّر تھے، ترجمۃ القرآن کا درس مشہور تھا علماء دُور دُور سے آپ کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتے۔ حضرت خواجہ محمد عثمان موسیٰ زئی شریف کے اجلہ خلفاء میں سے تھے، حضرت شاہ صاحب سے فرمانے لگے، مولانا سراج احمد حضرت کے صاحبزادہ صاحب نے احادیث مبسوط سرخسیؒ کی تخریج کی ہے کچھ حصّہ مکمل فرمالیا ہے، حضرت نے فرمایا، بدائع کی تخریج فرماتے تو بہت اچھا ہوتا۔ مولانا حسین علیؒ

ﻋﮧ یہ بزرگ بہت بڑے علامہ محدث مفسر عارف باللہ تھے سلسلہ ارشاد و تلقین بہت وسیع تھا مجددی سلسلہ میں بیعت لیتے تھے، نہایت بلند پایہ اخلاق کے مالک تھے، رئیس تھے، کتب خانہ عظیم الشان فراہم فرمایا تھا، نظیف اور نہایت ذکی تھے، قدس سرہ العزیز ۱۲

حضرت عالی مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز کے شاگرد رشید تھے۔ ۱۳۰۳ھ میں حدیث، گنگوہ حاضر ہو کر پڑھی، خود اپنی زبانِ مبارک سے فرماتے تھے معقولات رام پور میں پڑھیں فنا فی التوحید تھے۔ طحاوی شریف کی تلخیص لکھی ہے، طبع ہو چکی ہے۔

عارف باللہ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرق پوری نے جب حضرت شاہ صاحب کا نام اور شہرت سنی دعاء فرمایا کرتے کہ زندگی میں شاہ صاحب کی زیارت ہو جائے۔ ایک دفعہ لاہور حضرت کی تشریف آوری سن لی، کار بھیجکر دعوت دی، حضرت نے پہلے تو انکار فرما دیا۔ لیکن مولانا احمد علی صاحب دام ظلہ کے اصرار پر منظور فرمالیا، شرق پور پہنچے اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرق پور کو مشرف فرمایا، حضرت میاں صاحب بہت ہی ممنون ہوئے حضرت کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھے کہ آپ نائب رسول ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ جناب کے چہرۂ مبارک پُر انوار کو دیکھتا ہی رہوں، گفتگو فرماتے رہے اور حضرت شاہ صاحب خاموش سنتے رہے، کہیں کہیں کچھ ارشاد بھی فرماتے رہے، میاں صاحب مرحوم نے فرمایا مجھے نجات کی انشاء اللہ تعالے توقع ہو گئی ہے۔ حضرت جب واپس چلنے لگے تو برہنہ پا، پختہ سڑک تک ساتھ مشایعت کے لئے تشریف لائے، جب موٹر چلنے لگی تو پچھلے پاؤں واپس ہوئے، فرمانے لگے کہ دیوبند میں چار نوری وجود ہیں ایک ان میں سے، حضرت شاہ صاحب ہیں۔ میرے ایک مخلص دوست کہتے ہیں کہ میں نے دیوبند میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کی، حضرت شرق پور تشریف لے گئے تھے، میاں صاحب کو کیسے پایا؟ فرمایا، میاں صاحب عارف ہیں اور صحیح معنی میں عارف ہیں۔

علامہ علی مصری حنبلی صحیحین کے تقریباً حافظ تھے، مصر سے سورت آئے، وہاں سے دہلی مولوی عبدالوہاب اہلحدیث کے پاس صدر بازار میں غالباً آئے، نماز کے اوقات

کے متعلق اُن سے مناظرہ ہوگیا' مولوی عبدالوہاب صاحب نے ان کو نکلوادیا۔ بیچارے نووارد مسافر تھے پریشان تھے' سورت سے چوں کہ راندیر بھی گئے تھے اور مولانا مہدی حسن صاحب دام فیوضہم سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ مولانا نے اُن کو دیوبند حاضری کا مشورہ دیا تھا۔ دہلی میں جب پریشان پھر رہے تھے تو کسی صاحب نے اُن کو پھر دیوبند جانے کا مشورہ دیا۔ فرمانے لگے' میں دیوبند نہیں جاؤں گا' کیوں کہ اہلحدیث نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے حالانکہ حنابلہ کا مذہب اہلحدیث سے اقرب ہے' دیوبند تو حنفیہ کا مرکز ہے وہاں خدا جانے کیا سلوک ہوگا۔ آخر کسی سیٹھ کے پاس اپنا نقد اور سامان امانت رکھ کر دیوبند آنے جانے کا کرایہ لے کر چلے' دیوبند مدرسہ میں ظہر کی نماز سے قبیل پہنچ گئے' نماز کی جماعت کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کی عادت تھی کہ دائیں بائیں سامنے اور پیچھے چاروں طرف طائرانہ نظر ڈال کر دیکھا کرتے تھے' کئی ایک اُمور اُن کے ذہن میں ہوتے تھے' اُن میں ایک یہ کہ کوئی نووارد ہوتا اُس کی تحقیق فرماتے۔ چنانچہ علامہ علی کو بھی دیکھا پاس گئے' حالات پوچھے۔ مہمان خانہ میں جو صحنِ مسجد کے جانب جنوب ہے لے گئے خدمت کی' علامہ خوش ہوگئے' عرب طلبہ جو اُس وقت پڑھتے تھے ملنے آئے' اس پر اُن کو مزید انبساط ہوا' وحشت اور اجنبیت دُور ہوئی۔ فرمانے لگے' یہ علماء دیوبند بہت بڑے مہمان نواز اور کریم النفس ہیں' یہ لوگ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قدم بقدم چلنے والے اور متبع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم معلوم ہوتے ہیں' میں یہاں آکر محظوظ ہوا۔ مولوی محمد یحیٰی یمنی فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یہ لوگ علوم و فنون میں بھی فائق الاقران ہیں' علامہ نے کہا یہ بات میں ماننے کو طیار نہیں" ہم اعجام یہ بے چارے تو عجمی ہیں۔ عصر کی نماز کے بعد چند عرب طلبہ اُن کو لے کر باہر سیر کیلئے

نکلے، حضرات کے مزارات کی طرف جا رہے تھے، ایک صاحب نے علامہ علیؒ کے ہاتھ میں "القاسم" کا وہ نمبر دیا جس میں شاہ صاحب کا عربی قصیدہ مرثیہ حضرت شاہ عبدالرحیم قدس سرہ العزیز درج تھا، یہ چالیس ابیات پر مشتمل ہے۔ علامہ نے دیکھا، فوراً فرمایا "اِنّی تُبْتُ من اِعْتِقَادِی" میں نے اپنے پہلے خیال سے رجوع کر لیا۔ اس قصیدہ سے زمانۂ جاہلیت کی جھلک آ رہی ہے بلیغ قصیدہ ہے، میں اس عالمِ دین کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ سے سرسری ملاقات ہوئی۔ اگلے دن صبح کے وقت حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم کے صحیح مسلم شریف کے درس میں جا بیٹھے، مولانا مرحوم نے عربی زبان میں تقریر فرمائی، علامہ علیؒ نے اعتراضات کرنا شروع کئے، مولانا جواب دیتے رہے، درس ختم ہوا، تو مولوی محمد یحییٰ صاحب یمنی سے فرمایا کہ یہ شخص بہت بڑا عالم دین ہے لیکن میری تسلّی نہ ہو سکی، اس کے بعد بخاری شریف کے درس میں حاضر ہوئے حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہم نے بھی بلیغ عربی میں تقریر فرمائی، علامہ نے کچھ سوالات کئے، حضرت جواب دیتے رہے، درس کے بعد فرمانے لگے، کہ میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور علماء زمانہ سے ملا ہوں، خود مصر میں کئی سال حدیث شریف کا درس دیا ہے۔ میں نے شام سے لیکر ہند تک اس شان کا کوئی محدّث اور عالمِ دین نہیں دیکھا، میں نے ان کو ہر طرح بند کرنے کی سعی کی، لیکن ان کے استحضارِ علوم اور تیقّظ، حفظ اور اتقان، ذکاوت اور وسعتِ نظر سے میں حیران رہ گیا۔ بالآخر علامہ نے تین ہفتہ قیام فرمایا، حضرتؒ سے استفادہ فرماتے رہے سند حدیث بھی حضرت سے حاصل کی۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے، ان کو محدثین کے علوم اور شیخین کی کتب پر نظر ہے، علامہ علی کہنے لگے،

"لَوْ حَلَفْتُ أَنَّهٗ أَعْلَمُ مِنْ أَبِیْ حَنِیْفَةَ لَمَا حَنِثْتُ" اگر میں قسم کھالیتا، کہ شاہ صاحب ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ سے زیادہ علم رکھتے ہیں تو میں حانث نہ ہوتا"
حضرت شاہ صاحبؒ کو پتہ چلا تو سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور ارشاد فرمایا ہمیں امام کے مدارکِ اجتہاد تک قطعاً رسائی نہیں ہے۔ دیوبند سے علامہ کے واپس مصر ہونے پر درسگاہ نودرہ میں عظیم الشان جلسہ ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ نے عربی میں تقریر فرمائی۔ علامہ نے بھی جوابی تقریر فرمائی، حضرات دیوبند کے مکارمِ اخلاق، مہمان نوازی، تقویٰ وطہارت، بالخصوص علوم نبوی کی اشاعت وخدمت پر اپنے تأثرات کا اظہار فرمایا۔ نیز یہ کہ اگر میں دارالعلوم دیوبند میں حاضر نہ ہوتا ان فیوض وبرکات سے محروم جاتا، جو مجھے یہاں حاضری پر نصیب ہوئے، فرمایا، میں چوں کہ حنبلی مذہب سے تعلق رکھتا ہوں اور حدیث لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ (نماز کی فضیلت کے حصول کے لئے تین مساجد کے علاوہ سفر نہ کرو) کے پیش نظر مجھے خوف تھا کہ اگر قیامت میں سوال ہوا کہ تم نے یہ سفر کیوں کیا، تو میرے پاس کوئی جواب نہیں، لیکن اب بفضلہ تعالیٰ امید قوی ہے کہ یہ میرا سفر عبادت میں گنا جائے گا کہ میں نے ایسی مقدس درسگاہ کی زیارت کی اور مولانا محمد انور شاہ جیسے محدث اور بزرگانِ دین کے علوم سے فیضیاب ہونے کا شرف حاصل کیا۔ واپسی پر راندیر مولانا مفتی مہدی حسن صاحب دام ظلہٗ سے پھر ملاقات ہوئی تمام واقعات وحالات سنائے فرمانے لگے کہ مولانا انور شاہ صاحب اتنے بڑے امام وقت ہونے کے باوجود مقلد ابی حنیفہؒ ہیں۔ مولانا نے فرمایا، اس سے ہی ابی حنیفہؒ کے علوم کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مصر پہنچکر علامہ نے "المنار" میں اپنے اس سفرنامہ کو ذکر فرمایا، اور علماءِ دیوبند کے کمالات علمی اور عملی پر

ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا۔

حضرت تھانوی رح لکھتے ہیں کہ قاری مولوی محمد طیب صاحب سلمہ اللہ تعالے نے ذکر کیا، حضرت شاہ صاحب ایک روز فرمانے لگے کہ "تفسیر بیان القرآن" کو دیکھ کر معلوم ہوا، کہ اُردو میں بھی علوم ہوتے ہیں"۔ حضرت تھانوی رح فرماتے ہیں کہ مجھے یہ سُنکر بہت مسرت ہوئی کہ ایک عالی قدر اہلِ علم نے تصدیق فرمادی۔

راقم الحروف احقر کے پاس حضرت شاہ صاحب رح کے وصال کے ایام میں ایک نابینا عرب جو بہت بڑے فاضل تھے، تشریف لائے، فرمانے لگے، کہ ہند کے ایک بہت بڑے محدّث اور عالمِ دین بزرگ کا انتقال ہوگیا ہے، میں ابھی ریاض نجد ہی میں تھا وہاں اُن کے لئے دُعائے مغفرت ہورہی تھی، اُن کا نام مولٰنا محمد انور لیا جاتا تھا۔

حضرت کے وصال پر خاص اہتمام اطلاعات کا نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن گوجرانوالہ، لاہور، لدھیانہ اور یو، پی کے اضلاع سے، اور دُور دراز علاقوں سے بھی لوگ جنازہ میں شامل ہوگئے۔

مولٰنا محمد یوسف بنوری سابق مدرس جامعۂ ڈابھیل، نے اپنی عالی قدر تالیف "نفحۃ العنبر فی ہدی الشیخ الانور" میں علامہ رشید رضا مصری مدیر "المنار" و مصنّف تفسیر المنار و کتب عدیدہ کے قدوم دیوبند کے موقعہ پر حضرت شاہ صاحب رح کی وہ معرکۃ الآرا تقریر بلیغ و رشیق عربی درج فرمائی ہے۔ جس میں اکابر دیوبند کے حالات، طریق تدریس حدیث اور دیگر اہم مسائل ذکر فرمائے گئے تھے جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں، کہ علامہ رشید رضا جھوم رہے تھے اور اپنی جوابی تقریر میں شاہ صاحب رح کے کمالات علمیہ کا برملا اعتراف کیا، اور حضرات دیوبند کی

خدمت حدیث نبوی پر ایک بسیط مضمون "المنار" میں شائع فرمایا۔

بھاول پور کے تاریخی مقدمہ میں شہادت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار ہو کر جب حضرت شاہ صاحب تشریف لے گئے، احقر حضرت کے ہمراہ تھا مولانا اسعد اللہ صاحب سہارنپوری اور احقر دونوں کو حضرت شاہ صاحبؒ نے مختار مقدمہ بنوایا۔ چنانچہ احقر کو ۱۹ یوم سعادتِ رفاقت نصیب ہوئی، حضرت کو ان ایام میں مرض بواسیر کا دورہ شدید تھا، خون کثرت سے آتا رہا۔ صفرا کا غلبہ ہو گیا تھا۔ پیاس شدت کی رہتی تھی، ضعف میں قوت اور قوت میں ضعف ہو گیا تھا۔ مولانا مولوی مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کا پہلے بیان ہوا، ایک دن بیان دوسرے دن جرح ہوئی، مولانا مرتضیٰ حسنؒ چاند پوری دیوبندی کا دو دن بیان ہوا، تیسرے دن جرح ہو کر پانچویں دن عدالت کا وقت شروع ہونے سے ایک گھنٹہ بعد تک رہی۔ پھر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اطلاع دی گئی، کار سے تشریف لائے، زائرین کا ہجوم تھا۔ ڈسٹرکٹ جج صاحب مرحوم نے نہایت اعلیٰ انتظام فرمایا تھا، تاکہ کارروائی سننے والوں کو دقّت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جب حضرت شاہ صاحب نے کمرۂ عدالت میں قدم مبارک رکھا، تمام حاضرین اٹھ کھڑے ہوئے تاآنکہ مرزائی بھی کھڑے ہو گئے۔ احقر نے حضرت کے ضعف ونقاہت کے باعث جج صاحب سے عرض کر کے آرام کرسی کا انتظام کروایا تھا، کہ حضرت بیٹھ کر بیان دیں گے، ہم دونوں کے لئے بھی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن ہمیں تو ادباً کھڑے ہی رہنا تھا اور کام بھی کرنا تھا، اِس لئے دونوں کرسیاں اٹھوا دی تھیں، کمال یہ کہ مرزائی ہر دو مختاران مدعا علیہ بھی اپنی اپنی کرسیاں اٹھوا کر زمین پر بیٹھ گئے۔ حضرت کے حکم سے حوالجات کتب نکال کر پیش کرنا بھی احقر کے سپرد تھا اور

حضرت کی بیّن کرامت تھی جس عبارت کے متعلق ارشاد فرماتے احقر فوراً نکال کر پیش کرتا تھا اور حضرت پڑھ کر جج صاحب کو سُناتے تھے، بیان شروع ہوتے ہی تمام کچہری میں سنّاٹا چھا گیا تھا، حاضرین ہمہ تن گوش تھے، حضرت کا بیان نہایت سکون و اطمینان سے سُن رہے تھے، باوجود ضعف کے آواز اتنی بلند جاتی تھی کہ عدالت کے اندر باہر سب کو پُورا بیان سُنائی دیتا تھا مرزائی لوگ مولانا مرتضیٰ حسن کے بیان میں شور مچاتے تھے۔ لیکن حضرت کے بیان میں سب کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں ایسا منضبط اور اُصولی بیان لا عین رأت ولا اذن سمعت۔

جج صاحب کی آرزو تھی کہ بیان ایسا ہونا چاہیے جس سے مجھے نتیجہ تک پہنچنا آسان ہو جائے کہ کن وجوہ کی بناء پر کسی کی تکفیر کی جا سکتی ہے، سو حضرت کا بیان ماشاءاللہ ایسا ہی تھا۔ جج صاحب نہایت محظوظ ہو رہے تھے کہ اُن کی مُراد بر آئی، وہ فرماتے تھے کہ جزئیات منتشرہ کی بھرمار سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ افسوس ہے کہ "بیانات علماء ربانی" کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں وہ تفصیلات درج نہیں کیں نیز جو جو عبارات اثناء بیان میں تشریحات و تفسیرات کے ساتھ پیش فرمائی جاتی تھیں، وہ بھی پُوری درج نہیں کی گئیں۔ صرف اتنا بیان طبع ہوا جو حضرت شاہ صاحب رح جج صاحب کو املا کرواتے تھے اس میں حوالجات کی عبارات کا صرف اول اور آخری لفظ لے لیا گیا ہے، حالانکہ حضرت شاہ صاحب رح پوری عبارات معہ تشریح و تفسیر، سُناتے تھے، اگر ذرا تکلیف انجمن مؤید الاسلام بھاولپور کے منتظمین گوارا فرماتے، یا کم از کم احقر لائل پُوری کو حکم فرماتے تو حضرت شاہ صاحب رح کا پورا مشرح مفصل و مبسوط بیان ۱۶۰ صفحات پر آجاتا، اِس لئے کہ احقر بھی پُورا پُورا بیان ساتھ ساتھ

لکھتا جاتا تھا۔ فیصلہ مقدمہ پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ فاضل جج نے اپنے صادق مصدق فیصلے کا مدار زیادہ تر حضرت شاہ صاحب ہی کے محققانہ بیان پر رکھا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا بیان سننے کے لئے پنجاب، بلوچستان، کراچی اور دیگر دور دراز علاقوں کے علماء و فضلاء و رؤساء اور آفیسرانِ ریاست آئے ہوئے تھے۔ انجمن مؤید الاسلام بہاولپور نے جو تمہیدی الفاظ حضرت کے بیان "البیان الازہر" پر لکھے ہیں ملاحظہ فرمائیے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حامداً و مصلیاً۔

شیخ الاسلام والمسلمین اسوۃ السلف و قدوۃ الخلف حضرت مولنا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری قدس اللہ اسرارہم کی بلند ہستی کسی تعارف اور توصیف کی محتاج نہیں، آپ کو مرزائی فتنے کے ردو استیصال کی طرف خاص توجہ تھی، حضرت شیخ الجامعہ صاحب کا خط شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دیوبند پہنچا، تو حضرت ڈابھیل تشریف لیجانے کا ارادہ فرما چکے تھے اور سامانِ سفر باندھا جا چکا تھا، مگر مقدمہ کی اہمیت کو ملحوظ فرما کر ڈابھیل کی تیاری کو ملتوی فرمایا۔ اور ۱۹ر اگست ۱۹۳۲ء کو بہاولپور کی سرزمین کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا۔ حضرت کی رفاقت میں پنجاب کے بعض علماء مولنا عبد الحنان خطیب آسٹریلیا مسجد لاہور و ناظم جمعیۃ علماء پنجاب، و مولنا محمد صاحب لائل پوری فاضل دیوبند، و مولنا محمد زکریا صاحب لدھیانوی وغیرہم بھی تشریف لائے۔ ریاست بہاولپور اور ملحقہ علاقہ کے علماء اور زائرین اس قدر جمع ہوگئے کہ حضرت کی قیامگاہ پر بعض اوقات بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی، اور زائرین مصافحہ سے مشرف نہ ہو سکتے تھے۔

۲۵ر اگست ۱۹۳۲ء کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بیان شروع ہوا، عدالت کا کمرہ امراء و رؤساء

ریاست وعلماء کی وجہ سے پُر تھا، عدالت کے بیرونی میدان میں دُور تک زائرین کا اجتماع تھا باوجودیکہ حضرت شاہ صاحبؒ عرصہ سے بیمار تھے اور جسم مُبارک بہت ناتواں ہو چکا تھا۔ مگر متواتر پانچ روز تک تقریباً پانچ پانچ گھنٹے یومیہ عدالت میں تشریف لاکر علم وعرفان کا دریا بہاتے رہے، مرزائیت کا کفر وارتداد اور دجل وفریب کے تمام پہلو آفتاب نصف النہار کی طرح روشن فرمادئے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان ساطع البرہان میں مسئلۂ ختم نبوت اور مرزا کے ادّعاء نبوّت و وحی و مدعی نبوت کے کفر وارتداد کے متعلق جس قدر مواد جمع ہے اور ان مسائل وحقائق کی توضیح وتفصیل کے لئے جو ضمنی مباحث موجود ہیں شاید مرزائی نبوّت کے ردّ میں اتنا علمی ذخیرہ کسی ضخیم سے ضخیم کتاب میں یکجا نہیں ملیگا، حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان پر تبصرہ کرنا خاکسار کے فکر کی رسائی سے باہر ہے ناظرین بہرہ اندوز ہوکر حضرت شاہ صاحبؒ کے حق میں دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے اعلیٰ علیین میں مدارج بلند فرمائیں۔ آمین!

حضرتؒ کا حافظہ اُس وقت قابل دید وشنید تھا جب حوالہ دیتے کتاب کھولتے ہی فوراً انگلی مُبارک عبارت پر ہوتی، جج صاحب لکھئے! عبارت یہ ہے۔ بعض دفعہ احقر کو فرماتے کہ عبارت نکال کر دے، تاکہ دکھاؤں، بعض دفعہ صفحہ بھی ارشاد فرماتے، بیان بیٹھ کر فرماتے لیکن حوالجات پیش فرماتے وقت کھڑے ہو جاتے، توراۃ شریف کی بعض آیات عبری الفاظ میں سُنائیں اور اپنے دستِ مُبارک سے لکھ کر جج صاحب کو دیں۔ چنانچہ ایک آیت احقر کو یاد ہے۔ نَابِی مِقِرَبَخْ مِیحِیخَ کَا موخ یاقیم لَخَ اَلُوھَخ اِلَا وَتِشْمَاعُوْنْ ہ نبیّ من قُربِكَ مِنْ اَخِیْكَ كَاخِیَاكَ یُقِیْمُ لَكَ اِلٰهكَ اِلَیہ تَسْمَعُوْنَ۔ ارشاد فرمایا، کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبیا وعلیہ السلامؑ اپنے دستِ مُبارک سے لکھ کر اس آیت کا بنی اسرائیل میں اعلان فرمایا۔ فرمایا، جج صاحب لکھئے، ہمارا دین،

متواتر ہے اور دُنیا میں کوئی دین متواتر نہیں، تواتر کی تعریف بیان فرما کر اس کے اقسام تواتر اسناد، تواتر طبقہ، تواتر قدر مشترک، تواتر توارث بیان فرمائے، فرمایا، تواتر کی ایک قسم معنوی بھی ہے، اور تواتر کی کسی ایک قسم کا منکر کافر ہے۔ مرزا غلام احمد نے تواتر کے جمیع اقسام کا انکار کیا ہے، جرح کے روز جلال دین شمس مرزائی مختار مدعا علیہ نے سوال کیا کہ آپ نے تواتر کے منکر کو کافر کہا ہے حالانکہ یہ تو ایک اصطلاح ہے جو علماء نے گھڑ رکھی ہے اس کا منکر کیسے کافر ہو سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا، کہ تم لوگ مانتے ہو یا نہیں کہ یہ قرآن مجید وہی قرآن ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اور ہم تک محفوظ چلا آیا، جلال دین نے کہا کہ ہم مانتے ہیں، فرمایا کہ اس حالت حفاظت کا نام تمہارے ہاں کیا ہے؟، جلال دین کہا "تواتر" فرمایا اس کا منکر کافر ہوگا یا نہیں؟، مرزائی مختار نے اقرار کیا۔ فرمایا کہ میں یہی تو کہہ رہا تھا۔ قادیانی مختار نے سوال کیا کہ امام رازیؒ نے تواتر معنوی کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، میں بحر العلومؒ نے تصریح کی ہے۔ فرمایا، جج صاحب ہمارے پاس فواتح الرحموت کتاب موجود نہیں ہے بتیس سال ہوئے میں نے یہ کتاب دیکھی تھی، ان صاحب نے حوالہ دینے میں دھوکا دیا ہے، بحر العلومؒ امام رازیؒ کے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ جو حدیث ہے لا تجتمع امتی علی الضلالۃ، یہ تواتر معنوی کے درجہ کو نہیں پہنچتی، یہ نہیں کہ تواتر معنوی کے حجۃ ہونے کا اِنکار کرتے ہیں بلکہ اس حدیث کے متواتر معنوی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ جج صاحب نے قادیانی مختار کو حکم دیا کہ اصل عبارت پڑھ کر سُنائیے، اس نے ذرا تامل کیا تو حضرت شاہ صاحب نے کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی کہ لاؤ میں عبارت سُناتا ہوں، اُس نے کہا کہ میں ہی سُنا دیتا ہوں

جب سُنایا، تو وہی عبارت تھی جو حضرت نے ارشاد فرمائی تھی۔ فرمایا، جج صاحب! یہ صاحب ہمیں مُفحم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں چوں کہ طالب علم ہوں دو چار کتابیں، دیکھ رکھی ہیں، میں ان سے انشاء اللہ مفحم نہیں ہونے کا۔

قادیانی مختار نے سوال کیا آپ نے فرمایا کہ مدعی وحی نبوت واجب القتل ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد کو کیوں قتل نہ فرمایا، بلکہ فاروقِ اعظمؓ کو بھی روک دیا، فرمایا، جج صاحب لکھیئے، ابن صیاد نابالغ تھا، اور نابالغ کو شریعت میں قتل نہیں کیا جاتا۔ سوال آپ نے فرمایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسیلمہ کذاب کے دو قاصد آئے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن سے دریافت فرمایا، کہ کیا تم بھی مسیلمہ کا عقیدہ مانتے ہو؟ اُنہوں نے اثبات میں جواب دیا، تو فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی، کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کو قتل کرتا، اب سوال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رواج کا اتباع کیا؟ فرمایا، کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا یہ بجائے خود تشریعی حکم ہے نبی رواج کا متبع نہیں ہوتا بلکہ حُکمِ خُداوندی کا متبع ہوتا ہے۔ حضرت کی قیامگاہ پر زائرین کا ہجوم رہتا تھا ہر وقت کسی نہ کسی موضوع پر تقریر فرماتے رہتے تھے، بہت سے لوگ حضرت سے بیعت بھی ہوئے رات دن یہی شغل تھا، رات کے ایک بجے تک بیٹھے رہتے قرآن و حدیث و فقہ، تصوّف وغیرہا علوم و فنون کے دقیق دقیق مسائل علماء کرام و صوفیاء عظام، دریافت کرتے رہتے ہر ایک کے جواب میں ایسی محقق اور مبسوط تقریر فرماتے گویا ساری عمر اُسی میں لگائی ہے ایک عالم دین نے مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدت شہود کے متعلق سوال کیا، بس پھر کیا تھا تین دن عصر سے مغرب تک اور مغرب سے عشاء تک

اسی پر بیان فرماتے رہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رہ کی عبارات زبانی سُنا رہے ہیں، معارف لدنیہ میں یہ فرماتے ہیں، مکتوبات شریفہ میں یہ فرماتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ رہ کی یہ تحقیق ہے، عبقات میں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے یوں فرمایا، حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رہ نے فتوحات میں یہ فرمایا ہے، فصوص الحکم میں یہ ارشاد ہوتا ہے، حضرت مولٰنا حاجی رحمۃ اللہ تعالےٰ کی نظموں پہ نظمیں وحدۃ الوجود پہ طویل طویل پڑھ کر سُنا رہے ہیں، حضرت مولٰنا دین پوری نور اللہ مرقدہم بھی معہ اپنے خدام کے تشریف فرما رہتے تھے، مولٰنا غلام محمد صاحب گھوٹوی، حضرت مولٰنا عبد اللطیف ناظم مدرسہ مظاہر العلوم، مولٰنا مرتضیٰ حسن صاحب، حکیم عبد الرشید افسر الاطبا بھاول پور، غرض ہر طبقہ محظوظ ہوتا تھا، حضرت ناظم صاحب سہارنپوری بڑی عقیدت کے ساتھ دوزانو سامنے بیٹھے رہتے تھے اور استفادہ فرماتے رہتے تھے، مولٰنا شمس الدین بھاولپوری مرحوم کے کتب خانہ سے معجم کبیر طبرانی رہ کا قلمی نسخہ منگایا، حضرت ناظم صاحب لے کر آئے، احقر کو حکم فرمایا کہ روزانہ مجھے اس میں سے احادیث نقل کر کے دیا کر، چنانچہ نشان دہی فرمائی جاتی اور احقر کو یہ سعادت نصیب ہوئی، فرمایا کہ قلمی کتاب کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے میں آپ کو طریقہ سکھاتا ہوں۔ چنانچہ تھوڑی سی رہ نمائی سے احقر نے خوب سمجھ لیا۔ معجم کے اس نسخہ میں کہیں اعراب و نقاط کا نام و نشان بھی نہیں۔ مولٰنا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولٰنا محمد مرتضیٰ حسن مرحوم کے بیانات پہلے خود مُلاحظہ فرماتے، جگہ جگہ رہنمائی فرماتے جب خود تسلی فرما لیتے، تو کچہری میں جانے دیتے، لیکن خود حضرت کوئی طیاری نہ فرماتے، ایک بجے شب تک تو جیسے اُوپر گزرا وعظ و تلقین ارشاد و بیانِ مسائل ہوتا رہتا، صرف ایک گھنٹہ آرام فرماتے۔

دو بجے تہجد کے لئے اُٹھتے، فجر کی نماز تک مراقب رہتے، پاس انفاس میں مشغول رہتے
اوّل وقت نماز فجر کی امامت خود کرتے پھر سورج نکلنے تک کچھ پڑھتے رہتے، چلئے
پی کر موٹر سے کچہری تشریف لیجاتے، سات بجے سے ایک بجے تک بیان ہوتا رہتا۔
ضعف و نقاہت بغایت تھا لیکن تکان مطلقاً محسوس نہ فرماتے، تمام رفقاء سفر و
دیگر علماء کا خوب اہتمام سے تفقّد فرماتے رہتے، مجلس مشاورت میں خاص خاص علماء
کو شامل فرماتے۔ احقر پر اتنی نوازشات وعنایات کی بارش ہوتی رہتی تھی کہ بیان
سے باہر ہے۔ احقر نے قادیانیوں کی کتب سے بعض نئی باتیں نکال کر پیش کیں، بہت
خوش ہوئے اور بار بار علماء کو بُلا کر دکھاتے۔ جب تک احقر مجلس مشاورت میں حاضر نہ ہوتا
بات شروع نہ فرماتے، تخلیہ میں بھی مشورہ فرماتے اور باصرار فرماتے کہ تیری اس میں
کیا رائے ہے۔ بھاول پور شہر میں جامع مسجد و دیگر مقامات پر قادیانت کے خلاف
تقریر کرنے کے لئے علماء کو بھیجتے رہتے تھے، دو دفعہ احقر کو بھی بھیجا، ان ایام میں اس قدر
حضرت رح کے چہرۂ مبارکہ پر انوارات کی بارش ہوتی رہتی تھی، ہر شخص اس کو محسوس
کرتا تھا۔ احقر نے بارہا دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرما رہے ہیں لیکن روشنی
ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں، حالانکہ اُس وقت بجلی گل ہوتی تھی، بھاولپور
جامع مسجد میں جمعہ کی نماز حضرت اقدس رح پڑھایا کرتے تھے بعد نماز کچھ بیان بھی ہوتا
تھا، ہزاراں ہزار کا مجمع رہتا تھا۔ پہلے جمعہ میں فرمایا "کہ حضرات! میں نے ڈابھیل
جانے کے لئے سامانِ سفر باندھ لیا تھا کہ یکایک مولٰنا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ
کا خط دیوبند موصول ہوا، کہ شہادت دینے کے لئے بھاول پور آئیے۔ چنانچہ اس عاجز
نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور بھاولپور کا سفر کیا۔ یہ خیال کیا کہ ہمارا نامۂ اعمال تو

سیاہ ہے ہی، شاید یہی بات میری نجات کا باعث بن جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانبدار ہو کر بھاول پور میں آیا تھا۔" بس اس فرمانے پر تمام مسجد میں چیخ و چہاڑ پڑ گئی، لوگ دھاڑیں مار مار کر اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے خود حضرت پر ایک عجیب کیفیت وجد طاری تھی۔ ایک مولوی صاحب نے اختتام وعظ پر فرمایا، کہ حضرت شاہ صاحب کی شان ایسی ہے اور آپ ایسے بزرگ ہیں وغیرہ حضرت فوراً کھڑے ہو گئے۔ فرمایا، حضرات ان صاحب نے غلط کہا ہے ہم ایسے نہیں ہیں، بلکہ ہمیں تو یہ بات یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ "ہم سے گلی کا کتا بھی اچھا ہے، ہم اِس سے گئے گزرے ہیں" سبحان اللہ، انکسار اور تواضع کی حد ہو گئی۔

لاہور اِسی سفر کے سلسلہ میں دو روز قیام فرمایا تھا۔ آسٹریلین بلڈنگ کی مسجد میں بعد نماز فجر وعظ فرمایا۔ علماء و فضلاء عوام و خواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبال اور اُن کے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔ بیان ہوتا تھا:۔ "اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، مالک تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو" غرض حضرت نے خطبہ شروع فرمایا۔ الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ الخ وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرما رہے تھے، احقر کے دل میں وسوسہ سا گزرا کہ مسجد میں تو شاید کرسی بچھانا سوء ادب ہو۔ حضرت نے فوراً خطبہ بند کر دیا، فرمایا کہ مسجد میں کرسی بچھانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے چنانچہ مسلم شریف میں روایت ہے کہ ایک سائل کے جواب دینے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مدینہ کے بازار سے کرسی لائی گئی۔ راوی کہتا ہے کہ اُس کرسی کے پائے سیاہ تھے غالباً لوہے کے تھے، مصلے کے قریب رکھی گئی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پر بیٹھ کر جوابات دیئے، یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرما کر حضرت نے

وعظ کیا، احقر ندامت سے پسینہ پسینہ ہوگیا۔

قادیانی مختار نے کہا کہ تحذیر الناس میں مولنا محمد قاسم نانوتوی رح نے بھی بعد خاتم النبیین نبی کا آنا تجویز کیا ہے۔ فرمایا، جج صاحب لکھیئے۔ حضرت مولنا محمد قاسم رح نے اپنے الہامی مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے متعلق دلائل و براہین ساطعہ بیان فرمائے ہیں، اور اکثر عبداللہ بن عباس رض کی علمی توجیہات فرمائی ہیں ان لوگوں پر حیرت ہے جو تحذیر الناس کو بغور و با لاستیعاب دیکھتے نہیں۔ اسی رسالہ میں جا بجا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین زمانی ہونا اور اس کا اجماعی عقیدہ ہونا اور اس پر اپنا ایمان ہونا ثابت فرمایا ہے۔ رسالہ کے صنا کی عبارت میں آپ کو لکھوانا چاہتا ہوں، حضرت مولنا فرماتے ہیں " سو اگر اطلاق اور عموم ہے تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالۃ التزامی ضرور ثابت ہے؛ ادھر تصریحات نبوی مثل انت منی بمنزلہ ھارون من موسی الا انہ لا نبی بعدی او کما قال جو بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے، اسباب میں کافی ہے کیوں کہ یہ مضمون درجۂ تواتر کو پہنچ گیا ہے اور اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا ہے گو الفاظ مذکور بسند تواتر منقول نہ ہوں۔ سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و وتر وغیرہ باوجودیکہ الفاظ احادیث مشعر تعداد رکعات متواتر نہیں جیسا اس کا منکر کافر ہے ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا۔"

اسی رسالہ کے دوسرے صفحات میں بھی جا بجا حضور ص کی خاتمیت زمانی کا اقرار فرمایا ہے۔ نیز مناظرہ عجیبہ جو صرف اسی موضوع پر ہے۔ نیز آب حیات، قاسم العلوم، انتصار الاسلام وغیرہا کتب مصنفہ حضرت نانوتوی رح دیکھنا چاہیئے۔ حضرت مولنا مرحوم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تین طرح کی خاتمیت ثابت فرماتے ہیں، ایک بالذات یعنی مرتبہ حضورؐ کا خاتمیت ذاتی کا ہے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصفِ نبوت کے ساتھ موصوف بالذات ہیں اور انبیاء کرام علیہم السلام موصوف بالعرض اور آپ کے واسطے سے۔ جیساکہ عالمِ اسباب میں موصوف بالنور بالذات آفتاب ہے اس کے ذریعے سے تمام کواکب قمر وغیرہ اور دیگر اشیاء ارضیہ متصف بالنور۔ یہی حال وصفِ نبوت کا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اِس سے متصف بالذات ہیں اور اِسی وجہ سے آنحضورؐ کو سب سے پہلے نبوت ملی۔ حدیث میں ہے کنت نبیاً وادم منجدل بین الماء والطین۔ اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام حضورؐ کے واسطہ سے متصف بالنبوۃ ہوئے، حدیث میں ارشاد ہے "لوکان موسیٰ حیاً لما وسعہ الا اتباعی" اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو اُن کو بھی میرے اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔" پارہ ۳ کے آخری رکوع میں ارشاد ہوتا ہے۔ واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتابٍ وحکمۃٍ ثم جاءکم رسولٌ مصدق لما معکم لتؤمنن بہٖ ولتنصرنہ الآیہ۔ اِس آیت سے صاف واضح ہے کہ نبی کریم محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم جیساکہ اس اُمت کے رسول ہیں نبی الانبیاء بھی ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام کی جماعت کو ایک طرف رکھا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف، اور سب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا، آیت میں، ثم جاءکم فرماکر تصریح فرمادی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ ظہور سب سے آخر میں ہوگا۔

آیت میثاق درو ثم ہست ✧ ایں ہمہ از مقتضائے ختم ہست

ثم عربی زبان میں تراخی کے لئے آتا ہے، اسی واسطے علیٰ فترۃٍ من الرسل الآیہ

فرمایا۔ حدیث میں ہے "انا دعوۃ ابی ابراھیم" میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہم السلام کی دُعاء ہوں، تمام انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارات دیتے آئے۔ چنانچہ توراۃ شریف، انجیل شریف ودیگر صُحُف میں باوجود تحریف لفظی و معنوی ہو جانے کے اب بھی متعدد آیات موجود ہیں۔ جو حضورؐ کی خاتمیت اور افضلیت کا پتہ دیتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ تشریف لاکر اتباعِ شریعت محمدیہ کرنا اسی فضیلت اور خاتمیت کا عملی مظاہرہ ہوگا۔ لیلۃ المعراج میں انبیاء علیہم السلام کا صف بندی کرکے امام کا منتظر رہنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امامت کرنا بھی اسی امر کی صراحت کرتا ہے۔ واسئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا الآیہ بھی اسی کی طرف مشیر ہے کہ لیلۃ المعراج میں انبیاء علیہم السلام کا اجتماع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا۔ اور ابن حبیب عبداللہ ابن عباسؓ سے راوی ہیں کہ یہ آیت لیلۃ المعراج میں نازل ہوئی (اتقان)، اور انا خطیبھم اذا انصتوا، اور احادیث شفاعت بھی اسی فضیلت محمدیہ کا اعلان کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا اختتام ہوا اور پہلے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نہ کسی کا زندہ رہنا ضروری تھا، تاکہ بطور نمائندہ سب کی جانب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی نصرت کریں۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کا انتخاب ہوا، اِس لئے کہ آپ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں اور سلسلہ اسحاقی، اور اسمٰعیلی کو جوڑ دینا منظور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تین اُمور کا اعلان فرمایا۔

(۱) یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم "اے بنی اسرائیل میں فقط تمہاری طرف مبعوث ہوکر آیا ہوں"

دوسری جگہ آل عمران میں "ورسولاً الیٰ بنی اسرائیل" فرمایا گیا ہے "صرف بنی اسرائیل کیطرف رسول بناکر

(۲) مصدقاً لما بین یدی من التوراۃ۔ (۳) ومبشراً برسولٍ یاتی من بعدی اسمہٗ احمد۔" میں ایک عظیم الشان رسول برحق کی خوشخبری سُنانے آیا ہوں جو میرے بعد معبوث ہوں گے اُن کا نام احمد ہے۔" قرآنِ عزیز اعلان کرتا ہے کہ وہ رسولِ برحق جن کے متعلق عالمِ ارواح میں انبیاء علیہم السلام سے عہد وپیمان ہوا، اور بشارات دی گئی تھیں آچکا۔ "جاء الحق وصدق المرسلین۔" حدیث شریف میں ہے" انی[1] اولی الناس بعیسی بن مریم" الحدیث۔" مجھے زیادہ قرب ہے عیسیٰ علیہ السلام سے بہ نسبت تمام لوگوں کے اور بلا شبہ وہ نزول فرمائیں گے۔" انبیاء بنی اسرائیل کے آخری نبی اولوالعزم کا خاتم النبیین علی الاطلاق کے دین کی نصرت کے لئے تشریف لانا اور شریعت محمدیہ پر عمل فرمانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہونے کا عملی مظاہرہ ہے، فضیلت محمدیہ کو دُنیا پر واشگاف کردینا منظور ہے، آپ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تشریف لانا ایسا ہی ہے جیسے ایک نبی دوسرے نبی کے علاقہ میں چلا جائے۔ چنانچہ حضرت یعقوب ع حضرت یوسف علیہ السلام کے علاقہ میں تشریف لے گئے تھے؛ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو نبی ہی ہوں گے لیکن بہ حیثیت حکماً عدلاً تشریف آوری ہو گی بطور جج منٹ فرمانے کے تشریف آوری ہو گی۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قربِ قیامت میں عیسائی اقوام کی مسلمانوں سے مڈبھیڑ رہے گی، لہٰذا اہلِ کتاب کی اصلاح کے لئے تشریف لائیں گے، ثالث وہی ہوتا ہے جو ہر دو فریق کے نزدیک مسلّم ہو۔ ہماری کتابیں عقیدۃ الاسلام

[1] احمد ابوداؤد ابن ابی شیبہ ابن حبان نے روایت کیا مرفوعاً الانبیاء اخوان لعلات امھاتھم شتّٰی ودینھم واحدٌ وانی اولی الناس بعیسی بن مریم لانہ لم یکن بینی وبینہٗ نبیٌّ وانہ خلیفتی علی اُمّتی وانہ نازل الخ ؛

تحیۃ الاسلام، التصریح بما تواتر فی نزول المسیح، اِس باب میں دیکھنا چاہیئے۔

دوم خاتمیت زمانی یعنی آپ کا زمانۂ نبوت اس عالم مشاہدہ میں تمام انبیاء علیہم السلام کے آخر میں ہے آپ کے بعد کسی کو نبوت کی تفویض نہ ہوگی۔ ابی بن کعبؓ سے مرفوعاً روایت ہے۔ بدئ بی الخلق وکنت اٰخرھم فی البعث، واخرج جماعۃ عن الحسن عن ابی ھریرۃ مرفوعاً کنت اول النبیین فی الخلق واٰخرھم فی البعث۔ (کذا فی روح المعانی صـ ج ۷)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضورؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے ہیں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ اسلام کا اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے - مرزا غلام احمد نے اجماع کو حجۃ مانا ہے اور اس کے منکر پر لعنت کا اعلان کیا ہے۔ انجام آتھم صـ ۱۴۴ مرزا صاحب نے کفار کے تواتر کو بھی حجۃ مانا ہے چہ جائیکہ تمام اُمت محمدیہ کے تواتر سے ثابت شدہ عقیدہ (تریاق القلوب) حضرت نانوتوی رح نے تیسری خاتمیت مکانیہ ثابت فرمائی ہے یعنی وہ زمین جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوئے وہ تمام زمینوں میں بالاتر اور آخری ہے اور اس کے اُوپر کوئی زمین نہیں اس کو بدلائل ثابت فرمایا ہے۔

قادیانی مختار مقدمہ نے سوال کیا کہ امام مالکؒ سے منقول ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے قائل ہیں؟ احقر سے فرمایا کہ اُبی کی شرح مسلم شریف نکالو۔ چنانچہ صـ ۲۲۶ ج ۱۷ مطبوعہ مصر سے ذیل کی عبارت پڑھ کر سُنائی:۔ وفی العتبیۃ قال مالک بینا الناس قیامٌ یستمعون لاقامۃ الصلوٰۃ فتغشاھم غمامۃ فاذا عیسیٰ قد نزل الخ "عتبیہ میں ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا درانحالیکہ لوگ کھڑے نماز کی اقامت سُن رہے ہوں گے کہ اچانک ان کو ایک بادل ڈھانپ لیگا یکایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو نگے"

امام مالکؒ کا بھی وہی عقیدہ ہے جو ساری امت محمدیہ کا اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے ہم نے تتبع کیا ہے کوئی تیس اکتیس صحابہ احادیث نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے راوی ہیں، تابعین کا تو احصار بھی مشکل ہے۔ امام ترمذی نے پندرہ صحابہ گنوائے ہیں، ہم نے مزید پندرہ کا اضافہ کیا۔ چنانچہ مسند احمد و کنز العمال و دیگر کتب حدیث کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں۔ ہمارا رسالہ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" مطالعہ کیا جائے۔

قادیانی نے سوال کیا، کہ علماء بریلوی، علماء دیوبند پر کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں اور علماء دیوبند علماء بریلوی پر۔ ارشاد فرمایا کہ جج صاحب! احقر بطور وکیل تمام جماعت دیوبند کی جانب سے گذارش کرتا ہے کہ، حضرات دیوبند ان کی تکفیر نہیں کرتے، اہل سنت و الجماعت اور مرزائی مذہب والوں میں قانون کا اختلاف ہے، علماء دیوبند اور علماء بریلی میں واقعات کا اختلاف ہے قانون کا نہیں۔ چنانچہ فقہاء حنفیہؒ نے تصریحات فرمائی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کلمۂ کفر کسی شبہ کی بناء پر کہتا ہے، تو اُس کی تکفیر نہ کی جائے گی، دیکھو رد المحتار، و بحر الرائق +

احقر محمد لائل پوری عرض کرتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب، قدس سرہ العزیز نے اپنی تقریر بخاری شریف فیض الباری میں فرمایا ہے کہ مقبلی اور محمد بن ابراہیم وزیر پہلے زیدی تھے اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم پر طعن بھی کرتے تھے سب پر نہیں اور مقبلی نے امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ پر بھی طعن کئے ہیں۔ اس پر ایک غیر مقلد صاحب نے برافروختہ ہو کر اعتراضات کر دیئے کہ دیکھئے صاحب، شاہ صاحب نے علماء احناف کے قدیم اصول کے مطابق علماء اہلحدیث پر اعتراضات فرما دیئے۔ حالانکہ حضرت شاہ صاحبؒ نے

توان کے زیدی ہونے کے زمانہ کی بات ذکر فرمائی ہے اور فیض الباری میں متعدد مقامات پر اُن کی تعریف بھی فرمائی ہے، چنانچہ مقبلی نے جو طعن امام بخاریؒ پر کئے ہیں اس کے متعلق صـ۲۸۵ ج ۲ فیض الباری میں فرماتے ہیں "مقبلی کہتے ہیں کہ امام بخاری اپنے تعصب کی بناء پر مجہول رواۃ سے تو روایات لیتے ہیں لیکن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ جیسے امام سے نہیں لیتے اور یہ زیدی صاحب جب اشتغال بالحدیث فرمانے لگے تو زیدیت سے ہٹتے چلے گئے"۔ اور اکفار الملحدین میں کئی مقامات پر محمد بن ابراہیم وزیر یمانی کی "ایثار الحق" سے حوالے پیش کئے ہیں اور جا بجا ان کی تعریف فرمائی ہے۔ چنانچہ اکفار الملحدین صـ۶۳ پر فرماتے ہیں :۔

"لان الکفر ھو جحد الضروریات من الدین او تاویلھا"

ایثار الحق علی الخلق۔ للمحقق الشہیر الحافظ محمد بن ابراھیم الوزیر الیمانی صـ۴۲۱، اکفار الملحدین کے صـ۳۲، صـ۳۳ پر متعدد عبارات "ایثار الحق" سے نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں :۔ "وقد قال ذلک المحقق محمد بن ابراھیم الوزیر الیمانی فی کتابہ"

(ایثار الحق صـ۲۲)

علاوہ بریں یہ کہ اتحاف النبلاء میں ان کے زیدی ہونے کی تصریح موجود ہے اس کے بعد اس سے رجوع کرنا بھی مذکور ہے ان حالات میں رجوع کے بعد بھی انسان میں اپنی گذشتہ زندگی کے نشانات رہ جاتے ہیں، "الروض الباسم" جو محمد بن ابراہیم وزیر یمانی کی تصنیف ہے، خیال پڑتا ہے کہ اس کے کچھ شواہد اس میں مل سکتے ہیں۔ رہے مقبلی صاحب، تو "العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الآباء والمشائخ" میں امام بخاریؒ پر اُن کے مطاعن موجود ہیں چوں کہ ان علماء کو رد تقلید سے شغف تھا، اس لئے غیر مقلدین

کو ان کا دامن پاک کرنا ضروری ہے۔ البدر الطالع علامہ شوکانی کی تصنیف ہے وہ ان حضرات کی طرف سے جتنی بھی صفائی پیش کریں کم ہے، یہ صاحب (شوکانی) بھی زیدی رہ چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ معترض صاحب نے فیض الباری اور اکفار الملحدین وغیرہ کتب کا مطالعہ فرمانا گوارا نہ فرمایا، اعتراض کر کے محض اپنا دل ٹھنڈا کیا۔

دوسری بات یہ تھی کہ حضرت رحمۃ اللہ تعالےٰ نے فیض الباری ج ۴ ص ۹۳ میں فرمایا ہے کہ بخاری شریف میں "أنت اباجهل" جو مذکور ہے یہ نظیر ہے امام ابی حنیفہؒ کے "ولو ضرب باباجهل" کی، اور یہ لغت اسماء ستہ مکبّرہ میں مطّردہ ہے، سو جس کسی نے امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ تعالےٰ پر اس کے باعث اعتراض کیا ہے اس کو بخاری شریف سے دیکھ لینے کی توفیق نہ ہوئی۔ چنانچہ ابو العلاء نحوی سے یہ نہ ہو سکا کہ بخاری شریف ہی سے دیکھ لیتے معترض صاحب ارشاد فرماتے ہیں :۔

"کہ مولانا انور شاہ صاحب مرحوم اس کو نحوی غلطی بتاتے ہیں اور امام ابی حنیفہؒ سے اعتراض دور کرنے کی بجائے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غلطی نکال کر جو در اصل ان کی غلطی نہیں ہے، جواب دیا جاتا ہے حالانکہ حدیث کی توجیہ بیان کرنے کے بعد اگر مولانا عبد الحی لکھنوی کی وہ عبارت جو انہوں نے التعلیق الممجد کے مقدمہ میں لکھی ہے، لکھ دیتے تو اچھا تھا"

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ العزیز نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے بجنسہٖ درج کیا جاتا ہے۔
فیض الباری ج ۴ ص ۹۳ :۔ قوله انت اباجهلٍ هذا نظير قول ابی حنیفةؒ ولو ضرب باباقبيس وهذه لغت فی الاسماء الستة المكبرة مُطردةٌ وجهل من طعن فيه على ابی حنیفةؒ ولم يوفق لحفظة مثله فی البخاری كما

وقع لابی العلاء النحوی "

معترض صاحب سے کیا کہا جائے ولکن عین السخط تبدی المساویا کا مظاہرہ اِس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ معترض صاحب نے ساری عبارت نقل نہیں کی، کہیں دیکھنے والے دیکھ نہ لیں کہ حضرت شاہ صاحب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ امام ابی حنیفہؒ کی تائید میں پیش کرنا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں کہ یہ لغت مطردہ نہیں ہے اور بخاری جیسی کتاب میں موجود ہے۔ معلوم نہیں، اعتراض کس لفظ سے سمجھ لیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ تقریر ترمذی میں فرماتے ہیں۔ وحقیقۃ الامر ان فی لغۃ فصیحۃ من لغاتِ العرب یکون اعراب الاسماء الستۃ بالالف فی الاحوال الثلث کما ھو مذکور فی الکتب النحو، وکما قال شاعر ؎

ان اباھا و ابا اباھا + قد بلغا من المجد غایتاھا

(العرف الشذی ص۲۱۶)

نطق الانور قلمی ص۶۲۹ مرتبہ محمد لائل پوری، وہ صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"شاہ صاحب کو چاہئے تھا کہ التعلیق الممجد کے مقدمہ میں جو عبارت ہے لکھ دیتے، اگر جناب ہی ذرا تکلیف فرما لیتے تو سامنے آجاتا کہ التعلیق الممجد کے مقدمہ سے زیادہ زور دار عبارت میں فیض الباری اور تقریر ترمذی میں جناب کے ارشاد کی تعمیل فرمادی ہے اور اگر کتب نحو متداولہ ہی کا سرسری نظر سے مطالعہ فرما لیا ہوتا، تو شاید آپ بھی امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنے والوں پر تعجب فرماتے۔ دیکھو ابن عقیل شرح الفیہ ابن مالک ص۸،۷ اشمونی شرح الفیہ۔

آپ بھی فتح الباری سے یہی ثابت کر رہے ہیں کہ تینوں حالات میں منصوب پڑھنا مطرد ہے شاذ نہیں پھر آپ تو خود حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تائید کر رہے ہیں۔

"فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب" حضرت شاہ صاحبؒ کی بے نظیر کتاب ہے، بعض مدعیان عمل بالحدیث نے اس کا جواب بزعم خود لکھا ہے۔ لیکن علمی دُنیا میں اس کو ایک محدّث کے رسالہ کا جواب کہنا خود علم کی توہین ہے، ہاں عربی زبان میں مختلف عنوانات میں سوقیانہ دشنام طرازی کا خوب مظاہرہ کیا گیا ہے تقریباً دو سو مقام کتاب میں ایسے ملیں گے جہاں سوء ادبی کر کے اپنا دِل ٹھنڈا کیا ہے "سباب المسلم فسوق"۔ از خدا جوئیم توفیق ادب، بے ادب محروم، ماند لطف ربّ۔ حالانکہ علماء اہلِ حدیث خود حضرت مرحوم کا نہایت احترام کرتے تھے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم نے اپنے اخبار اہلحدیث میں حضرت شاہ صاحب مرحوم کے وصال پر ایک طویل مقالہ سپردِ قلم کیا ہے اور اس میں اپنے دردِ دل کا اظہار کیا، اور حضرتؒ کے مناقب اور علمی فضائل بیان کئے اور محبّت بھرے الفاظ میں متعدد ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ اور یہ کہ بے نظیر عالمِ دین رخصت ہو گیا۔

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی نے قادیان کے پہلے بے نظیر اجتماع میں جب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سُنی تو فرمایا کہ اگر مجسّمِ علم کسی کو دیکھنا ہو تو مولانا انور شاہ کو دیکھ لے۔ مولانا عبد التواب ملتانی تلمیذ رشید حضرت مولانا عبد الجبار غزنوی نے علماء اہلِ حدیث کے مجمع میں حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی کمالات اور بزرگی کا برملا اعتراف کیا۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب گوجرانوالہ

نے اسی مجمع میں کہا تھا کہ "مولانا انور شاہ صاحب تو حافظِ حدیث ہیں"۔

مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم تو متعدد بار ملاقات فرما کر حضرتؒ سے علمی استفادات فرماتے رہے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب امرتسر تشریف لاتے رہے، علماء اہلحدیث، احناف کی نسبت زیادہ سے زیادہ تعداد میں حضرت کی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے، اور اس کا اہتمام خصوصی رکھتے تھے +

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تبحّر علمی اور ذوقِ مطالعہ

(از جناب مولانا سیّد محمّد ادریس صاحب سکھروڈوی)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لیل و نہار، صبح و شام کتب بینی میں مصروف رہتے تھے۔ جس وقت بھی کوئی دیکھنا چاہے تو کتاب کے مطالعہ ہی میں دیکھے گا کتاب سے الگ ہو کر بھی فکر، خیال کتاب ہی میں رہتا تھا۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے۔ غرضیکہ کوئی ساعت ایسی نہ تھی جس میں خالی الذہن ہو کر وقت گذارتے ہوں۔ شب میں چند گھنٹوں کے سوا جن میں آپ سو جاتے بیشتر حصّہ کتب کے مطالعہ میں ہی صرف ہوتا تھا۔ ابتدائے شب میں ۱۲ بجے تک کتاب دیکھتے رہتے نیند کے غلبہ سے جب عاجز ہو جاتے سو جاتے اور دو ایک گھنٹہ کے بعد اُٹھ کر وضو فرماتے اور کتاب لیکر بیٹھ جاتے۔ صبح صادق ہونے تک مطالعہ میں گذار دیتے۔ اور صبح کی نماز کے بعد بھی پھر کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہو جاتے۔ ایک مرتبہ خود ہی مجھ سے فرمایا کہ میں کسی وقت بھی دماغ کو فارغ نہیں چھوڑتا ہوں اُن چند گھنٹوں کے سوا جس میں مجھے نوم غرق ہوتی ہے میرا فکر کتاب یا کسی مسئلہ کی تحقیق میں رہتا ہے۔

بارہا ایسا دیکھا گیا کہ نماز کے لئے مسجد جا رہے ہیں اور کوئی بات کسی حدیث یا کسی مسئلہ

کے متعلق صائع ہوتی تو مسکراتے ہوئے تشریف لیجاتے ہیں اور نماز کے بعد فوراً کتاب اٹھائی اور دیکھنا شروع کیا اور مسکراتے ہوئے ہی کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی بغیر کتاب کے بیٹھے ہوئے کسی فکر میں متفکر دیکھا تو جلدی جلدی کتاب اُٹھائی اور مسکراتے ہوئے یادداشت کے طور پر لکھنے لگے۔ غرضیکہ دن رات کی تمام ساعتوں میں آپ کا فکر کتاب اور علمی تحقیق کے باہر نہ ہوتا تھا۔

بڑی بڑی ضخیم کتاب کو ایک مرتبہ ابتداء سے دیکھنا شروع کیا اور ایک ہی دو دن میں از اول تا آخر دیکھکر ختم کر دیا۔ ہزارہا صفحات کی کتاب جب تک ختم نہ فرما لیتے علیحدہ نہ فرماتے۔ اور بہت جلد ہی ختم کر دیتے۔

میں ۲۸ھ کے ختم پر دار العلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا۔ حضرت شاہ صاحب رح بھی غالباً اسی ۲۸ھ کے ابتداء میں دار العلوم میں بسلسلہ درس تشریف فرما ہوئے تھے۔ حسن اتفاق سے مجھے خدمت کا شرف مدرسہ میں داخل ہونے کے چند ماہ بعد ہی حاصل ہوگیا تھا۔ میں نے لیل و نہار صبح و شام۔ مرض و صحت، غرضیکہ ہر حال میں کتاب ہی کے ساتھ مشغول دیکھا، آپ کے پاس آنے والے آتے، کوئی بات دریافت کرتے جواب دے کر فوراً ہی کتاب پر نظر فرما لیتے۔

زیرِ مطالعہ کتب اور شوقِ کتب بینی

جہاں تک یاد کام کرتی ہے، زیرِ مطالعہ کتب دینیہ ہی ہوتی تھیں۔ درسیات میں حدیث و فقہ و تفسیر کی کتاب گاہ بگاہ ہی دیکھتے ہوئے پایا۔ بیشتر متقدمین کی کتب شروح احادیث زیرِ مطالعہ ہوتی تھیں، اور خصوصیت سے حافظ ابن قیم، حافظ ابن دقیق العید اور اسی قسم کے لوگوں کی کتابیں جو جدید طبع ہو کر آتی تھیں اُن کو بڑے شغف کے ساتھ مطالعہ فرماتے تھے اور جس کتاب جدید کے

طبع ہونے کا علم ہوتا فوراً اُس کے حصول کی کوشش فرماتے اور حاصل کر لیتے۔ مستدرک جس وقت حیدرآباد میں طبع ہونی شروع ہوئی، یہ زمانہ مولسنا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم و مغفور کے حیدرآباد میں اُمور مذہبیہ کے عہدہ پر تقرر کا زمانہ تھا کتاب موصوف کے طبع ہونے کا جب علم ہوا تو حیدرآباد کے اس ادارہ کو بہت دُعائیں دیں۔ مولنا حبیب الرحمٰن خاں مرحوم نے جب ایک جلد طبع ہوگئی فوراً بھیجدی اور ساتھ ہی لکھا کہ اگرچہ کتاب پُوری طبع ہونے پر شائع ہونے کا قاعدہ ہے مگر آپکے ساتھ خصوصی رعایت کی وجہ سے ایک حصّہ بھیج رہا ہوں اور باقی دوسری مرتبہ ارسال خدمت کردی جائے گی۔ مجلد کرا کر بذریعہ رجسٹری یہ حصّہ ارسال کیا۔ کتاب کے وصول ہونے پر جو خوشی چہرہ سے نمایاں ہو رہی تھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہی اور جو دُعائیں زبانِ مُبارک سے جاری تھیں سُننے سے وابستہ ہیں۔

اِسی طرح جب طنطاوی کی تفسیر مصر میں طبع ہونی شروع ہوئی ایک ایک پارہ کرکے اُس کو منگایا۔ جتنا حصّہ طبع ہوتا رہا وہ آتا رہا، اور جس وقت جو حصہ آتا سب مُطالعہ چھوڑکر اُس طرف متوجہ ہو جاتے۔

قلمی کتب جو طبع نہ ہوئی تھیں اُن کی طبع اور اشاعت کا اشتیاق اکثر ظاہر فرمایا کرتے تھے تفسیر مظہری کے طبع کے انتظام کی طرف اکثر لوگوں کو توجہ دلاتے تھے اور بہت تعریف فرمایا کرتے اور تمنا تھی کہ یہ تفسیر کسی طرح طبع ہوکر معرض وجود میں آجائے۔ الحمدللہ تفسیر مظہری دس جلدوں میں مکمل ہوکر طبع ہوگئی ہے۔ جسکو ندوۃ المصنفین دہلی نے اپنی نگرانی میں طبع کرایا ہے حق تعالیٰ کارکنان ادارے کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

جُملہ عُلوم و فُنون میں اقتدار کامل

جو کتاب زیر درس ہوتی اُس کا مُطالعہ محض درس کی غرض سے کبھی بھی نہیں دیکھتے تھے،

اپنے ہی ذوق اور علمی تحقیق کے پیش نظر کتاب کا مطالعہ فرماتے تھے۔ جو مسئلہ زیر تحقیق ہوتا اُس کی چھان بین میں دن رات ایک فرما دیتے، اور تنقیدی نظر سے دیکھتے۔ قادیانی فتنہ کی طرف جب توجہ فرمائی تو مسئلہ تکفیر میں "اکفار الملحدین" اور مسئلہ ختم نبوۃ میں "خاتم النبیّین" مسئلہ حیاتِ عیسےٰؑ! عقیدۃ الاسلام جیسی کتابیں تصنیف فرمائیں اور ہر مسئلہ کی تحقیق میں محققانہ بحث کرکے کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑا، پوری سیر حاصل بحث کی۔ جہانتک یادداشت کا تعلق ہے خاتم النبیّین ۴۸ گھنٹہ کی میعاد میں اس طرح تحریر فرمایا کہ ایک ساعت بھی بستر پر کمر سیدھی نہ فرمائی، اور اس ۴۸ گھنٹہ کی مدت میں حسب معمول درس بخاری بھی مدرسہ کے اوقات میں جاری رہا اور ایک منٹ تیند نہیں فرمائی۔ قرارت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں ابتداءً ایک فارسی رسالہ جس کا نام غالباً فاتحۃ الخطاب تصنیف فرمایا تھا، پھر زمانہ دارالعلوم میں دوسری بار فصل الخطاب تالیف کیا جس میں اس مسئلہ پر پورے بسط و تفصیل سے اس مسئلہ کو بیان کیا۔ یہ بیان اگرچہ سلسلہ تصنیفات میں ہوگا مگر یہاں یہ دکھلانے کے لئے مذکور ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا مذاق علمی تحقیقات اور مطالعہ کتب میں کس قدر انہماک سے تھا، اور آپ کے دن رات دینیات ہی میں مشغول رہتے تھے۔ دوسرے علوم و فنون کی کوئی کتاب کبھی نہیں دیکھتے تھے، زمانہ قیام دارالعلوم سے پہلے ہی کبھی دیکھی ہوں گی۔ جہانتک اپنا علم ہے اُس کے مطابق یہ کہنے کی جرأت ہے کہ کتب منطق و فلسفہ اور اسی قسم کی دوسرے علوم کی کوئی کتاب آپ کے پاس نہیں دیکھی اور نہ کبھی مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔ طالب علمی یا اُس کے مابعد زمانہ اور قبل از قیام دارالعلوم ان علوم کو دیکھا ہوگا۔ مگر ان علوم میں بھی جس مسئلہ کو کبھی بیان فرماتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فنی مسائل کی تحقیقات میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے، اور ہر علم پر کافی دافی عبور ہے، اور محققانہ نظر ہے اور عام علوم پر پورا اقتدار اور حاکمانہ ملکہ حاصل ہے۔

کسی علم کے کسی مسئلہ پر جب بیان ہوتا تو یہ معلوم ہوتا کہ اس فن کے تمام ائمہ کے اقوال مستحضر ہیں، اور نیز تحقیقی نظر ہے اور حضرت شاہ صاحب کی رائے و تحقیق ان سب پر حاوی ہے اور بہت ہی عمیق نظر ہے۔ طالب علمی میں اسطرلاب اور ربع مجیب اور ربع مقنطر جیسے فن کے نایاب رسائل لکھے ہوئے قلمی حضرت شاہ صاحب نے احقر کو دیئے تھے جو میرے پاس موجود ہیں۔ علم ریاضی و علم نجوم میں پوری دسترس تھی حتیٰ کہ رمل و جفر کے قواعد کے ماہر تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ پنجاب کے ایک صاحب جو پیری مریدی بھی کرتے تھے، علم جفر کی بعض چیزیں دریافت کرنے کی غرض سے ہی پنجاب سے تشریف لائے اور دو تین روز قیام کرنے کے بعد اپنا مقصد حاصل کر کے واپس تشریف لے گئے۔ علم طب بھی شاہ صاحب نے بعد علوم دینیہ دہلی میں حکیم واصل خاں کے زمانہ میں پڑھا تھا اگرچہ مطب نہیں کیا مگر کتابوں پر پورا عبور تھا نفیسی شرح اسباب خارج اوقات میں دیوبند کے زمانہ قیام میں پڑھائی ہیں ایک مرتبہ دیوبند میں حکیم رضی الدین دہلوی جن کو شفاء الملک خطاب ملا تھا، تشریف لائے، حضرت شاہ صاحب نے ایک گھنٹہ سے زیادہ برجستہ تقریر فرمائی جس میں فن طب کے اصول بیان کئے، سننے والے حیرت میں تھے، عربی زبان پر تقریر اور تحریر دونوں طریقوں پر ملکۂ اقتدار تھا، فصاحت و بلاغت کے ماہر تھے۔

حفظ و ذکاء: حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حفظ و ذکاء حق تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص موہبت تھی۔ صدیوں ہی میں کوئی ہستی ایسی پیدا ہوتی ہے۔ ہزاروں صفحات کی کتاب ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد (جہاں تک آپ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے) پھر ہاتھ میں نہیں اٹھاتے تھے۔ سالہا سال کے بعد جب بھی اس کتاب میں کسی مسئلہ کا حوالہ فرماتے تو چند منٹ میں اس مسئلہ پر انگلی رکھ کر فرما دیتے کہ یہ ہے۔ نہ اس کی کوئی یادداشت

کہیں لکھی ہوتی اور نہ ہی کہیں نوٹ ہوتا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی کچھ مدت پہلے یہ کتاب نظر سے گذری ہے۔ اور مستحضر ہے۔ اور کتاب کے دائیں بائیں صفحات خیالِ مُبارک میں موجود ہیں۔ مناظرہ ومباحثہ کی کسی مہم میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت ایک ضخیم کتب خانہ کی معیت کا کام کرتی تھی۔ کسی بھی مسئلہ کی ضرورت پیش آتی آپ سے دریافت کرلیا جاتا اس میں کسی فن کی خصوصیت نہیں جس فن وعلم کا بھی ہو ہر فن کے مسئلہ میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشآء۔ ہر فن میں جامعیت اور پورا اقتدار شاہ صاحبؒ کو حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور حفظ وذکار کا معتدبہ حصّہ عطا کیا تھا۔

جس زمانہ میں آپ دیوبند تعلیم کی غرض سے تشریف لائے تو مولوی امین الدین صاحب مرحوم (جن کے نامِ نامی سے مدرسہ امینیہ جو پہلے سُنہری مسجد میں تھا اور اب کشمیری گیٹ دہلی میں ہے) اُسی زمانہ میں دیوبند تعلیم پاتے تھے، اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیشتر استفادہ فرماتے اور خدمت کیا کرتے اور ایک خاص اُنس حضرت شاہ صاحبؒ سے رکھتے تھے۔ اور بعض خارجی کتابیں پڑھتے تھے۔ اِسی طرح مولٰنا مشیّت اللہ صاحب بجنوری جن کی وفات اسی سال ہوئی (حق تعالےٰ مغفرت فرمائیں) ان کا تعلق بھی اسی زمانہ تعلیم میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہوگیا تھا، مولوی مشیّت اللہ زمانہ تعلیم میں اکثر شاہ صاحب کو بجنور لیجایا کرتے اور بعد فراغت مستقل قیام کی غرض سے بجنور لے گئے۔

اِدھر مولٰنا امین الدین صاحب مرحوم نے بعد فراغت تحصیلِ علم سُنہری مسجد دہلی میں مدرسہ عربیہ کے قیام کا اِرادہ کیا تو درس کے لئے نظرِ انتخاب حضرت شاہ صاحب کی طرف ہوئی اور دہلی سے بجنور پہنچے اور حضرت شاہ صاحب سے اپنے ارادۂ قیام مدرسہ کا تذکرہ کیا اور فرمایا، کہ آپ دہلی تشریف لے چلئے میں آپ ہی کے لئے بجنور آیا ہوں، شاہ صاحب نے

فرمایا، چوں کہ مولوی امین الدین صاحب نے زمانہ قیام دارالعلوم میں میری بہت خدمت کی تھی اور مجھ سے مانوس تھے یہ خیال کر کے کہ مدرسہ چلے نہ چلے مگر مولوی صاحب کی دلشکنی نہ ہو دہلی کے لئے بجنور سے مولوی صاحب کے ساتھ ہو گئے۔ یہ تو معلوم تھا ہی کہ مولوی صاحب کے پاس کوئی سرمایہ نہیں دہلی پہنچکر ۱۶ یا ۱۷ روپے اپنے پاس تھے مولوی صاحب کے حوالہ کر دیئے اور کہا مولوی صاحب ان کو خرچ کیجئے، مولوی صاحب نے اُن میں سے کچھ کھانے میں خرچ کئے اور کچھ کے کاغذ لاکر باقاعدہ رجسٹر بنوائے جس میں طلبہ کا داخلہ وغیرہ اور حساب وغیرہ لکھنا شروع کر دیا طلبہ بھی اچھی تعداد میں جمع ہو گئے چندہ بھی آنے لگا اور مدرسہ امینیہ کی بنیاد مستحکم ہونے لگی۔ اسی زمانہ کا ایک واقعہ خود حضرت شاہ صاحب نے بیان فرمایا کہ میرٹھ میں ایک مولوی صاحب غیر مقلد تھے غالباً اُن کا نام مولوی احمد اللہ فرمایا تھا یہ مولوی صاحب غیر مقلد بشیر حنفیوں کے ساتھ اُلجھتے اور دعوتِ مناظرہ دیتے رہتے تھے۔ میرٹھ میں حضرت شاہ صاحب کے نام کی شہرت ایک مناظرہ کی وجہ سے ہو چکی تھی جو تھوڑے ہی زمانہ پہلے مقام گلاؤٹھی میں ہو چکا تھا اور غیر مقلدوں کو سخت ہزیمت ہوئی تھی اور ایک ہی نشست کے بعد چپکے سے بھاگ نکلے تھے اس مناظرہ گلاؤٹھی میں دیوبند کے علماء میں سے بڑے بڑے علماء جمع ہوئے تھے اور حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خاص توجہ اس مناظرہ کی طرف تھی۔ مولانا گنگوہی نے دیوبند سے بحیثیت سرپرست دارالعلوم ہونے کے سب ہی کو گلاؤٹھی پہنچنے کا امر فرمایا تھا اس کے بعد بھی مولوی احمد اللہ غیر مقلد کا حنفیوں کو دعوتِ مناظرہ دینا باعث تعجب تھا۔ میرٹھ کے دو صاحب مولوی احمد اللہ صاحب سے دعوتِ مناظرہ کا کاغذ لے کر حضرت شاہ صاحب کے پاس دہلی سنہری مسجد میں قبل از عشاء پہونچے۔ اور شاہ صاحبؒ کو کاغذ دعوتِ مناظرہ دکھلایا۔ شاہ صاحب اسی شب میں دہلی سے میرٹھ کے لئے روانہ ہو گئے اور آخیر شب میں

میرٹھ پہونچکر مولوی احمد اللہ غیر مقلد کے محلہ کی مسجد میں قیام فرمایا۔ اور صبح قریب ہونے کو تھی لیٹ گئے۔ جو دو صاحب میرٹھ کے ساتھ تھے اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا، کہ شاہ صاحب کے ساتھ کوئی کتاب تو ہے نہیں، دوسرے نے جواب دیا کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ جب صبح ہوگئی تو نماز صبح اُسی مسجد میں پڑھی، مولوی احمد اللہ بھی نماز میں موجود تھے بعد اختتام نماز مولوی احمد اللہ سے مُلاقات کی، اور فرمایا کہ یہ تحریر آپ کی ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہاں میری ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا، بسم اللہ میں موجود ہوں بیٹھ جائیے اور مسئلہ معیّن فرمالیجئے اور جونسا بھی مسئلہ آپ چاہیں اختیار کرلیں۔ اور شروع کردیں۔ مولوی احمد اللہ نے کہا، آپ ہی شروع فرمائیے۔ شاہ صاحب نے فرمایا، فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ آپ کے خیال میں زیادہ زوردار ہے اُس کو شروع کروں یا کوئی اور مسئلہ جو آپ کہیں؟ جواب دیا کہ اسی مسئلہ کے متعلق فرمائیے۔ جو لوگ نماز میں موجود تھے بیٹھ گئے اور کچھ لوگ جن کو اطلاع ہوئی وہ بھی آگئے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا، کہ میں شروع کرتا ہوں، میری طرف سے صرف ایک شرط ہے کہ جب تک میں ختم نہ کرلوں آپ درمیان میں نہ بولیں جو کچھ اعتراض وسوال ہو بعد میں کہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے متواتر دو گھنٹے فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ پر پوری بسط و تفصیل کے ساتھ تقریر فرمائی اور کوئی حدیث موافق و مخالف ضعیف و قوی معہ حوالہ کتب نقل کئے بغیر نہ چھوڑی۔ تقریر ختم کرنے کے بعد فرمایا کہ اب آپ کو جو کچھ کہنا ہو فرمائیے۔ (کاتب الحروف نے یہ سُنکر عرض کیا کہ اسکو کیا یاد رہا ہوگا فرمایا یوں ہی ہوا) جواب میں کہنے لگا کہ مجھے تو کچھ یاد نہیں رہا۔ شاہ صاحب نے فرمایا، اسی پر حدیث دانی کا دعویٰ کرتے ہو، کہنے لگا، میں نے تو دعویٰ نہیں کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ لکھ دیجئے مجھے حدیث دانی کا دعویٰ نہیں۔ غرض لکھ کر دیدیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بیشک جو ائمہ کی توقیر نہیں کرتا حق تعالےٰ اُس کے حفظ کو سلب کرلیتے ہیں۔ یہ دن جمعہ کا

دن تھا آپ نے جمعہ میرٹھ میں ادا کیا، تمام شہر میں رفتہ رفتہ اس مناظرہ کا چرچا ہو گیا، لوگوں نے جمعہ کے بعد جامع مسجد میں شاہ صاحبؒ کو گھیر لیا اور کہنے لگے کہ باقاعدہ مناظرہ ہو کر اس سے تحریر لیجائے۔ لوگوں کا مجمع کثیر شاہ صاحب کو لے کر مولوی احمد اللہ کے محلہ کی مسجد میں جا پہونچا مولوی احمد اللہ نے لیت و لعل کر کے پولیس بلوا لی اور فتنہ کے خوف سے پولیس انسپکٹر نے مجمع کو منتشر کر دیا۔ یہ واقعہ خود شاہ صاحب کی زبانی سُنا ہوا نقل ہے جس سے آپ کی یادداشت و حفظ اور احادیث پر کس قدر وسیع نظری کا پتہ چلتا ہے۔

دوسرا واقعہ جس سے آپ کے حفظ و ذکاء کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

حضرت مولٰنا شبیر احمدؒ جس زمانہ میں قرآنِ پاک کے فوائد تحریر فرما رہے تھے یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دارالعلوم دیوبند کو چھوڑ کر مقام ڈابھیل ضلع سورت میں حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولٰنا شبیر احمد صاحبؒ وغیرہ تشریف لے گئے تھے اور اسی مقام ڈابھیل میں فوائد قرآنِ پاک کی تکمیل ہوئی۔

حضرت مولٰنا شبیر احمد صاحبؒ کی عادت تھی کبھی کبھی فوائد کے متعلق مزید تسکین خاطر و توثیق کے پیش نظر فوائد کے متعلق لکھا ہوا حضرت شاہ صاحبؒ کو سُنا دیا کرتے تھے اور اگر کوئی اشکال ہوتا تو دریافت بھی فرما لیا کرتے تھے۔

جس دن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا تار ڈابھیل پہنچا تو حضرت مولٰنا شبیر احمد صاحبؒ پر بے صبری اور غم کے آثار زیادہ نمایاں تھے، بیساختہ چیخیں اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے آہ! ہمارے لئے موجب تسکین و طمانیت کون ہے، کس کے پاس جا کر اب تسکینِ خاطر کریں گے، کس سے اپنے علمی اشکالات حل کرائیں گے۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو غم و رنج کا پہاڑ مولٰنا شبیر احمد صاحبؒ پر گرا ہے وہ غم و رنج کسی دوسرے کو نہیں۔

بعد وفات ہی یہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب میں فوائد لکھتے لکھتے اِن آیات پر پہونچا جو حضرت داؤد علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصّہ میں ہیں :۔

وَھَلْ اَتَاکَ نَبَؤُا الْخَصْمِ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰی دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْھُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ خَصْمٰنِ بَغٰی بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ فَاحْکُمْ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاھْدِنَا اِلٰی سَوَآءِ الصِّرَاطِ۔ اِنَّ ھٰذَا اَخِیْ لَہٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَۃً وَّلِیَ نَعْجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ فَقَالَ اَکْفِلْنِیْھَا وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَکَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِکَ اِلٰی نِعَاجِہٖ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰہُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّہٗ وَخَرَّ رَاکِعًا وَّاَنَابَ ۔" حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے اوقات کی تقسیم یوں کر رکھی تھی۔ ایک دن لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا۔ ایک دن اپنے اہل وعیال کے لئے، ایک دن اللہ کی عبادت کرنا۔ جس دن اللہ کی عبادت کرتے مکان بند کر دیا جاتا دربان پہرہ دیتے۔ تاکہ عبادتِ الٰہی میں کسی قسم کی کھنڈت نہو۔ عبادت کے دن ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ جب ان انتظامات کے ساتھ عبادت میں مشغول تھے کہ ناگاہ کئی شخص دیوار پھاند کر اُن کے پاس آکھڑے ہوئے داؤد علیہ السلام باوجود اپنی قوت وشوکت کے یہ ماجرا دیکھ کر گھبرا اُٹھے کہ یہ آدمی ہیں یا اور کوئی مخلوق، آدمی ہیں تو ناوقت آنے کی ان حالات میں جُرأت کیسے ہوئی دربانوں نے کیوں نہیں روکا، اگر دروازے سے نہیں آئے تو اتنی اُونچی دیوار پھاند کر آنے کی کیا سبیل کی ہوگی۔ خدا جانے ایسے غیر معمولی طور پر کس نیت اور کس غرض سے آئے ہیں۔ غرض اچانک یہ عجیب وہیبت واقعہ دیکھکر خیال دوسری طرف ہٹ گیا اور عبادت میں جیسی یکسوئی کے ساتھ مشغول تھے قائم نہ رہ سکی۔ ان آیات کی تفسیر میں عام مفسرین متاخرین نے اسرائیلیات سے کچھ ایسے واقعات لکھے ہیں جو ایک نبی کی شایانِ شان نہیں بلکہ ایک اچھے آدمی کے متعلق بھی مناسب نہیں خیال کئے جاتے چہ جائیکہ

داؤد علیہ السلام جیسے نبی کے متعلق ان باتوں کا تصور کیا جاسکے مفسرین متاخرین یہ لکھتے ہیں کہ داؤد ع
علیہ السلام کی ننانوے بیبیاں تھیں اس کے باوجود داؤد علیہ السلام نے ایک پڑوسی کی بیوی کو اپنے نکاح
میں لیا، اِس پر متنبہ کرنا مقصود ہے اور اس کے حاصل کرنے کے جو طریقے وواقعات لکھے ہیں، وہ ایک
صحیح طریق پر چلنے والے انسان کے لئے نامناسب اور صحیح سمجھ والے کے لئے ناقابل تسلیم۔ ان آیات
میں داؤد علیہ السلام کو اُن کے اِس فعل پر متنبہ کرنا ہے متقدمین مفسرین اور ائمہ حدیث ان متاخرین
کے درج ذیل آیات واقعات کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ یہ اسرائیلیات میں بیان کردہ ہیں جن کی
کوئی سند نہیں اور نہ ہی یہ قصے تسلیم کے قابل ہیں۔ اور کوئی بات متقدمین کے یہاں ایسی نہیں ملتی
جس سے یہ اشکال حل ہوسکے کہ آخر ان انتظامات کے باوجود کہ دربان مقرر ہیں مکان بند ہے کوئی
راہ اندر آنے کی نہیں ہے، اچانک دیوار پھاند کر چند آدمی کیوں آئے اور اس قصہ میں غرض کیا ہے
مولٰنا شبیر احمد صاحب رح نے فرمایا کہ میں ۱۵ دن ان آیات کے متعلق تفتیش و تحقیق میں سرگرداں اور
پریشان رہا۔ جہانتک امکان میں تھا، قدیم و جدید تفسیریں اور شروحِ حدیث کو چھان مارا اور کوئی بات
ایسی قابلِ تسکین نہ ملی جس سے یہ خلش دُور ہوتی کہ بالآخر یہ ایسا کیوں ہوا کہ جس سے داؤد علیہ السلام
کی عبادت میں رخنہ اندازی ہوئی اور یکسوئی عبادت میں نہ رہ سکی۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
اُس وقت بیمار تھے بیماری کا خیال کر کے حضرت شاہ صاحب کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا،
جب دیکھا کہ کوئی صورت تسلی و اطمینان کی نہیں اور ان آیات کے تحت لکھوں تو کیا لکھوں۔
کام اٹکا ہوا ہے، ناچار حضرت شاہ صاحب رح سے عرض کیا کہ مجھے ۱۵ دن تفسیروں کے اوراق گرداتے
ہوئے ہوگئے مگر ان آیات کا کوئی حل نہیں ملتا۔ شاہ صاحب رح نے فرمایا، بیشک ان آیات میں
اشکال ہے البتہ میری نظر سے ایک حدیث گذری ہے جو مستدرک حاکم میں ہے ضعف ہی
کی حالت میں مستدرک اٹھائی اور دو چار ہی منٹ میں کچھ ورق اُلٹ پلٹ کر انگلی رکھ کر ایک باب

حدیث بتلادی اور فرمایا کہ اس حدیث میں اُن آیات کے متعلق حل نکلتا ہے۔ میں نے حدیث پڑھی، پیچھے سے کچھ ورق دیکھے کہ دیکھوں داؤد علیہ السلام کے متعلق کوئی باب ہو کچھ نہ ملا، اور نہ حدیث کو دیکھ کر کوئی بات سمجھ میں آئی۔ حضرت شاہ صاحب رح تو صرف اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئے کہ یہ حدیث ہے اور اس میں اُن آیات کے متعلق جو اشکال ہے اُس کا حل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کتاب کو لیجاؤں فرمایا، لے جائیے اور دیکھ لیجئے۔ میں کتاب لے کر اپنی جگہ آیا، اور غور کیا تو مطلب کو پالیا۔ حدیث کا مضمون یہ ہے، جس کو مولانا شبیر احمد صاحب رح نے فوائد میں نقل کیا ہے:۔

"ہمارے نزدیک اس قصہ میں اصل بات وہ ہے جو حضرت ابن عباس رض سے منقول ہے یعنی داؤد علیہ السلام کو یہ ابتلاء ایک طرح کے اعجاب کی بناء پر پیش آیا، صورت یہ ہوئی کہ داؤد علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ "اے پروردگار! رات دن میں کوئی ساعت ایسی نہیں جس میں داؤد کے گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد تیری عبادت (یعنی نماز یا تسبیح و تکبیر) میں مشغول نہ رہتا ہو" یہ اس لئے کہا کہ اُنہوں نے روز و شب کے چوبیس گھنٹے اپنے گھر والوں پر نوبت بہ نوبت تقسیم کر رکھے تھے، تاکہ اُن کا عبادت خانہ کسی وقت عبادت سے خالی نہ رہنے پائے) اور بھی کچھ اسی قسم کی چیزیں عرض کیں (شاید اپنے حُسنِ انتظام

وغیرہ کے متعلق ہوں گی) اللہ تعالےٰ کو یہ بات ناپسند
ہوئی، ارشاد ہوا کہ "داؤد یہ سب کچھ ہماری توفیق سے
ہے، اگر میری مدد نہ ہو تو تو اس چیز پر قدرت نہیں پا سکتا،
(ہزار کوشش کرے نہیں نبھا سکتا) قسم ہے اپنے جلال
کی میں تجھکو ایک روز تیرے نفس کے سپرد کردوں گا!
(یعنی اپنی مدد ہٹالوں گا، دیکھیں اُس وقت تو کہاں تک
اپنی عبادت میں مشغول رہ سکتا اور اپنا انتظام قائم رکھ
سکتا ہے)"۔ داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے پروردگار
مجھے اُس دن کی خبر کردیجئے۔ پس اُسی دن فتنہ میں مبتلا
ہوگئے۔ (اخرج هذا الاثر الحاكم في المستدرك
وقال صحيح الاسناد واقره الذهبي في التلخيص)
یہ روایت بتلاتی ہے کہ فتنہ کی نوعیت صرف اِسی قدر
ہونی چاہیئے کہ جس وقت داؤد علیہ السلام عبادت میں ہوں
باوجود پوری کوشش کے مشتغل نہ رہ سکیں اور اپنا،
انتظام قائم نہ رکھ سکیں، چنانچہ آپ پڑھ چکے کہ کس
بے قاعدہ اور غیر معمولی طریقے سے چند اشخاص اچانک
عبادت خانہ میں داخل ہو کر حضرت داؤد علیہ السلام کو
گھبرا دیا، اور ان کے شغلِ خاص سے ہٹا کر اپنے جھگڑے
کی طرف متوجہ کرلیا بڑے بڑے پہرے اور انتظامات اُن کو

داؤد علیہ السلام کے پاس پہنچنے سے نہ روک سکے۔ تب
داؤد علیہ السلام کو خیال ہوا کہ اللہ نے میرے اِس دعوے کی
وجہ سے اس فتنہ میں مبتلا کیا۔"

اس سے آگے مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے لفظ فتنہ کی تفسیر میں مزید کچھ لکھا ہے جو ان آیات کے فوائد دیکھنے سے متعلق ہے۔ مولانا موصوف نے جب حضرت شاہ صاحبؒ کی بتلائی ہوئی حدیث سے یہ فوائد لکھے تو حضرت شاہ صاحبؒ کو سنائے، جس پر شاہ صاحب نے تصویب کی اور فرمایا، حدیث کا یہ ہی مضمون ہے اور ان آیات کے درج ذیل یہ ہی مناسب ہے

مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے حفظ و ذکاء دو چیزوں کی داد دی اور فرمایا کہ اس حفظ کا کیا ٹھکانا کہ اتنی بڑی ضخیم کتاب سے ایک دو منٹ میں چند ورق اِدھر اُدھر کر کے حدیث پر انگلی رکھ کر بتلادی، گویا ابھی حال میں ہی دیکھی ہے، خدا ہی جانتا ہے کب دیکھی ہوگی، حضرت شاہ صاحبؒ کی عادت تھی (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا) کتاب ہاتھ میں اٹھائی اوّل سے آخر تک دیکھتے رہے جب تک ختم نہ کر لیتے چھوڑتے نہیں تھے مستدرک غالباً تین چار سال پہلے زمانہ قیام دار العلوم میں دیکھی تھی۔ اور فرمایا کہ ذکاوت اور سرعتِ انتقال ذہنی پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کتاب دیکھتے دیکھتے جب حدیث سامنے آتی ہے تو فکر کس سرعت سے اُس طرف منتقل ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق آیات میں مُفید مطلب ہوگی (جن کی تفسیر میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ جیسے عالم کو پندرہ (۱۵) دن سرگرداں و پریشان رہنا پڑا) + ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

تمت بالخیر